باب ۷

شریعت

اللہ کے دین میں قوانین (شریعت) کی ضرورت کیوں ہے؟

اخلاقی قدروں کی نگہبانی، اور انسانوں کے درمیان باہمی فرق واختلاف سے اوپر اٹھنے اور حرام وحلال کی انتہاؤں سے بچنے کے لئے

وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝

اور اللہ تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے اور جو لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے رستے سے بھٹک کر دُور جا پڑو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے۔ (۴:۲۷ تا ۲۸)

انسان کے رویہ اور سلوک کو معیاری بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور قوانین حقیقت پسندانہ ہیں۔ اللہ کا دین حقیقت پسندانہ معیار مطلوب اور معیاری حقیقت پسندی کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ایک طرف انسان کو، اللہ کے غفور ورحیم ہونے کے بھروسے، حرص و ہوس اور آرزوؤں وامنگوں کی ایک انتہا پر پہنچنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف اللہ کے حاضر وناظر ہونے کے احساس اور اس کی پکڑ کے ڈر سے تمام فطری داعیات اور جبلتوں کو کچلنے کی دوسری انتہا سے بچاتا ہے۔ اللہ کی تعلیمات اور قوانین انسان کو میانہ روی اور معتدل راستے پر رکھتے ہیں جس سے انسان حیوانی اور ملکوتی دونوں قسم کی انتہاؤں سے بچا رہتا ہے کیوں کہ انسان نہ تو حیوان ہے اور نہ فرشتہ۔ اللہ کے دین میں اللہ کے قوانین فطرت کے قوانین سے ہم آہنگ ہیں اور یہ قوانین انسانی نفس کی تکمیل کرتے ہیں اور حتی الامکان اس کی صلاحیتوں کے حقیقی ارتقاء کو یقینی بناتے ہیں تاکہ زندگی کی راہ میں انسان کی جسمانی، عقلی یا روحانی ونفسیاتی اور اخلاقی قوتوں میں سے کوئی بھی قوت ضائع نہ ہو کیوں کہ ان قوتوں کا ضائع ہونا خود انسانی فطرت کے ہی خلاف ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ۝۶۲ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝۶۳ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۶۴ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو (کتاب) تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں اُن سب پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لیے جا کر فیصلہ کرائیں حالانکہ اُن کو حکم دیا گیا تھا کہ اُس (طاغوت) کا انکار کریں اور شیطان (تو یہ) چاہتا ہے کہ اُن کو بہکا کر رستے سے دُور ڈال دے۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اُس کی طرف (رجوع کرو) اور پیغمبر کی طرف آؤ تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے اعراض کرتے اور رُکے جاتے ہیں۔ تو کیسی (ندامت کی) بات ہے کہ جب اُن کے اعمال (کی شامت) سے اُن پر کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو تمہارے پاس بھاگے آتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں کہ واللہ ہمارا مقصود تو بھلائی اور موافقت تھا۔ ان لوگوں کے دلوں میں جو جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اُس کو خوب جانتا ہے تم ان (کی باتوں) کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرتے رہو اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں۔ اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ اور یہ لوگ جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھے تھے، اگر تمہارے پاس آتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول (اللہ ﷺ) بھی ان کے لئے بخشش طلب کرتے تو اللہ کو معاف کرنے والا (اور) مہربان پاتے۔ تمہارے رب کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اُس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اُس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

(۴:۶۰ تا ۶۵)

اللہ پر ایمان رکھنے والا انسان جو کہ اللہ کے علیم و حکیم ہونے، نگہبان و مہربان ہونے اور بصیر ہونے جیسی تمام صفات سے باخبر ہوتا ہے، اس کے دین اور تعلیم کو سمجھتا ہے، اسے ہمیشہ اللہ کے قوانین پر عمل کرنا چاہئے اور اس کے انصاف پر پورا بھروسہ رکھنا چاہئے کیوں کہ اللہ پر سچے ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو کچھ اللہ اور اس کے پیغمبر کا حکم ہوا سے پورا کیا جائے اور جس سے منع کیا گیا ہو اس سے باز رہا جائے۔ انسان کا اپنے نفس کی برائیوں یا سماج کی برائیوں کے آگے جھک جانا ایمان کے خلاف ہے اور یہ اللہ کے ساتھ تعلق اور اللہ پر ایمان اور اس

کی ہدایت کو اپنانے کے معاملہ میں منافقت ہے۔ایسے بے ایمان اور دھوکے باز موقع پرست ہر زمانے میں اور ہر جگہ ہوتے ہیں، اور ایسے لوگ اپنے ذاتی مفاد حاصل کرنے میں ہی لگے رہتے ہیں اور اپنے سوا کسی کے لئے مخلص نہیں ہوتے۔لیکن پھر بھی وہ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ سماج میں خیر سگالی قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور اچھے تعلقات استوار رکھنے کے حق میں ہیں۔ان کی خود پسندی اور نفس پرستی کی حقیقت کھل ہی جاتی ہے کیوں کہ وہ خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں اور حقیقت خود ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور ان کے دھوکے و فریب کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی تبھی تک بے خبر رہتے ہیں جب تک حقیقت کھل نہیں جاتی۔حالانکہ ایسے لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ وہ اللہ کو اور مومنوں کو فریب دے رہے ہیں انہیں ہمیشہ اس بات کا موقع ملا ہوا ہے کہ اپنے رویہ کو بدل لیں، اور اگر وہ اللہ سے معافی مانگیں اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرنے کا اقرار کریں تو وہ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ انتہائی رحیم و کریم اور معاف کرنے والا پائیں گے۔

ایمان وعقیدہ ایک، شریعتیں اور عبادت کے طریقے الگ الگ

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾

اور (اے پیغمبرؐ!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر مشتمل ہے۔تو جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق کو چھوڑ کر، جو کہ تمہارے پاس آچکا ہے اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا ہم نے تم میں سے ہر ایک (گروہ) کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تمہیں دیئے ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے، سو نیک کاموں میں جلدی کرو۔تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر جن باتوں میں تمہیں اختلاف تھا وہ تمہیں بتا دے گا۔

(۵:۴۸)

اس آیت میں پچھلی آسمانی کتابوں کے سلسلہ میں، جو کہ قرآن کے نزول کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، قرآن کے موقف کو واضح طور سے بتایا گیا ہے۔مسلمانوں کا اگرچہ یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اور انسانوں کے لئے اللہ کا آخری صحیفہ ہے جس میں پچھلی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے اور اب ہر زمانہ اور مقام کے لئے کتاب ہدایت صرف یہی ہے، تاہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے [۲:۲۵۶]، اور یہ کہ اللہ نے انسانوں میں تنوع اور اختلاف رکھا ہے۔چنانچہ رنگا رنگی اور تنوع فطرت کا بنیادی قانون ہے اور اللہ کا دین اور اس کے قوانین فطرت کے اس بنیادی قانون سے مطابقت رکھتے ہیں: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تمہیں دیئے ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے''۔پچھلے انبیا کی تعلیمات پر چلنے والے تمام لوگ جو پورے خلوص کے ساتھ ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت میں اللہ کے سامنے انسان کی جواب دہی پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اللہ کی اخلاقی ہدایات کے مطابق گزارتے ہیں ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ

کرے گا اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ انصاف کا معاملہ کرے گا۔ اس لئے ان کے لئے مستقبل کا کوئی خوف ہے نہ حال کا کوئی غم [۲:۶۲؛ ۳:۱۱۳ تا ۱۱۵؛ ۵:۶۹]۔ مختلف انبیاء اور مختلف طریقہ ہائے زندگی کے پیروکاروں کو چاہئے کہ ''اچھے (تقویٰ کے) کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کریں'' اور اس طرح لوگوں اور مذاہب کا تنوع تعمیری کاموں میں مسابقت اور لازمی تعاون باہمی کو فروغ دینے کا ذریعہ بنے [۲:۱۷۷؛ ۵:۲؛ ۴۹:۱۳]۔ قرآن میں اللہ کے بیان کردہ ضابطے رنگارنگی (تکثیریت) کو یقینی بناتے ہیں جو انسانی تنوع سے مطابقت رکھتی ہے، اور اگرچہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وحی الٰہی جس کی وہ اتباع کرتے ہیں اللہ کی آخری کتاب ہی ہے، اور یہ بات اس وحی کے نزول کے وقت سے ہی چلی آرہی ہے لیکن قرآن کوئی ایک نظام یا عقائد کا ایک ہی بیان سب پر نہیں تھوپتا، نہ وہ صالحیت اور دنیا و آخرت میں اللہ کے فضل پر کسی کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتا ہے۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝۴۹ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۵۰

اور (ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ) جو (حکم) اللہ نے نازل فرمایا ہے اُسی کے مطابق ان میں فیصلہ کرنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں تمہیں بہکا نہ دیں۔ اگر یہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کے سبب ان پر مصیبت نازل کرے اور اکثر لوگ تو نافرمان ہیں۔ کیا یہ زمانۂ جاہلیت کے حکم کے خواہشمند ہیں؟ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے اللہ سے اچھا حکم کس کا ہے؟
(۵:۴۹ تا ۵۰)

اللہ کے قوانین اوپر سے آتے ہیں اور انسانی ضروریات کا احاطہ کرتے ہیں اور تمام انفرادی اور سماجی اختلافات سے ماوراء ہیں، جب کہ انسانی قوانین صرف غالب گروہوں کے مفادات اور نظریات کی عکاسی کرتے ہیں، جن کے پاس طاقت ہوتی ہے اور اکثریت میں ہوتے ہیں۔ الٰہی قوانین تمام نسلی گروہوں اور سماجی و اقتصادی اور سیاسی طبقوں، جنسوں، ہر عمر کے لوگوں اور ہر عقیدے کے ماننے والوں کا لحاظ کرتے ہیں۔ انصاف کے ان اصولوں کو اپنانے سے انفرادی و اجتماعی حدود، تعصّبات اور مفاد پرستیوں سے سماج کی حفاظت ہوتی ہے جبکہ انصاف کے ان الٰہی اصولوں کو نظر انداز کرنے یا ان سے انحراف کرنے کی وجہ سے خودغرضی، لالچ، ناعاقبت اندیشی اور موقع پرستی کے دروازے کھلتے ہیں۔ اخلاقی اور سماجی تقاضوں کے تئیں مستعدی نہ ہونے کی وجہ سے سماج میں بتدریج انحطاط آتا ہے اور الٰہی انصاف کو نظر انداز کر کے انسانی انانیت کی تسکین کرنا سماج کے لئے ہلاکت کا باعث بنتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر قانون یا نظام انصاف کوئی بھی نہیں بنا سکتا کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے تعصّبات اور مجبوریوں سے بالاتر ہے۔

حاکمیت اور نظم عامہ

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۴۶ وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷ وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۴۸ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝۴۹ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۵۰ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵۱ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۵۲

ہم ہی نے روشن آیتیں نازل کی ہیں اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے اور (ان کا) حکم مان لیا پھر اُس کے بعد اُن میں سے ایک فریق پھر جاتا ہے اور یہ لوگ صاحبِ ایمان ہی نہیں ہیں۔ اور جب اُن کو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ (رسول اللہ) ان کا قضیہ چکا دیں تو اُن میں سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے۔ اور اگر معاملہ ان کے حق میں ہو تو اس (فیصلہ) کی طرف فرماں بردار بن کر چلے آتے ہیں۔ کیا اُن کے دلوں میں بیماری ہے یا (یہ) شک میں ہیں یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے حق میں ظلم کریں گے؟ (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں۔ مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان میں فیصلہ کر دیں تو کہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا تو ایسے ہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ (۲۴:۴۶ تا ۵۲)

جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر اسی تعلیم کے مطابق ایمان رکھتا ہے جو پیغمبر کے ذریعے سے بھیجی گئی ہے، اسے اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنا چاہئے اور ایمان کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں اور کسی بھی متنازعہ معاملہ کا تصفیہ اللہ کے قوانین اور انصاف کے اصولوں کے مطابق کرنے کے پیغمبر کے اختیار کو تسلیم کر کے اپنے ایمان کو ثابت کرنا چاہئے، خواہ ان کا فیصلہ اس کے حق میں ہو یا اس کے خلاف۔ اللہ کے قوانین اور پیغمبر کے اختیار کو تسلیم کرنے میں کوئی بھی ہچکچاہٹ اللہ کی سچی بندگی کے برعکس ہے اور اس کی وجہ سے آدمی کا ایمان معطل ہو جاتا ہے اور زندگی کے حقائق سے الگ تھلگ پڑ جاتا ہے۔ حقیقی ایمان ایک متحد اور منظم سماج کی شکل میں ظاہر ہونا چاہئے جہاں جائز اختیارات کا نظم ہو جو انسانی حقوق اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کرنے والا ہو؛ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اہل ایمان کا معاشرہ خود غرضی، ناعاقبت اندیشی اور اخلاقی و سماجی برائیوں کی وجہ سے بکھر جائے گا۔ قانون اور نظم و ضبط کو ایمان اور اخلاق سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک ہم آہنگ سماج تبھی بنتا ہے جب تمام عناصر ایک دوسرے سے تعامل کریں اور دنیا میں قوت و استحکام نیز پھلنے پھولنے کے لئے اور آخرت میں دائمی مسرتیں حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں کہ ایسے ہی لوگ فوز و فلاح سے ہم کنار ہوں گے۔

❀ ❀ ❀

عام اصول

کچھ محدود اور مخصوص پابندیوں کے ساتھ سب کچھ جائز

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، تمہارے لئے پیدا کیں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ (۲:۲۹)

اگرچہ اوپر کی آیت پوری کائنات اور متعدد فلکی نظاموں کی تخلیق کے بارے میں ہے، جنہیں ''سماوات'' کہا گیا ہے خواہ وہ انسان کو نظر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں۔ لیکن اس میں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ ''زمین پر جو کچھ ہے اسے تمھارے لئے پیدا کیا گیا ہے'' [نیز دیکھیں ۴۵:۳]۔ چنانچہ قرن اول سے ہی فقہاء کرام نے بجا طور پر یہ سمجھا ہے کہ زمین پر جو کچھ بھی ہے وہ انسان کے استعمال کے لئے ہے، الا یہ کہ کسی چیز کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی واضح ممانعت ہو۔

لہٰذا، ہر چیز کو جائز مانا گیا ہے جب تک کہ کسی خاص چیز کے بارے میں اس کے برخلاف بات ثابت نہ ہو، اور ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے جو اس کے ممنوع ہونے کا دعویٰ کرے، جب کہ جائز ماننا ایک عام اصول کی پیروی ہے اور اس کے لئے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ کسی چیز کے جواز کے لئے سنت سے ثبوت مانگنا یا قرن اول سے نظیر مانگنا اس قرآنی اصول اور فقہی منطق کے خلاف ہے۔

یہی اصول، جسے قرآن میں بار بار دوہرایا گیا ہے، پچھلی آسمانی تعلیمات میں بھی بالعموم اپنایا گیا تھا [۳:۹۳]۔ یہ جامع اور بنیادی ضابطہ اسلامی قوانین (قوانین شریعت) کے تسلسل اور ان کی حرکت پزیری کو بنائے ہوئے ہے، کہ اس کی رو سے زمان و مکاں کے فرق کے حساب سے اس میں تبدیلی آتے رہنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ کسی خاص زمانہ اور مقام پر جو چیز جائز یا ممنوع ہو اس میں عام رہنمائی یہ ہے کہ اس معاملہ یا شے کی فطری خصوصیات کیا ہیں اور انسانی قوتوں نیز ان کے ارتقاء پر اس کے اثرات کیا ہیں۔ یہ اثرات چاہے طبعی یا طبیعاتی لحاظ سے ہوں یا اخلاقی ہوں اور ان کی نوعیت انفرادی ہو یا سماجی؛ ''پاک چیزوں کو اُن کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر

حرام ٹھہراتے ہیں اور اُن پر سے بوجھ اور طوق جو اُن (کے سر) پر (اور گلے میں) تھے اتارتے ہیں'' [۷:۱۵۷]۔

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۳

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام میں لگا دیا جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے اس میں (قدرتِ الٰہی کی) نشانیاں ہیں۔ (۴۵:۱۳)

یہ ایک اور تاکید ہے اس بات کی کہ جو کچھ بھی اللہ نے انسان کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے اس پر تصرف کرنے کی عام اجازت ہے، جب تک کہ کسی چیز کا مخصوص طور پر واضح اور مستند شواہد کی بنیاد پر ممنوع ہونا ثابت نہ ہو۔ اس سے پہلے ذکر کردہ آیات (۲:۲۹) اور اس کی تفسیر ملاحظہ کریں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۶۹

لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بُرائی اور بے حیائی ہی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں (کچھ بھی) علم نہیں۔ (۲:۱۶۸ تا ۱۶۹)

اس آیت میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو پچھلی آیت میں کہی گئی تھی: زمین پر جو کچھ بھی لائق استعمال اور اچھی چیزیں ہیں وہ ایک عام اصول کے مطابق جائز ہیں، اور اگر کوئی چیز بری ہے اور نقصان دہ ہے تو اللہ نے اسے صاف طور سے ممنوع کر دیا ہے۔ کسی چیز کے نقصان دہ ہونے کا مطلب اصل میں اس چیز کا اپنے آپ میں نقصان دہ ہونا نہیں ہوتا بلکہ انسان کا استعمال کرنا اسے مفید یا نقصان دہ بناتا ہے۔ اسی طرح انسان کا عمل خواہ وہ اپنے لئے ہو یا دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہو وہ مفید بھی ہوسکتا ہے اور نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔ کسی کا استحصال یا کسی کے ساتھ دھوکہ و فریب کسی جائز چیز کو ممنوعہ طریقے سے اور غلط نیت سے استعمال کرنے سے بھی ممکن ہے۔ یا ایسی عادتیں جو انسان کی اپنی ذات کو نقصان پہنچائیں یا دوسروں کو نقصان پہنچائیں، اور اسی طرح شیطان کے اکساؤں پر چلنا اور اللہ کی ہدایت کو جو کہ انسان کی صلاحیت و استعداد کی حفاظت اور انہیں ترقی دینے کا موجب ہے، نظر انداز کرنا انسان کی اپنی ہی بدعملی ہے۔ انسان کو برائی پر آمادہ کرنے کے لئے شیطان کی اکساہٹیں انسان کی اپنی خودغرضی، لالچ، کم نظری اور دوسری منفی باتوں سے، اور انسان کے اندر جو مثبت صلاحتیں ہیں انہیں عارضی یا مستقل طور سے معطل اور بے اثر رکھنے سے ہی انسان کے اندر راہ پاتی ہیں [۷:۱۷۹؛ ۲۵:۴۴؛ ۲۸:۵۰]۔ اللہ کے قوانین اور ممانعت کو صرف ظاہری چیزوں تک محدود کر دینے کے اکساوے میں آدمی کو نہیں آنا چاہئے [نیز دیکھیں ۵:۹۳؛ ۲۲:۳۷]؛ یہ صرف انسان کا عمل ہے جو فی الواقع افراد اور سماج کو نقصان پہنچاتا ہے؛ لہٰذا انسان کو اس بات سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے

اور اپنی خواہش نفس نیز دوسروں کے کہنے میں شیطان کے نقش قدم پر چل پڑنے سے محتاط رہنا چاہئے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۷۳

اُس نے تم پر مرا ہوا جانور اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے۔ ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اُس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔ (۲:۱۷۳)

جو چیزیں کھانے پینے کے لئے ممنوع قرار دی گئی ہیں یا جو اعمال ممنوع ہیں وہ محدود ہیں اور ان کی نشان دہی کر دی گئی ہے [۵:۳، ۹۰ تا ۹۱]، جب کہ باقی دوسری ساری چیزیں جو قرآن یا سنت میں ممنوع نہیں کی گئی ہیں جائز اور مباح ہیں۔ جو چیز ممنوع ہے وہ بالعموم انسانی صحت کے لئے غیر موزوں اور نقصان دہ ہے۔ ایک اللہ کے بجائے کسی اور کی عبادت میں شرکت، یا کسی ایسی چیز کا کھانا جس پر اللہ کے بجائے کسی اور کا نام لیا گیا ہو، ایمان کے خلاف ہے۔ حالانکہ ایک لازمی قانونی اصول اس سلسلے میں دیا گیا ہے اور دوسری بہت سی آیتوں میں متعدد بار اس پر زور دیا گیا ہے [دیکھیں ۲:۱۷۳، ۲۸۶؛ ۵:۳؛ ۶:۱۱۹، ۱۴۵، ۱۵۲؛ ۷:۴۲؛ ۱۶:۱۱۵؛ ۲۳:۶۲]، کہ اگر کوئی انسان کوئی ممنوع چیز اضطراری ضرورت سے بقدر ضرورت استعمال کرے تو اس کی اجازت ہوگی (جیسے یہاں بھوک یا پیاس کی وجہ سے ہلاک ہو جانے سے بچنے کے معاملہ میں یہ اجازت دی گئی ہے) بشرط یہ کہ ''اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے''۔ ضرورت یا عوامی ضروریات کے دباؤ (''عموم البلوہ'') کو فقہا نے کسی ممنوع چیز کی فرد یا سماج کے لئے عارضی طور پر اجازت دینے کا ایک جائز سبب سمجھا ہے اس شرط کے ساتھ کہ ممانعت کا عام اصول انفرادی یا سماجی ضرورت کی عارضی صورت حال گزر جانے کے بعد فوراً ہی نافذ العمل ہوگا۔ یہ ایک اور جامع اور بنیادی اصول ہے جس سے انصاف قائم رہتا ہے، لوگوں کو مشکلات سے نجات ملتی ہے، اور اسلامی قانون کو مختلف زمانوں اور مقامات پر بدلتی ہوئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے لچک ملتی ہے۔

کوئی جبر نہیں: استعداد کے مطابق ہی جواب دہی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

مومنو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اُن کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور جو حلال طیب روزی اللہ نے تمہیں دی ہے اُسے کھاؤ اور اللہ سے جس پر ایمان رکھتے ہو، ڈرتے رہو۔ (۵:۸۷ تا ۸۸)

یہ آیت اس عام اصول کو بیان کرتی ہے کہ جو چیز بھی پیدا کی گئی ہے وہ انسان کے لئے طیب یعنی اچھی ہے اور جائز ہے الّا یہ کہ کسی چیز کے حرام ہونے کے بارے میں صراحت سے کوئی فیصلہ کن ثبوت موجود ہو [دیکھیں پہلے ذکر کردہ آیات ۲:۲۹ اور ۴۵:۱۳ نیز ان کی تشریح]۔ کوئی انسان اگر اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیتا ہے یا خود کو یا دوسروں کو اس سے محروم کرتا ہے تو یہ بات اتنی ہی سنگین اور اخلاقی، تصوراتی و سماجی لحاظ سے اتنی ہی تباہ کن ہے جتنی اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو اپنے یا دوسرے کے لئے حلال کر لینے والی بات [۱۰:۵۹؛۱۶:۱۱۶]۔ دونوں ہی طرح کی باتیں اللہ کی حدود کو پھلانگنے اور صحیح کو غلط کرنے کی جسارت ہیں۔ ضبط نفس (خود پر قابو رکھنا) اور تحمل اچھی باتیں ہیں اور ان باتوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے لیکن اسے تمام لوگوں کے لئے ممانعت کا ایک عام اصول نہیں بنانا چاہئے، اور کسی ایسے معاملہ میں کبھی کسی کنفیوژن میں نہیں رہنا چاہئے۔ مسلمان جسم و روح کے درمیان کشمکش اور تضاد و ٹکراؤ کے نظریہ کو نہیں مانتے، اس کے بجائے وہ یہ مانتے ہیں کہ جسم و روح دونوں اللہ کی نعمتیں ہیں، اور دونوں کو متوازن طریقے سے اور ہم آہنگی کے ساتھ برابر سے تقویت دیتے رہنا چاہئے جس سے انسانی لیاقتوں کے مابین ایک صحت مند اور مفید تعامل جاری رہے۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور کیا سبب ہے کہ جس چیز پر اللہ کا نام لیا جائے تم اُسے نہ کھاؤ حالانکہ جو چیزیں اُس نے تمہارے لئے حرام ٹھہرا دی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں (بے شک اُن کو نہیں کھانا چاہئے) مگر اس صورت میں کہ اُن کے (کھانے کے) لئے مجبور ہو جاؤ، اور بہت سے لوگ بغیر سمجھے بوجھے اپنے نفس کی خواہشوں سے لوگوں کو بہکا رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگوں کو جو (اللہ کی مقرر کی ہوئی) حد سے باہر نکل جاتے ہیں تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ اور ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کر دو جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ عنقریب اپنے کئے کی سزا پائیں گے۔ (۶:۱۱۹ تا ۱۲۰)

ان میں سے پہلی آیت خوراک کے ضابطوں سے متعلق ہے، خاص طور سے یہ بتانے کے لئے کہ کسی جانور کو جائز طریقے سے ذبح کرنے کے لئے کیا ضروری ہے، لیکن یہ آیت ایک اہم قانونی اصول پر زور دیتی ہے کہ اسلام میں جو کچھ حرام ہے وہ واللہ نے واضح طور سے بتا دیا ہے، اور ان حرام کردہ چیزوں کے علاوہ سب کچھ اصولی طور پر حلال ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ان کو نام بہ نام گنایا جائے جیسا کہ ممانعت کی چیزوں کو نام لے کر بتا دیا ہے [دیکھیں پہلے ذکر کردہ آیات ۲:۲۹؛ ۴۵:۱۳؛ ۵:۷ اور ان پر لکھے تشریحی نوٹ، نیز آیت ۷:۳۲ اور ۱۶:۱۱۶]۔ اس کے علاوہ کسی ممنوع چیز کا ضرورت کے تحت عارضی طور پر مباح ہونے کا اصول بھی ہے۔ [۲:۱۷۳؛ ۶:۱۴۵؛ ۱۶:۱۱۵]۔ یہ لازمی اصول اسلام کے نظام انصاف میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر شریعت کو صحیح طریقے سے سمجھنا اور پیش کرنا ہے اور آج کا کوئی مسلم معاشرہ اگر اسے نافذ کرنے اور اجتہاد کے عمل کو زندہ کرنے میں سنجیدہ ہے تو ان اصولوں کی اہمیت اور اولیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ ؕ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

پس اللہ نے جو تم کو حلال طیب رزق دیا ہے اُسے کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر کرو اگر اُسی کی عبادت کرتے ہو۔ اُس نے تم پر مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حرام کر دیا اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے (اُس کو بھی)، ہاں اگر کوئی مجبور ہو جائے تو بشرطیکہ گناہ کرنے والا نہ ہو اور نہ حد سے نکلنے والا تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور یونہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آ جائے مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہیں ہوگا۔ (جھوٹ کا) فائدہ تو تھوڑا سا ہے مگر (اس کے بدلے) ان کو دردناک عذاب (بہت) ہو گا۔ (۱۶: ۱۱۴ تا ۱۱۷)

ان آیات میں نہ صرف کھانے پینے کے کچھ متعین ضابطے دئے گئے ہیں بلکہ ضرورت کے وقت ذمہ داری ساقط ہو جانے کے اصول پر بھی زور دیا گیا ہے [دیکھیں پہلے ذکر کردہ آیت ۲: ۱۷۳ اور اس کی تشریح]، اور یہ اصول کہ ہر چیز حلال ہے جب تک اس کا یقینی طور سے ممنوع ہونا ثابت نہ ہو [دیکھیں پہلے ذکر کردہ آیت ۵: ۸۷ اور اس کی وضاحت]۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۟ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (سب کچھ) سنتا اور جانتا ہے۔ (۲: ۲۵۶)

انسان کی مجبوری کو ایک ٹھوس ضرورت کی طرح دیکھا جا سکتا ہے کیوں کہ دونوں ہی صورتوں میں انسان اپنے افعال میں خود مختار نہیں رہ جاتا۔ ایسا آدمی جو کسی قسم کی مجبوری کے دباؤ میں ہو تو دباؤ کے تحت کئے جانے والے کسی کام کے لئے اسے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چنانچہ ایسے معاملوں میں آدمی کے لئے نہ تو انعام ہے اور نہ سزا۔ اگر قرآن ایمان کے معاملہ میں مجبور کئے جانے سے منع کرتا ہے [۱۰: ۹۹؛ ۱۱: ۲۸؛ ۱۶: ۱۰۶] تو وہ اس اصول کو انتہائی اہم معاملہ میں پیش کرتا ہے تا کہ اسے جبر و اکراہ کے تمام معاملوں پر منطبق کیا جا سکے، ان معاملوں میں بھی جن کے نتائج زیادہ سنگین نہ ہوں۔ ایمان کے معاملے میں جبر بالکل بے معنیٰ بات ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے معاملات کا فیصلہ ان کی نیت اور آزاد مرضی کے مطابق کرے گا، اور وہ حقیقی احساسات و افکار کو جانتا ہے۔ انسانی ذہن صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اور اللہ کا دین اس انسانی ذہن کو اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے کافی و شافی ثبوت پیش کرتا ہے۔

قرآن کے مطابق انسانی ذہن ایمان وعقیدے سمیت تمام معاملات کو سمجھنے وجانچنے کی اہلیت رکھتا ہے، اور ذہن جس چیز کو قبول نہ کرے اس کے لئے کوئی جبر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ انسان کو خود ہی اپنا دل ودماغ کسی بھی قسم کے دباؤ اور بہلاوے سے آزاد رکھنا ہے جو اسے خود اپنا فیصلہ لینے اور اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے باز رکھنے کا موجب ہو۔ جب کوئی انسان خود اپنی آزادی اور وقار کو محفوظ رکھتا ہے تو وہ انسانی قوت وتوانائی کے ذرائع پر اپنا مکمل اختیار رکھتا ہے چاہے یہ جسمانی قوت وتوانائی ہو یا عقلی، یا روحانی، نفسیاتی اور اخلاقی، اور اس طرح انسان زندگی کے حالات میں آنے والی مختلف تبدیلیوں کا سامنا توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ کرتا ہے، اور یہ انسان کے لئے ''ایسا مضبوط سہارا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں''۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ۟ وَ اغْفِرْ لَنَا ۟ وَ ارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۧ

اللہ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اچھے کام کرے گا تو اُس کو اُن کا فائدہ ملے گا اور بُرے کرے گا تو اُسے اُن کا نقصان پہنچے گا۔ اے رب اگر ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔ اے اللہ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے اللہ جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا بوجھ ہمارے اوپر نہ رکھنا اور (اے اللہ) ہمارے گناہوں سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہمیں کافروں پر غالب فرما۔ (۲۸۶:۲)

اس بات کو بیان کرنے کے بعد کہ انسان اور اس کی آزاد مرضی پر پر کسی بھی طرح کے دباؤ سے اس انسان کی قانونی ذمہ داری کم یا ختم ہوجاتی ہے اور ان دباؤوں کے نتائج بے کار ہوجاتے ہیں، قرآن آگے ایک اور عام اصول پیش کرتا ہے کہ انفرادی ذمہ داری انسان کی اپنی اہلیتوں کے دائرے میں ہی ہے، چاہے یہ جسمانی اہلیت ہو یا اخلاقی، انفرادی ہو یا سماجی۔ اسی طرح، چوں کہ کوئی شخص دباؤ میں جو کچھ کرتا ہے تو اس سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا، لہٰذا کسی سے کوئی بھول چوک ہوجائے اور غیر ارادتاً کوئی خطا ہوجائے تو اس کی جواب دہی بھی اس پر نہیں ہوگی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک حدیث میں مرضی وارادے کی آزادی کو متاثر کرنے والے ان تین عناصر کا ذکر ان عوامل کے بطور کیا گیا ہے جو فرد کی ذمہ داری کو ساقط کردیتے ہیں: دباؤ، بھول چوک اور غیر ارادی خطا [بہ روایت طبرانی (الکبیر، ابن حنبل اور ابن ماجہ]۔ ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ کسی فرد کے اعمال کا فیصلہ اس کے ارادے اور نیت کے مطابق ہوگا [بخاری ومسلم]۔ اس طرح ہر آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے کمایا۔ کوئی فرد کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا [۶:۱۶۴؛ ۱۷:۱۵؛ ۳۵:۱۸؛ ۳۹:۷؛ ۵۳:۳۸]۔

اللہ کا انصاف بنیادی طور سے انسانی فطرت اور انفرادی لیاقت کے مطابق ہے، اور انصاف کا اولین ہدف محض سزا دینا نہیں ہے۔ پچھلے زمانوں میں اللہ نے کچھ نافرمان لوگوں کو ان کے اوپر مزید کچھ ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال کر سزا دی تھی [۴:۱۶۰ تا ۱۶۱]؛ ۶:۱۴۶؛ ۱۶:۱۱۸]، اسی لئے مومن اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جو پہلے لوگوں پر ڈالے گئے تھے۔ محمد ﷺ کی شریعت میں جو کچھ جائز ہے وہ اپنے آپ میں طیب (اچھی) ہے اور جو کچھ ممنوع ہے وہ اپنے آپ میں ایک بری چیز یا برا عمل ہے، اور اس لئے یہ شریعت لوگوں

پر سے وہ بوجھ اتارتی ہے جوان پر لدے ہوئے تھے[۷:۱۵۷]۔اس طرح اللہ تعالیٰ مومنوں کی اس دعا کا جواب دیتا ہے کہ'' اے اللہ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا''[۲:۲۸۶]۔یہ اسلامی قانون میں ایک بنیادی بات ہے کہ انسانوں پر وہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا جنہیں اٹھانے کی ان کے اندر سکت نہیں، کیوں کہ ''للہ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا'' اور ''للہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تا کہ تم شکر کرو''[۵:٦]

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۶

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا۔ (۱۶:۱۰٦)

ایسے کسی عمل کے لئے جس پر کسی فرد کو مجبور کیا گیا ہو اس فرد کو ذمہ داری سے بری کرنے کا ذکر پہلے مذکور آیتوں ۲:۲۵٦،۲۸٦اور ان کی تشریح میں ہو چکا ہے۔اوپر کی آیت میں ایسے فرد کی مذمت کی گئی ہے جو جان بوجھ کر اپنے ارادے سے اپنا یا دوسروں کا دل حق کو جاننے کے بعد اس کے انکار کے لئے کھولتا ہے۔جو لوگ کسی گناہ کے لئے مجبور کئے جائیں اور جبر کی مزاحمت نہ کر سکیں انہیں ان کے حالات کے مطابق پوری طرح یا جزوی طور سے معذور سمجھا جائے گا،لیکن اس کے لئے اصل گناہ گار وہ لوگ ہوں گے جو دوسروں کو حق سے پھر جانے کے لئے مجبور کریں یا اکسائیں،حالانکہ وہ اور ان کے داؤں میں آنے والے لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ ہی صحیح راستہ ہے اور سمجھدار لوگوں کو اسی پر چلنا چاہئے۔

عوامی بیداری لازمی ہے

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۱۱۵

اور جو شخص سیدھا رستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اُسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔ (۴:۱۱۵)

یہ آیت انصاف کے ایک اہم اصول کو اجاگر کرتی ہے: آدمی کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری تب شروع ہوتی ہے جب اس کے سامنے ہدایت کھل کر آجائے۔کسی پر اللہ کی ہدایت اور قانون کے خلاف ورزی کی ذمہ داری عائد کرنے سے پہلے اللہ کی ہدایت اور قوانین کو عوام کے سامنے واضح طور سے لایا جائے۔قانونی عمل پر عوامی معلومات اور تعلیم کو ترجیح دی جانی چاہئے،اگرچہ یہ قانونی عمل بھی لازمی ہے تا کہ عوام کے علم میں آنے والی کسی بات کے خلاف ورزی کے ارتکاب کو روکا جاسکے۔اس طرح اللہ کے رسول کے ذریعہ آنے والے اللہ کے

پیغام سے انحراف لوگوں کے ایسے اعمال اور رویوں سے صاف ظاہر ہوگا جو کہ مومنوں کے عمل اور رویہ سے مختلف یا اس کے برعکس ہوں۔ اللہ کی ہدایت جو بغیر کسی ابہام کے کھل کر سامنے آجائے اور پھر لوگوں کی بڑی تعداد اس کی پیروی کرے اس سے کسی کا اعراض کرنا ایک متضاد رویہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح جو کوئی بھی اللہ کی ہدایت اور سماجی نظام سے ایسا کھلا انحراف کرے وہ اپنے عمل کے لئے اخلاقی اور قانونی طور پر ذمہ دار قرار دئے جانے کا مستحق ہے۔ اس طرح کی بنیادی شرطیں مختلف سطحوں اور کیفیتوں میں جرم کی سنگینی اور نوعیت کے فرق کے لحاظ سے عائد ہوتی ہیں۔ کچھ انحرافات ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے تفصیل سے اور بار بار عوام کے علم میں لایا جانا ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اتنے سنگین نہیں ہوتے اور ہلکی پھلکی سزا کے ہی لائق ہوتے ہیں، جیسے گلیوں اور راستوں کو گندہ نہ کرنا۔ تاہم عوام کو جرائم اور ان کی سزاؤں کے بارے میں بنیادی معلومات اور تعلیم فراہم کرنی ہی چاہئے۔ جب کوئی نیا قانون بنے تو اس کے نفاذ سے پہلے اس کی معلومات عام کرنا ضروری ہے۔

تعصب اور طرف داری سے بالاتر ہونا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۳۵

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو، خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم خواہشِ نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا اگر تم مبہم بات کہو گے یا (شہادت سے) بچنا چاہو گے تو (جان رکھو کہ) اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (۴:۱۳۵)

انصاف اور انصاف پسندی کو ایک سماجی اخلاقی قدر بنایا جانا ضروری ہے۔ اسے صرف قوانین اور انہیں نافذ کرنے والے حکام کی بدولت ہی قائم نہیں کیا جاسکتا۔ انصاف کا جذبہ خاندانوں، اسکولوں، آس پڑوس، قوموں اور فرقوں اور ذرائع ابلاغ وغیرہ کے ذریعہ پیدا کیا جانا چاہئے تاکہ ہر ایک فرد انصاف کے قیام اور ناانصافی کی مخالفت ومزاحمت کے لئے ایک فعال کارکن بن جائے۔ مثال کے طور پر کوئی فرد اگر اپنے (یا اپنی) شریک حیات کے ساتھ، بچے کے ساتھ، طالب علم کے ساتھ، شریک کار (پارٹنر) کے ساتھ یا پڑوسی کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے، تو اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ملک میں ایک شہری یا کسی سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے انصاف کی حمایت وتائید کرے گا؟ انصاف اور حق پرستی افراد کا ذاتی جذبہ بننا چاہئے تبھی یہ سماج میں قائم ہونے میں مددگار ہوگا۔ مومن جو اپنے عمل وسلوک میں انصاف کا رویہ اختیا کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کے اندر اللہ کا تقویٰ ہے، اور اللہ کی خاطر وہ حق کی گواہی کے لئے کھڑا ہوتا ہے، کیوں کہ مومن کا یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے سامنے تمام انسانوں کو اپنی جواب دہی کرنی ہے۔ کسی دولت مند آدمی سے اس کی دولت واختیار کی وجہ سے کوئی بغض نہیں رکھنا چاہئے نہ کسی غریب آدمی کے تئیں یا اس کے خلاف اس کی غریبی اور کمزوری کی وجہ سے کوئی متعصّبانہ جذبہ رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی اخلاقی اور قانونی ہدایت میں اللہ کے انصاف کی جو بات کہی گئی ہے وہ تمام لوگوں کے لئے ہے اور ان کی ہر حالت کے لئے ہے۔ جب افراد کی تعلیم وتربیت اس انداز سے کی جائے گی تو پورا سماج اور اس کے

حکام وعہدیدار، پولس افسران، وکلاء اور جج وغیرہ سب اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں انصاف کو اہمیت دیں گے اور انہیں ایسا کرنا آسان محسوس ہوگا کیوں کہ انصاف اور حق پرستی پورے سماج پر غالب ہوگی، اور جن لوگوں کو انصاف اور قانون کے نفاذ کی ذمہ داری دی گئی ہوگی وہ اگر انصاف سے ہٹیں گے تو ان کا یہ انحراف صاف طور سے الگ ہی نظر آئے گا جس کی وجہ سے ان کی وقعت اور بھروسہ یقینی طور سے کم ہوجائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

مومنو! اللہ کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ ادب کے مہینے کی اور نہ قربانی کے جانوروں کی اور نہ اُن جانوروں کی (جو اللہ کی نذر کر دیئے گئے ہوں اور) جن کے گلوں میں پٹے بندھے ہوں اور نہ اُن لوگوں کی جو عزت کے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں (اور) اپنے رب کے فضل اور اُس کی خوشنودی کے طلبگار ہوں۔ اور جب تم احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو اور لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تمہیں عزت والی مسجد سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اُن پر زیادتی کرنے لگو اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (۲:۵)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مکہ میں اللہ تعالیٰ کا جو مقدس گھر خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا اس کا حج مومنوں کے لئے ایک خاص وقت میں کچھ مخصوص عبادات کے ذریعہ امن وسکون اور ضبط نفس کی تربیت کا ایک عمل ہے: ''جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرلے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی بُرا کام کرے نہ کسی سے جھگڑے اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہوجائے گا۔ اور زادِراہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زادِراہ (کا) پرہیزگاری ہے اور اے اہل عقل مجھ سے ڈرتے رہو'' [۲:۱۹۷]۔ حتی کے حج کے دوران خوراک کے لئے شکار کرنا بھی منع ہے کیوں کہ اس دوران حج کرنے والے انسان سے تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں پرسکون رہے، دوسروں کے ساتھ پرامن رہے اور تمام ذی حیات مخلوق کے ساتھ امن کا معاملہ کرے۔ امن کی اس تربیت کی تمام مشقوں (حج کے مناسک) کا لحاظ ہر حاجی کو کرنا ہوتا ہے اور اس دوران کوئی کسی سے جھگڑا اور تکرار نہیں کرسکتا۔

لیکن، امن کے اس ماحول کے خلاف ورزی کو کبھی بھی کسی جارحیت یا مستقل دشمنی کے لئے جواز نہیں بنانا چاہئے کیوں کہ دو غلطیاں مل کر ٹھیک نہیں ہوجاتیں، اس طرح کا کوئی بھی خلاف ورزی عمل جب رک جائے تو انسانی تعلقات کو بحال ہوجانا چاہئے اور عالم گیر اسلامی اخوت کا رشتہ برقرار رہنا چاہئے۔ انصاف تب تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک انسان کو خود پر قابو رکھنے کی تربیت نہیں دی جائے

گی، اور عاضی صورت حال اور وقتی غیض وغضب کو مستقل کیفیت میں بدلنے سے روکا نہ جائے گا۔ مسلمانوں کو ہر حالت میں اور تمام لوگوں کے ساتھ سختی کے ساتھ انصاف پر قائم رہنے کی جو تعلیم دی گئی ہے، ان لوگوں کے ساتھ بھی انصاف کی تعلیم جو انہیں اللہ کے گھر کی زیارت اور وہاں جا کر عبادت کرنے سے روکتے ہیں اور ایک بنیادی فرض ادا کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں، انہیں ساری زندگی اپنے تمام تعلقات میں اس تعلیم کو برتنا چاہئے اور ہمیشہ امن وانصاف کی حفاظت کے لئے انہیں کھڑے ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کی خیر سگالی اور اتحاد کو مزید دشمنی اور جنگ وفساد کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ اس کے بجائے مسلمانوں کی اس امن پسندی اور خیر سگالی سے باہمی تعاون کو فروغ ملنا چاہئے تا کہ اللہ کے تقویٰ سے جو صالحیت اور راست روی پیدا ہوتی اور قائم رہتی ہے اس میں اور اضافہ ہو اور اس کی برکت سب کو حاصل ہو۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، امن اور انصاف افراد کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہونا چاہئے، تا کہ وہ ان کے عمل وسلوک میں ظاہر ہو اور جن لوگوں کو ملک کے اندر نیز عالمی تعلقات میں انصاف کو نافذ کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے ان کے رویے میں یہ انصاف رچا بسا ہو۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ
بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَّ
ٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا
تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا
يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ
ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ
يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا
يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ
فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ
ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَن يَعْمَلْ
سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ
غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُۥ عَلَىٰ
نَفْسِهِۦ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١١﴾

(اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے تا کہ اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرو اور (دیکھو) دغا بازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا۔ اور اللہ سے بخشش مانگنا بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو لوگ خود اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں اُن کی طرف سے بحث نہ کرنا کیونکہ اللہ خائن اور جرائم کے مرتکب کو پسند نہیں کرتا۔ یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا تو وہ (اس وقت بھی) ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ ان کے (تمام) کاموں پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بھلا دیکھو کہ تم لوگ دنیا کی زندگی میں تو ان کی طرف سے بحث کر لیتے ہو قیامت کو ان کی طرف سے اللہ کے ساتھ کون جھگڑے گا اور کون ان کا وکیل بنے گا؟ اور جو شخص کوئی بُرا کام کر بیٹھے یا اپنے حق میں ظلم کر لے پھر اللہ سے بخشش مانگے تو اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کا وبال اُسی پر ہے اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ (۴:۱۰۵تا۱۱۱)

وَمَن يَكْسِبْ خَطِيٓـَٔةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِۦ بَرِيٓـًٔا
فَقَدِ ٱحْتَمَلَ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿١١٢﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ
ٱللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُۥ لَهَمَّت طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن

اور جو شخص کوئی قصور یا گناہ تو خود کرلے لیکن اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگائے تو اس نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ان میں سے ایک جماعت تم کو

يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِیْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

بہکانے کا قصد کر ہی چکی تھی اور یہ اپنے سوا (کسی کو) بہکا نہیں سکتے اور نہ تمہارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں؛ اور اللہ نے تم پر کتاب اور دانائی نازل فرمائی ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ ان لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، البتہ کوئی (سرگوشی میں) صدقہ یا بھلائی کی یا لوگوں میں صلح کرانی کی بات کہے (تو ٹھیک ہے) اور جو ایسے کام اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرے گا تو ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے۔
(۴:۱۱۲ تا ۱۱۴)

یہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہی گئی ایسی موثر آیات ہیں جن میں انصاف سے فیصلے کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور آپؐ کو یہ ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے دفاع میں کبھی نہ آئیں جو بے ایمان ہیں اور اپنے قصوروں کا الزام دوسرے بے قصوروں پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ ایک بشر تھے اور آپؐ سے فیصلہ کراتے ہوئے کچھ خائن لوگ اپنے جھوٹ اور فریب سے آپ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے، کیوں کہ آپ کو اپنی صواب دید سے فیصلہ کرنا ہوتا تھا اور آپؐ اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے بہت صاف طور سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور مدعیوں پر زور دیا ہے کہ اپنے مقدمے میرے سامنے پیش کرتے وقت اللہ سے ڈرا کریں اور سچی بات بتایا کریں کیوں کہ ان میں سے کچھ لوگ زیادہ لفاظ اور چرب زبان ہو سکتے ہیں اور ان کی غلط بیانی کی وجہ سے فیصلہ غلط طور پر ان کے حق میں ہو سکتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے آخرت میں اس کی سزا ملے گی، جب کہ فیصلہ کرنے والے پر کوئی الزام نہیں ہوگا اگر فیصلہ کرنے والے نے مقدمہ کو سمجھنے میں اپنی پوری کوشش کی ہوگی اور اپنی دانست میں انصاف کے ساتھ فیصلہ دیا ہوگا [بخاری، مسلم، بن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ]۔

ابن اسحاق اور ابن کثیر کے مطابق درج بالا آیات چوری کے ایک واقعہ کے بعد نازل ہوئی تھیں، جب ایک چور نے یہ سمجھ کر کہ کسی نے اس کو چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے، چرائی ہوئی ڈھال کسی دوسرے آدمی کے گھر میں پھینک دی تھی۔ پھر اس نے اپنے قبیلے کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر رسول اللہ کو جا کر یہ بتا دیا کہ اس پر چوری کا الزام غلط ہے، اس نے چوری نہیں کی ہے اور چوری کی ہوئی ڈھال ایک دوسرے آدمی کے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔ اس نے رسول اللہ سے یہ بھی درخواست کی کہ اس کے بے قصور ہونے کا اعلان فرما دیں، حالانکہ ایک گواہ نے اسے چوری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رسول کریم ﷺ نے ایسے ٹھوس شواہد کے پیش نظر جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا، اس کے بے قصور ہونے کا فرمان سنا دیا۔ اوپر کی دس آیات ریکارڈ کو درست کرنے کے لئے اور اس سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے نازل ہوئیں جو حقیقت کو چھپانے اور ایک بے قصور پر الزام تھوپنے کے لئے بنائی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں اصل قصوروار غلطی سے بری ہو گیا تھا۔ یہ بے قصور شخص کون تھا اس بارے میں مختلف روایات ہیں، ایک روایات میں اس کے یہودی ہونے کا ذکر ہے، جب کہ قصوروار اور اس کے ساتھ حق کو چھپانے کی سازش کرنے والے اس کے قبیلے کے لوگ مسلمان تھے [تفسیر ابن کثیر آیت ۴:۱۰۵ تا ۱۱۴، جلد ۱]۔

انصاف کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف ہوتا ہے چاہے فرد ہو یا قبیلہ، نسل، جنس، سماجی طبقہ یا فرقہ، چاہے محبت کرنے والا ہو یا دشمنی کرنے والا۔ ایک مشہور حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ انصاف میں طرف داری سے سماج تباہ ہوجاتا ہے، اگر فاطمہ بنت محمدؐ (رسول اللہ کی چہیتی بیٹی) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا (وہ سزا ملے گی جو قرآن میں چوری کے لئے بتائی گئی ہے) [بخاری، مسلم، بن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ]۔ منصف کا کام مقدمہ کو ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش کرنا اور حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ حق کو چھپانے اور ثبوتوں کو مٹانے کی کسی بھی سازش کا وبال منصف پر نہیں آتا ہے۔ بلکہ دھوکہ دینے والا خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس دنیا میں میں اسے اس کا نفسیاتی اور اخلاقی نقصان ہوتا ہے اور آخرت میں تو وہ پوری طرح اور ہمیشہ کے خسارے میں ہوگا'' ور جو شخص کوئی قصور یا گناہ تو خود کرے لیکن اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگائے تو اس نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا'' [۴:۱۱۲ تا ۱۱۳]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہوا کرو اور لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو (بلکہ) انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔ (۵:۸)

جیسا آیت ۴:۱۳۵ میں اس سے پہلے یہ تاکید کی جاچکی ہے، انصاف کی گواہی دینے والے کو اپنے تمام ذاتی جذبات اور خواہشوں سے بلند ہوکر حق کی گواہی دینی چاہئے۔ گزشتہ آیت میں انصاف کی خاطر اپنی نفس یا اپنے خاندان کی محبت کو بھی ترک کردینے کو کہا گیا تھا، اور اس آیت میں ایسی دشمنی کے معاملات کا حوالہ ہے جس کی وجہ سے اللہ کا تقویٰ رکھنے والے انسان کو انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے، اسے ہر حال میں اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ کی خاطر انصاف کی اور حق کی گواہی کے لئے ہر حال میں کھڑا ہونا چاہئے۔ انصاف پر قائم ہونا اور انصاف کی بات کہنا اللہ کے تقوے سے جڑی بات ہے جو کہ مومن کے ایمان کا جوہر ہے۔ اسی سورۃ کی ایک گزشتہ آیت (۵:۲) میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو دشمنی جو مومنوں کو کعبہ مقدس کی زیارت اور وہاں عبادت کرنے سے روکیں، مومنوں کو زیادتی پر نہ ابھارے۔ اگر ایسے سنگین معاملے میں بھی یہ حکم ہے تو اس سے کم اسباب کے بارے میں کیا حکم ہوگا!!! اللہ جو کہ انصاف کا حکم دیتا ہے، اس کا تقویٰ کسی بھی دوستی اور دشمنی پر غالب رہنا چاہئے، کیوں کہ ''اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔ اس طرح ایمان، اخلاق اور وفاداری ایک ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔

دقتوں اور مشکلات سے بچنا اور ان کو رفع کرنا

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ

اللہ تمہیں انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝٩٠ — سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم یاد رکھو۔ (۱۶:۹۰)

یہ ایک اور آیت ہے جس میں اسلامی شریعت کے اہداف اور اس کے بنیادی تصورات کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو ان تین تصورات میں سمجھا جا سکتا ہے: عدل کا کا قیام، احسان کا عمل اور ان قدروں کو اپنے وسیع تر خاندان میں برتنا تا کہ خاندان کو ترقی ملے اور اہل خاندان کی فلاح و بہبود ہو، اور خاندانوں کی اصلاح فلاح سے پورے معاشرے کی ترقی اور فلاح ہو۔ عدل ایک جامع عمل ہے اور یہ تعلقات کے محدود دائروں سے شروع ہوتا ہے: خاندان کے افراد کے درمیان، ساتھ میں کام کرنے والوں کے ساتھ، کاروباری شریکوں کے ساتھ، پڑوسیوں اور محلے والوں کے ساتھ؛ اس کے بعد قوموں اور حکومتوں کے درمیان اور بین الاقوامی معاملات و مسائل کے دائرے تک پہنچتا ہے۔ جو شخص اپنے اہل و عیال کے ساتھ حاکمانہ رویہ اختیار کرتا ہے وہ حکومت اور عوام کے درمیان یا مختلف ملکوں اور حکومتوں کے درمیان انصاف پر قائم نہیں رہ سکتا۔ چوں کہ خاندان سماج کی بنیادی اکائی ہے اس لئے عدل و احسان، انصاف، اور محبت و ہمدردی کا معاملہ سب سے پہلے خاندان کے افراد کے درمیان ہونا چاہئے، تا کہ خاندان اور اس کے افراد کے مابین تعلقات پورے سماج کے لئے ایک نمونہ بن سکیں [۲۵:۷۴] پھر ایک سماج سے دوسرے سماج اور سماجوں و قوموں کے مابین معاملات میں یہ نمونے سامنے ہوں۔ اس کے برعکس، جو بات اخلاق و شرافت یا معقولیت کے خلاف ہو وہ منع ہے، اور اسی طرح ایک دوسرے کے خلاف ظلم و زیادتی یا ناانصافی کرنے کی ممانعت ہے۔

اسلامی قانون (شریعت) کے یہ اہداف اور بنیادی تصورات نہ صرف قانون دانوں اور کلاء کے فائدے کے لئے لیگل ڈاکیومنٹس یا عدالتی کارگزاریوں میں بتائے جانے چاہئیں، بلکہ تمام مومنوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی تلاوت کریں، ان کا مطالعہ کریں اور اپنے عمل میں برتیں۔ اس طرح مسلم عوام یا عوام کا ایک کا بڑا طبقہ انسانی حقوق اور انصاف کے اصولوں کے بارے میں ایک قانونی نظیر پیش کرے گا جس سے ایک عوامی ثقافت فروغ پائے گی اور ایک مضبوط رائے عامہ بنے گی جو اس بات کو بالعموم جانتی اور سمجھتی ہے کہ ایک قانونی نظام بنے رہنا چاہئے۔ یہ بات بھی سامنے لائی جانی چاہئے کہ قانون اور اخلاق میں اگرچہ انصاف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے تاہم فرد کو چاہئے کہ وہ مطلقاً انصاف سے آگے بڑھ کر احسان کا رویہ اختیار کریں، دوسروں سے مہربانی و مروت سے پیش آئیں، عفو درگزر سے کام لیا کریں اور بہتر سے بہتر معیار پر رہنے کی پوری کوشش کیا کریں [۲:۱۰۹، ۱۷۸، ۱۹۵، ۲۳۷، ۳:۱۵۹؛ ۴:۸۶؛ ۵:۱۳؛ ۷:۱۹۹؛ ۱۶:۱۲۵؛ ۱۷:۲۳، ۵۳؛ ۲۳:۹۶؛ ۲۴:۲۲؛ ۲۹:۴۶؛ ۳۵:۳۲؛ ۳۹:۱۸؛ ۴۲:۴۰؛ ۴۴:۳۴؛ ۶۴:۱۴]۔ اس طرح ایمان، اخلاق اور قانون فرد اور سماج کی فلاح و بہبود میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ شریعت کے قوانین اخلاق کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن یہ صرف ان بنیادی اصولوں کو پیش کرتے ہیں جن سے سماج کی حفاظت اور مفادات کا تحفظ یقینی بنتا ہے، جب کہ انفرادی اخلاق کی کوئی حد نہیں ہے، کوئی انسان جتنا زیادہ بلند اخلاق بننا چاہے بن سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ — مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا

جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء میں سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (یعنی تیمم) کر لو۔ اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تا کہ تم شکر کرو۔ (۶:۵)

اللہ کے ضابطے چاہے وہ عبادت کے لئے ہی کیوں نہ ہوں انسان کو مشقت و مشکل میں ڈالنے کے لئے نہیں ہیں: ''اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تا کہ تم شکر کرو''۔ اسلام جسم اور روح کے درمیان تضاد اور کشمکش کا قائل نہیں ہے اور اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا ہے کہ روح کے ارتقاء کے لئے جسم کو اذیت دینا ضروری ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں طاقتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ کام پر لگایا ہے، یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے سے تعامل کرتی اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور انسانی وجود میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہتی ہیں۔ اسی طرح، اللہ کے ضابطے دقتوں کو رفع کرنے کے لئے ہیں انہیں مشکلات اور پریشانیوں میں ڈالنے کے لئے نہیں ہیں۔

جس طرح بیماری اور سفر کی دشواریوں کو نماز اور روزے کے ضابطوں میں پیش نظر رکھا گیا ہے اسی طرح افراد کے مابین معاملات کے لئے جو قوانین دئے گئے ہیں وہ بھی زندگی کو آسان بنانے کے لئے ہیں اور زندگی کی ضروریات و لوازم کو پورا کرنے کے لئے ہیں۔ جب کبھی بھی کچھ خاص حالات کی وجہ سے شریعت کے قوانین کے نفاذ سے کچھ مشکلات کھڑی ہو رہی ہوں تو اللہ کا یہ عام اصول کہ ''اللہ تمھیں تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا'' [۶:۵، نیز ۲۲:۷۸]، اور اللہ کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا'' [۲:۲۸۶، نیز ۲۳۳:۶:۱۵۲؛ ۷:۴۲؛ ۲۳:۶۲] بروئے کار آئے گا تا کہ لوگوں کی مشکل پر قابو پا جائے یا ان کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ اور ایسے کسی معاملہ میں شریعت کے عام مقاصد اور اصولوں کو بنائے رکھنے کے لئے کسی بھی قانونی تقاضے کو اس وقت تک کے لئے موخر کیا جائے گا جب تک کہ صورت حال بدل نہیں جائے اور معطل قانونی تقاضے کو آسانی کے ساتھ پورا کرنا ممکن نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ، اسلامی شریعت جسمانی اور اخلاقی تحفظ کے لئے ہے اور فرد و سماج کی بہتری کے لئے ہے، محض سزا اور جرمانہ نافذ کرنے کے لئے نہیں ہے۔ شریعت کے ضابطے تمام میدانوں میں ان اخلاقی قدروں کو تحفظ دینے کے لئے ہیں جو گھر، مسجد، اسکول اور سماج میں سکھائی جاتی ہیں: ''تمہیں پاک کرنے کے لئے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرنے کے لئے تا کہ تم شکر گزار بنو''

وَ جَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِىْ

اور اللہ (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اُس نے تمہیں برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اُسی

هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۷۸

نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے تو جہاد کرو) تا کہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلے میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ (کے دین کی رسی) کو پکڑے رہو وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔ (۲۲:۷۸)

ان آیات میں بھی اس عام قانونی اصول پر زور دیا گیا ہے کہ دین کے معاملہ میں لوگوں پر کوئی مشقت نہیں رکھی گئی ہے [دیکھیں پیچھے ذکر کی گئی آیت ۵:۶ اور اس پر کی گئی تشریح]، چنانچہ قانونی کوششوں کا مقصد ہمیشہ لوگوں کی زندگیوں سے دقتوں اور دباؤ کو رفع کرنا ہے۔ یہ آیات اس بات کو بھی اجاگر کرتی ہیں کہ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ پیش کیا گیا کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ دل وزبان سے اللہ کی بندگی کو تسلیم کرنے کی دعوت ہے جو آپؐ سے پہلے کے انبیاء کرام بھی لوگوں کو دیتے رہے ہیں جن میں حضرت ابراہیم و اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور الاسباط (اولاد یعقوب) بھی شامل ہیں [۲:۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۶؛ ۳:۵۲؛ ۵:۴۴؛ ۶:۷۱؛ ۴۰:۶۶؛ اور دیکھیں ''تمام انبیاء کا ایک ہی پیغام: اللہ کی بندگی'' (باب چہارم، عقیدہ ۳: اللہ کا دین'')۔ مسلمانوں کو اس بات کے لئے اللہ کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا دین بندوں تک پہنچانے اور تمام لوگوں کے سامنے حق کی گواہی دینے کی ذمہ داری دی ہے۔ یہ ایک ذمہ داری ہے، محض کوئی اعزاز ہی نہیں ہے جس پر فخر جتایا جائے، اور وہ تبھی مطمئن ہو سکتے ہیں جب وہ اپنی ذمہ داری پوری کریں اور اپنے اقوال وافعال سے اس کا نمونہ پیش کریں، اللہ کے دین کی برکتوں کے مظہر بنیں اور عدل واحسان نیز انسانی زندگی سے مشکلات اور دقتوں کو رفع کرنے کے لازمی اصولوں کو اپنائیں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷

جو رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کریں، جو نبی اُمی ہیں، جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو اُن کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں اور اُن پر سے بوجھ اور طوق جو اُن (کے سر) پر (اور گلے میں) تھے اتارتے ہیں؛ تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی، وہی مراد پانے والے ہیں۔ (۷:۱۵۷)

اس آیت میں سابقہ کتب آسمانی پر ایمان رکھنے والے لوگوں کو، جن کے پاس اپنی کتابوں تورات اور انجیل میں آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے حوالے موجود تھے [خاص طور سے ڈیٹرونومی ۱۸:۱۵، ۱۸؛ گوسپل آف جان ۱۴:۱۶] محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کی طرف

بلانے کے علاوہ محمد ﷺ کے پیغام کے بنیادی رول کو اجاگر کیا گیا ہے جس میں اسلامی شریعت کے مقاصد اور بنیادی تصورات بھی موجود ہیں۔ شریعت کا مقصد معروف یعنی صحیح اور اچھے کاموں کو جاری کرنا اور منکرات یعنی برے اور غلط کاموں کا سد باب کرنا ہے۔ اسلامی شریعت زندگی کے لئے اچھی چیزوں کو جائز کرتی ہے اور بری و ناپاک چیزوں کو ممنوع کرتی ہے۔ یہ انسانی ذہن اور عقل عام کو مخاطب کرتی ہے اور اس میں کوئی ابہام اور پراسراریت نہیں ہے۔ جو کچھ جائز یا ممنوع کیا گیا ہے وہ متعلقہ معاملہ کی فطرت کے عین مطابق اس کے اچھے یا برے ہونے کی بنا پر ہے، اور محض روک لگانے اور پابند کرنے کے لئے نہیں ہے [جیسا کہ پچھلی شریعتوں میں بعض معاملوں میں کیا گیا تھا، مثلاً ۴:۱۶۰؛ ۶:۶؛ ۱۴۶]۔ یہ شریعت انفرادی اور سماجی زندگی پر سے بوجھ اور طوق ہٹانے کا ذریعہ ہے [دیکھیں ماقبل مذکور آیت ۶:۵ اور اس کی تشریح؛ نیز ۲۲:۷۸]۔

شریعت کے یہ اہداف اور بنیادی تصورات ان قانونی اصولوں کو اپنانے کے لئے ایک معیار مطلوب ہیں جو انسانی دماغ نے ابھی تک وضع کئے ہیں، اور جو حال یا مستقبل میں بنائے جاسکتے ہیں۔ جو چیز بھی ان اہداف کو پورا کرتی ہے اور ان بنیادی تصورات سے مطابقت رکھتی ہے اسے شرعی قوانین کی تفصیلات میں اس وضاحت و احتیاط کے ساتھ عارضی طور پر جوڑا جاسکتا ہے کہ یہ اضافے انسانی ہیں، عارضی ہیں اور قابل تبدیل و تنسیخ ہیں۔ شریعت قانونی ضابطوں کا کوئی مہر بند مجموعہ نہیں ہے بلکہ انصاف کے کھلے اور متحرک اصول ہیں اور ایک مستقل ترقی پزیر قانونی نظام ہے۔ اپنی کشادگی، لچک، مسلسل ارتقاء پزیری، فعالیت اور انسانی تخلیقیت اور سماجی تبدیلی کے ساتھ تعامل کرنے کی بدولت اسلام مذہبی قانون میں ایک نئے اور حتمی دور کا اعلان کرتا ہے، اس طرح کہ ''لوگوں پر سے وہ بوجھ اور طوق اتارتا ہے جو پہلے سے ان پر لدے ہوئے تھے''، آسمانی ہدایت کو انسانی عقل کے ساتھ تعامل کراتا ہے اور اس طرح آسمانی اصولوں و قانونی نظام کو مستقل پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے اس وقت تک جب تک کہ دنیا میں انسانی عقل ترقی کرتی رہے گی۔

کم سے کم اور صرف ضرورت کی حد تک قوانین کا التزام

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۰۱ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝۱۰۲

مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر (اُن کی حقیقتیں) تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بُری لگیں اور اگر قرآن کے نازل ہونے کے ایام میں ایسی باتیں پوچھو گے تو تم پر ظاہر بھی کردی جائیں گی (اب تو) اللہ نے ایسی باتوں (کے پوچھنے) سے درگزر فرمایا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ اس طرح کی باتیں تم سے پہلے لوگوں نے بھی پوچھی تھیں (مگر جب بتائی گئیں تو) پھر اُن سے منکر ہو گئے۔ (۵:۱۰۱ تا ۱۰۲)

قانون کی بندشیں اسی حد تک ہونی چاہئیں جہاں تک قانونی بندشوں اور منظوریوں کے ضابطے کی ضرورت ہو کیوں کہ لوگوں کو اصولی طور پر خود اپنی اخلاقی ذمہ داریوں اور انفرادی صواب دید پر ہی چھوڑ دینا چاہئے۔ مزید یہ کہ، قرآن ایک مستقل کتاب ہدایت ہے، اور انسانی تنوع اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ہم آہنگی و مطابقت بنائے رکھنے کے لئے قانونی لچک لازمی ہے۔ سخت توضیحات اور کلیت پسندانہ

قوانین مرضی کی آزادی اور الگ الگ صواب دید کے فطری انسانی رویوں سے ٹکراتے ہیں، ایسے قوانین اور ضابطے فرد و سماج کو مفلوج کر کے رکھ دیں گے اور ان کی تخلیقی و اختراعی صلاحیتوں کو کچل دیں گے۔

چنانچہ، یہ آیت اس غلط خیال کی اصلاح کرتی ہے کہ شریعت ایک کلیت پسندانہ اور سخت حاکمانہ قانون ہے اور یہ کہ ہر انسانی خرابی کو قانون کے ذریعہ ہی سدھارا جائے گا، اور اسلام کا طریقہ اصلاح یہی ہے۔ شریعت نے جو کچھ طے کر دیا ہے اور واجب یا ممنوع کے جو احکامات جاری کئے ہیں وہ بہت محدود ہیں، جب کہ اجازت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور انسانی عقل کے لئے معاملات طے کرنے کی وسیع گنجائش رکھی گئی ہے۔ درج بالا آیت کی تفسیر میں ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ ہجری، مطابق ۱۳۷۲ عیسوی) نے رسول اللہ ﷺ کی ایک مستند حدیث صحیح نقل کی ہے کہ ''اللہ نے فرائض قرار دے دئے ہیں جنہیں نظر انداز نہ کرو اور عمل کی حدود مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو باتیں حرام کر دی ہیں ان کا ارتکاب نہ کرو، میں بعض باتوں میں خاموشی اختیار رکھتا ہوں یہ تمھارے اوپر رحمت کی وجہ سے ہے، میرے بھول جانے سے نہیں ہے، اس لئے ہرگز سوالات نہ کرو'' [بہ روایت دار قطنی]۔ دار قطنی سے ہی ابن کثیر نے ایک اور حدیث بھی نقل کی ہے: ''سب سے بڑی غلطی جو انسان کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی بات کے بارے میں سوال کرے جو حرام نہ ہو لیکن اس کے سوال کے جواب میں وہ حرام ہو گئی ہو''۔ درج بالا آیت کے ذیل میں ہی رسول اللہ ﷺ نے مومنوں کو یہ سکھایا ہے کہ جس چیز کے بارے میں کوئی حکم موجود نہ ہو اس کے بارے میں سوال نہ کیا کریں تا کہ وہ مزید کسی پابندی سے بچے رہیں، اور بتایا کہ اس طرح کے سوالات پچھلے انبیاء کی قوموں کی تباہی کی خاص وجہ بنے ہیں، [مسلم، ابن حنبل، نسائی اور ابن ماجہ]۔

یہ شریعت کا ایک انتہائی اہم اصول ہے جس پر محمد رشید رضا مصری نے قرآن کی آیت ۲:۶۷ تا ۷۱ کے ذیل میں زور دیا ہے۔ رشید رضا نے محمد عبدہٗ کی ''تفسیر المنار'' کی تلخیص لکھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ آدمی کو ایسے مفروضہ معاملات کے سلسلے میں غیر ضروری استفسار سے بچنا چاہئے جن کی وجہ سے قانون اور زیادہ پیچیدہ ہو جائے اور قانونی توضیحات کا ایک انبار لگ جائے اور پھر ان پر عمل درآمد مشکل ہو جائے۔ قرن اول کے مسلمانوں نے اسی کے مطابق عمل کیا اور انھوں نے اللہ کے راستے پر چلنے کو بہت بوجھل نہیں بنایا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی دین کو آسان اور سادہ رکھا ہے جو واضح بھی ہے اور انسانی فطرت کے لئے مناسب بھی ہے۔ اس کے برخلاف، بعد کے فقہاء نے اپنی عقل و دانش اور منطق کے مطابق اور اپنے اجتہاد سے بہت سے ضابطے اس میں جوڑ دئے، جو بعض اوقات غیر ضروری بھی تھے، اور پھر بعد کی صدیوں میں ان اضافی ضابطوں میں دوگنا، چوگنا اضافہ ہوتا رہا اور اس طرح شریعت لوگوں کے اوپر ایک بوجھ بن گئی۔ الٰہی تعلیمات اور اصول جو دائمی بھی ہیں اور پوری طرح جامع و مرکوز ہیں ان میں انسانی عقل کی قابل تبدیل اور غیر ضروری تفصیلات شامل ہو گئیں جن کی وجہ سے پڑھنے والوں کو اکثر معاملات میں ان دونوں طرح کے اصولوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ بجائے اس کے قرآن کے اس قیمتی قانونی اصول کو اپنایا جاتا جس کا اشارہ اوپر دیا گیا ہے اور قرآن و سنت سے ماخوذ قوانین پر انحصار کیا جاتا جو ہر مقام اور ہر زمانے کی انسانی ضرورتوں کی کفالت کرتے ہیں اور ان کے تاریخی پس منظر اور تعلیمی حدود کے دائرے میں اضافی تفصیلات کو سمجھا جاتا، ہم اپنے فقہی ورثے کی ضخامت سے ہی خوش ہوتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں ماضی میں جو قابل تعریف عقلی کاوشیں ہوئی تھیں وہی آج کے پوری طرح بدلے ہوئے حالات میں بھی ہمارے گوناگوں مسائل کو حل کر سکتی ہیں۔ حالانکہ اسلام کے نظام انصاف اور اس کی فطرت کو سمجھنے نیز آج کے سماجوں کی ضرورت اور مناسبت کے لحاظ سے اسے فروغ دینے کے لئے یہ ادراک کرنا ضروری ہے کہ کہ الٰہی و ابدی اور عام اصول کیا ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۹ وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۰

کہو کہ بھلا دیکھو تو اللہ نے تمہارے لئے جو رزق نازل فرمایا تو تم نے اُس میں سے (بعض کو) حرام ٹھہرایا اور (بعض کو) حلال (ان سے) پوچھو کیا اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر افتراء کرتے ہو؟ اور جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں وہ قیامت کے دن کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ بے شک اللہ لوگوں پر مہربان ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (۱۰:۵۹ تا ۶۰)

دیکھیں اس سے پہلے گزر چکی آیات ۵:۸۷ تا ۸۸) اور ان کی تشریح۔

انفرادی ذمہ داری

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہِ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی ہم ان کی اولاد کو بھی ان سے ملا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے ہر شخص اپنی کمائی کے بدلے رہن ہے۔ (۵۲:۲۱)

یہ آیت ہر انسان کی انفرادی ذمہ داری پر زور دیتی ہے [نیز دیکھیں ۴:۸۷، ۱۳۳ اور ۶:۹۴، ۱۶۴؛ ۱۹:۹۵؛ ۳۵:۱۸؛ ۳۹:۷؛ ۵۳:۳۸ تا ۴۰]۔ ماں باپ اور بچوں کا فیصلہ الگ الگ ان کی انفرادی جواب دہی کی بنیاد پر اور ان کے اعمال اور کارکردگی کے حساب سے ہوگا؛ البتہ جو بچے اللہ کا تقویٰ رکھتے ہوں گے اور اخلاق و ایمان پر کاربند ہوں گے ان کے اعمال کا صلہ ان کے والدین کو بھی ملے گا اور والدین کو ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ دئے جانے کے ساتھ ساتھ انعام کے طور پر ان کے بچوں کو بھی ان کے ساتھ رکھا جائے گا۔ تاہم صالح والدین اپنے بچوں کو ان کی اپنی ذمہ داری اور جواب دہی سے از خود نجات نہیں دلا سکیں گے۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝۳۶ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۝۳۷ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝۳۸ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹ وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝۴۰ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝۴۱

کیا جو باتیں موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں ان کی اس کو خبر نہیں پہنچی؟ اور ابراہیم کی جنہوں نے (حق طاعت و رسالت) پورا کیا۔ یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (۵۳:۳۶ تا ۴۱)

یہاں بھی انفرادی ذمہ داری کا ہی ذکر ہے جو آخرت میں اللہ کے فیصلے کی بنیاد ہوگی اور جس کے لئے کوئی سودے بازی کام نہ آئے گی اور قبول نہ کی جائے گی [دیکھیں پہلے مذکور آیت ۲:۲۸۶ اور اس کی تشریح]

ریاست کا اختیار و تحکم اور طاقت کا استعمال

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کریں اور ترازو (یعنی قواعدِ عدل) تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کر لے، بے شک اللہ قوی (اور) غالب ہے۔ (۲۵:۵۷)

اللہ تعالیٰ کی ہدایت جو کہ اس کی طرف سے نازل کردہ کتابوں میں دی گئی ہے، صحیح اور غلط کو جانچنے کا معیار فراہم کرتی ہے۔ اس ہدایت کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے سے آدمی کے اندر قوت فیصلہ پیدا ہوتی ہے اور اللہ کے رسول کی سنت اس میں رہنمائی کرتی اور انسان اپنی عقل کو اس کے لئے استعمال کرتا ہے۔ انصاف کے قیام کے لئے انسان کو اپنی عقل و حکمت کا استعمال اللہ تعالیٰ کی وحی کی رہنمائی میں کرنا چاہئے [۲:۱۲۹، ۱۵۱، ۲۳۱؛ ۳:۴۸، ۸۱، ۱۶۴؛ ۴:۵۴، ۱۱۳؛ ۵:۱۱۰]، کیوں کہ صرف عقل پر انحصار کرنے سے یا وحی کے الفاظ کو انسان کی سماجی اور عقلی کیفیت سے الگ تھلگ کر کے خلا میں منطبق کرنے سے انصاف کبھی قائم نہیں ہوسکتا۔ حکام اور عوام میں سے جو لوگ قانون کو سمجھتے اور نافذ کرتے ہیں وہ انسانی عنصر کی نمائندگی کرتے ہیں، انہیں انصاف کو سمجھنے اور انصاف کے مطابق عمل کرنے کی تعلیم و تربیت دی جانی چاہئے۔ علاوہ ازیں، سیاسی اختیار جسے عوامی نظام کو منضبط کرنے کے لئے مادی طاقت حاصل ہوتی ہے قانون پر عمل درآمد کرانے کے لئے لازمی ہے جو سماجی اور عقلی کوششوں سے وضع ہوتا ہے، اور لوہا اس لازمی انتظامی و مادی طاقت کی علامت ہے۔ لوہا جنگ کے علاوہ بھی عام زندگی میں زبردست فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، جیسے کہ صنعتی ترقی سے ثابت ہے کہ انسان نے لوہا دریافت کیا اور انسانی زندگی کے متعدد و مختلف پہلوؤں کے لئے اس کا استعمال کرنا سیکھا۔ حالانکہ اس تکنیکی ترقی میں انسان اور مشین کے درمیان توازن کو برقرار نہیں رکھا گیا جس کی وجہ سے لوہے، صنعت اور تکنیک کے فوائد زحمتوں اور اذیتوں [مثلاً جسمانی اور سماجی بیماریوں اور ماحول و قدرتی وسائل کی تباہی وغیرہ] کے ساتھ گڈمڈ ہو گئے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت انسان کو اس لائق بناتی ہے کہ وہ انسانی اور مادی ترقی کے درمیان توازن برقرار رکھ سکے، اور پھر اس ناگزیر ضرورت کے لئے اخلاقی و قانونی تحفظات بھی فراہم کرتی ہے۔

❀ ❀ ❀

انسان کا وقار اور تکریم

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے، تو جو شخص طاغوت (شیطان اور شیطانیت) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اُس نے ایسی مضبوط رسی پکڑ لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (سب کچھ) سنتا اور جانتا ہے۔ (۲۵۶:۲)

اس آیت میں قرآن عقیدے کی آزادی کے حق کو محفوظ کرتا ہے، اور اس کے ساتھ جو چیز لاینفک طریقے سے جڑی ہوئی ہے وہ ہے عقیدے کا آزادانہ اظہار، اور عقیدہ رکھنے والوں کا آزادنہ جمع ہونا، چاہے وہ عارضی اجتماع کی شکل میں ہو یا عقیدے کی حفاظت اور تائید وحمایت کے لئے مستقل طور سے تنظیم بندی کی شکل میں ہو۔ یہ حقوق انصاف کی برقراری اور ناانصافی کے خلاف کھڑے ہونے کے لئے، نیز قانون وانتظام کو برتنے کی عوامی پابندی کو متوازن رکھنے کے لئے عوام کے لازمی حقوق ہیں۔ قرآن جن باتوں کو مذہبی عقائد سے متعلق حقوق کے طور پر بیان کرتا ہے، وہ ان تمام حقوق پر عائد ہوتی ہیں جو کسی بھی ایسی بات سے متعلق ہوں جن پر انسان یقین رکھتا ہو یا اس کا عام نظریہ ہو۔ ان حقوق کی حفاظت ضروری ہے اور عملی طور پر نیز منظم طریقے سے ان کا دفاع کرنا لازم ہے، اور ان حقوق کی نگرانی بنیادی طور سے عوام کو اور ان کے اداروں کو نیز عدالتوں کو کرنا چاہئے تاکہ جدید ریاست کو حاصل بے پناہ اختیارات کے مقابلے پر ان کا دفاع ہو سکے جو کہ انسانی اور تکنیکی وسائل سے لیس ہوتی ہے۔ کسی عقیدے کو جب تک اپنے قصد وارادے سے اور رضا کارانہ طور سے قبول نہ کیا جائے تب تک عقیدہ واقعتا اپنا وجود نہیں رکھتا اور نہ باقی رہ سکتا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اگر انسان کے دل ودماغ میں اس کی اپنی آزاد مرضی اور پورے خلوص کے ساتھ گہرائی سے پیوست نہ ہو تو اس کے اخلاقی اور عملی نتائج نہیں نکل سکتے۔ جبر اور دباؤ سے کوئی عقیدہ جھوٹا ہی رہے گا اور اس دنیا میں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اور نہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ مقبول ہوگا اور نہ آخرت میں اس کا کوئی صلہ ملے گا۔ اسی طرح کسی بھی قانونی فریضے کی ادائیگی کے لئے انسان کی رضامندی ضروری ہے، اور جبر ومجبوری انسان کے قول یا رضامندی کو بے معنی کر دیتی ہے [دیکھیں ''عام اصول'' کے تحت اس باب میں کہی گئی باتیں]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَ لْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لئے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اُس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں (کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ) انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسا اُسے اللہ نے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے اور دستاویز لکھ دے۔ اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے اور اللہ سے کہ جو اُس کا مالک ہے خوف کرے اور زرِ قرض میں سے کچھ کم نہ لکھوائے۔ اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے اور اپنے میں سے دو مردوں کو (ایسے معاملے کے) گواہ کر لیا کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو (کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی اور جب گواہ (گواہی کے لئے) طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔ اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اُس (کی دستاویز) کے لکھنے لکھانے میں کاہلی نہ کرنا۔ یہ بات اللہ کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے۔ اور شہادت کے لئے بھی یہ بہت درست طریقہ ہے۔ اس سے تمہیں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اگر (ایسے معاملے کی) دستاویز نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اور جب خرید وفرخت کیا کرو تو بھی گواہ کر لیا کرو اور کاتبِ دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں۔ اگر تم (لوگ) ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے اور اللہ سے ڈرو اور (دیکھو کہ) وہ تمہیں (کیسی مفید باتیں) سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ (۲:۲۸۲)

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور اگر تم سفر پر ہو اور (دستاویز) لکھنے والا نہ مل سکے تو (کوئی چیز) رہن باقبضہ رکھ کر (قرض لے لو) اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے (یعنی رہن کے بغیر قرض دیدے) تو امانت دار کو چاہئے کہ صاحبِ امانت کی امانت ادا کر دے۔ اور اللہ جو کہ اُس کا رب ہے اُس سے ڈرے اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔ جو اُس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (۲:۲۸۳)

اوپر مذکور آیت (۲:۲۸۲)، جو کہ قرآن کریم میں سب سے لمبی آیت ہے، لازمی انسانی حقوق اور عمومی فرائض کو بیان کرتی ہے، ساتھ ہی قرض کے لین دین کے سلسلے میں ضابطے بیان کرتی ہے۔ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری اور سماجی فریضہ ہے کہ جس کسی کو مادی وسائل یا نجی مواقع حاصل ہوں وہ ان سے حاصل ہونے والے اپنے فوائد میں سے ان لوگوں کو بھی حصہ دے جو اس کے ضرورت مند ہوں۔ چنانچہ جو لوگ دوسروں کو قرض دے سکتے ہیں انہیں یہ کرنا چاہئے البتہ انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ اس کے لئے ضروری ضمانت طلب کر سکتے ہیں، جو لوگ دستاویز لکھنے کے اہل ہوں انہیں چاہئے کہ جب ضرورت پڑے تو وہ اپنی اس اہلیت کو استعمال کر کے قرض لینے والے کی مدد کریں، جو لوگ گواہ بن سکتے ہیں وہ گواہ بنیں اور ضرورت کے وقت ٹھیک ٹھیک گواہی دیں اصل بات میں کوئی بھی کمی بیشی کئے بغیر [۲۸۲، ۲۸۳]۔ علاوہ ازیں، کوئی ہنر، جیسے کہ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت، ایک سماجی ضرورت ہوتی ہے، یہ محض کسی کی انفرادی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ عوامی تعلیم کے نظام میں حکومت کے ذریعہ ہنر کی تربیت دی جانی چاہئے اور عوامی خدمات میں اس ہنر سے استفادہ کا انتظام کیا جانا چاہئے۔ مسلم معاشرہ ایک مہذب معاشرہ ہوتا ہے جو قانونی فرائض کو سنجیدگی سے لیتا ہے، اور اس سلسلے میں تحریری ریکارڈ رکھنا ایک ضروری بات ہے۔

کچھ خاص معاملوں میں گواہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مرد کی گواہی کے متبادل کے طور پر دو خواتین کی گواہی طلب کرنا کسی بھی طرح عورت کی اخلاقی یا عقلی کم تری کا اشارہ نہیں ہے بلکہ اس تاریخی اور سماجی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ ایک عورت کاروباری معاملات اور ان کی قانونی ضروریات سے کم مانوس ہوتی ہے اور اس لئے اپنی دی ہوئی گواہی کو ذہن نشیں رکھنے میں اس کی توجہ کم ہوسکتی ہے اور بھول چوک کا امکان زیادہ ہے اور گواہ کے بطور اسے بیان کرنے میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ حیض اور حمل کی فطری تکلیفوں کا بھی ہر معاملہ میں لحاظ رکھنا ضروری ہے، لیکن عورت کے بنیادی انسانی حقوق اور اس کے فرائض سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آیت قرض کے لین دین میں محض نسوانی گواہی کے ضابطے کو محدود کرتی ہے، یہ عورت کے معاملہ میں کوئی عام اصول نہیں دیتی۔ کسی خاتون کی گواہی مرد کی گواہی کے برابر ہی ہے اور بعض معاملوں میں اگر اسے اپنے مشاہدے کو بیان کرنے میں زیادہ معتبر پایا گیا ہو تو اس کی گواہی کسی مرد کی گواہی کے مقابلے زیادہ اہمیت والی ہوگی جیسا کہ معروف فقیہ ابن القیم [متوفی ۷۵۱ ہجری بمطابق ۱۳۵۰ عیسوی] نے اپنی کتاب ''الطرق الحاکمیہ'' میں لکھا ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت کاروباری معاملات سے پوری واقفیت رکھتی ہو [خاص طور سے کوئی کاروباری خاتون، کوئی خاتون اکاؤنٹنٹ یا وکیل] تو دو عورتوں کی گواہی کی ضرورت کا سبب کہ ''تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے'' مفقود ہوگا، اور اس لئے ضرورت اپنا سبب (علت وجود) نہ رکھتی ہوگی اور اسے پورا کرنا ضروری نہ ہوگا۔ کئی فقہاء نے جن میں الطبری، الطہاوری اور ابن الحزم نیز ابوحنیفہ شامل ہیں نے کہا ہے کہ عورت جج بننے کی مجاز ہے۔ تب یہ کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ شریعت ایک عام اصول کے طور پر ایک عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے مقابلے آدھی گواہی مانتی ہے؟

اگر ہر گواہ پر اپنا مشاہدہ بیان کرنے کا حق اور بیان کرنے کی ذمہ داری لازم آتی ہے تو اسے کسی بھی ممکنہ نقصان سے بچانا اور تحفظ دینا بھی لازمی ہے۔ یہ حق ایک عام اصول کے طور پر تحریر یا تقریر کے ذریعہ یا کسی اور واسطے سے کسی بھی رائے کے اظہار پر بھی صادق آتا ہے جو ایک ذمہ داری یا فریضہ بھی ہوسکتا ہے۔ عقیدے کے حقوق ان کے اظہار اور ان پر عمل کے لئے جمع ہونے کے حقوق کے بغیر بے معنی ہیں۔ کسی کو بھی اپنے عقائد یا خیالات کے اظہار کی وجہ سے حکام یا دوسرے لوگوں کے ذریعہ کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

اور جو شخص سیدھا رستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اُسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔ (۴:۱۱۵)

اخلاقی اور قانونی ذمہ داری تعلیم اور معلومات حاصل کرنے کے انسانی حق کے ساتھ وابستہ ہونا چاہئے تاکہ آدمی یہ جان سکے کہ کیا چیز اخلاقی یا قانونی لحاظ سے تسلیم کی گئی ہے اور کیا چیز قانونی طور سے ممنوع اور قابل سزا ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کا انصاف اس بات کو نہیں مانتا کہ ہر شخص کو اخلاقی اور قانونی ضابطے خود ہی جاننا ہوں گے، نہ یہ ان قوانین کو سرسری طور سے بتا دینے پر اکتفا کرتا ہے؛ اس کے بجائے وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ قوانین کو لوگوں کے علم میں اس طرح سے لایا جائے کہ ان کے لئے واضح اور قابل فہم ہو، اور سماجی طور پر برت کر انہیں تقویت و تشہیر دی جائے۔ اس طرح کسی فرد کے ذریعہ قانون کے خلاف ورزی انسانی عقل اور عوامی رویہ سے متصادم ہوگی۔ کئی آیات میں ''اللہ کی ہدایت کو ذہن نشیں کرانے'' پر زور دیا گیا ہے اور اسے دنیا و آخرت میں انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کی شرط کے بطور پیش کیا گیا ہے [۲۷:۲۵، ۳۲]۔ تعلیم اور معلومات کو ایک اسلامی معاشرے میں انسانی حق اور ذمہ داری کے طور پر برتا جاتا ہے۔ گھر یا خاندان پہلا ادارہ ہے جو بچوں کو سب سے پہلے مرحلے پر تعلیم اور معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کے بعد، وہ لوگ جنہیں عوام میں سے عوام کے ذریعہ ہی حکم اور اختیارات تفویض کئے جاتے ہیں (''اولی الامر منکم'') [۴:۵۹] عوام کو یعنی بچوں اور بڑوں سب کو علم حاصل کرنے کے حق سے مستفید ہونے اور فریضے کو پورا کرنے کے لائق بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ رسول اللہ کی ایک حدیث ہمیں بتاتی ہے علم حاصل کرنا ہر مسلمان، مرد یا عورت پر فرض ہے [بروایت عبدالبر اور البیہقی، الطبری]، اور یہ حکام کی ذمہ دری ہے کہ افراد کو اپنے فرائض پورے کرنے اور اپنی خفتہ صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لائق بنائیں [نیز دیکھیں ابن حزم (م۔ ۴۵۶ ہجری مطابق ۱۰۵۳ء) کی مثال]، الاحکام، جلد ۵، باب ۳۱، ص۔ ۱۱۳ تا ۱۱۴، مطبوعہ قاہرہ]۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو مزین کیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور بے جا نہ اڑاؤ کہ اللہ بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پوچھو تو کہ جو زینت (و آرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اُن کو حرام کس نے کیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے دن تو خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں سمجھنے والوں کے لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔ کہہ دو کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کا

تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

شریک بناؤ جس کی اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں۔
(۷:۳۱تا۳۳)

انسان کو نہ صرف اپنی ضروریات اور احتیاج پوری کرنے کا حق ہے بلکہ صاف ستھری زندگی گزارنے اور زینت و آرائش کے ساتھ رہنے کا بھی حق ہے۔ انسانوں کے پاس عقل و سوجھ بوجھ ہوتی ہے اور ان کی اپنی پسند و ناپسند ہوتی ہے اور انہیں اس بات کا موقع ملنا چاہئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں و امکانات کو بروئے کار لائیں اور محض اپنے وجود کی بقاء کے محدود دائرے میں ہی نہ جئیں۔ اللہ کا دین ان انسانی صلاحیتوں اور قوتوں کو عقلی اور قانونی طریقے سے تکمیل کی راہ دکھانے کے لئے آیا ہے، کیوں کہ ہر فرد اپنی قوتوں کی تکمیل کا حق اور ذمہ داری رکھتا ہے، اور جن لوگوں کو عوام میں سے خود عوام نے اختیارات و حکمرانی تفویض کی ہو (یعنی اولی الامر) ان کی ذمہ داری ہے کہ افراد کو اپنی صلاحیتوں و قوتوں کی تکمیل کا موقع دیں۔ درج بالا آیت دین کے بارے میں اس عام غلط فہمی کی تردید کرتی ہے کہ فطرت نے انسان پر بندشیں لگائی ہیں اور انسانی رویے کو دبایا ہے۔ اللہ کی ہدایت تو متوازن اور منصفانہ ہے اور اس کا مقصد تمام جائز انسانی امنگوں کو راستہ دکھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا حسن بڑھانے اور اسے خوش گوار و پر لطف بنانے کے لئے جو کچھ بھی فراہم کیا ہے وہ اللہ کے بندوں کے لئے اس دنیا میں جائز اور قانونی ہے، اور آخرت میں تو ان مسرتوں کے حصول کے حق دار تو صرف مومن ہی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف انہی چیزوں کو ممنوع کیا ہے جو فرد یا سماج کو جسمانی، عقلی، اخلاقی یا روحانی لحاظ سے نقصان پہنچاتی ہیں، کیوں کہ ان مختلف میدانوں میں انسانی خوبیوں کے ساتھ ناانصافی ہوسکتی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو خدائی کا مقام دینے کا مطلب انسان کی عقلی اور روحانی کارکردگی کا غلط استعمال ہے اور یہ چیز فرد اور سماج کے استحکام، توازن اور لیاقت کو نقصان پہنچاتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

جو رسول (محمد ﷺ) کی اتباع کرتے ہیں جو کہ نبی اُمی ہیں، جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو اُن کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں اور اُن پر سے بوجھ اور طوق جو اُن پر (لدے) تھے اتارتے ہیں؛ تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی، وہی مراد پانے والے ہیں۔ (۷:۱۵۷)

چوں کہ اللہ کا دین اچھی چیزوں کو جائز قرار دیتا ہے جو کہ جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے مفید ہیں اور بری چیزوں کو جو کہ جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے غلط اور نقصان دہ ہیں ممنوع کرتا ہے، اس لئے یہ انسان کا حق ہے کہ وہ زندگی کی ان اچھی چیزوں سے استفادہ کرے۔ یہ

اسلامی حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ کام کرنے کی اہلیت رکھنے والے لوگوں کو کام کے مناسب موقعے دے کر اور انہیں ان کی کاوشوں کا منصفانہ معاوضہ دے کر ان کے لئے ان مفید چیزوں کی فراہمی کو یقینی بنائیں، یا جو لوگ کام کرنے کے اہل نہیں ہیں انہیں عارضی یا مستقل بنیادوں پر سماجی امداد کے ذریعہ ان مفید چیزوں سے استفادے کا موقع دیں۔ بری اور نقصان دہ چیزیں جنہیں اللہ نے ممنوع کر دیا ہے ان میں نہ صرف شراب اور خنزیر شامل ہیں بلکہ غیر غذائیت بخش اور نقصان پہنچانے والی خوردونوش کی اشیاء بھی شامل ہیں جنہیں کوئی انسان اس لئے استعمال کرتا ہے کہ وہ غذائیت بخش چیزوں کے استعمال کی گنجائش نہیں رکھتا یا اپنی بری عادتوں کو وجہ سے ان غیر مفید اور نقصان دہ چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ اچھے اور مفید کام کرنے پر زور دینے کی بات تعلیم حاصل کرنے کے انسانی حق پر بھی منطبق ہوتی ہے: یعنی تعلیمی اداروں اور ماس میڈیا کے ذریعہ بچوں اور بڑوں سب کو یہ تعلیم دینا کہ ان کے لئے جسمانی، عقلی اور اخلاقی لحاظ سے کیا اچھا اور مفید ہے اور کیا برا اور نقصان دہ ہے۔ جو لوگ غلط حرکتیں کرتے ہیں ان کے اوپر سزا اور جرمانہ عائد کرنے سے پہلے یا سزا اور جرمانہ عائد کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو اللہ کی ہدایت سے روشناس کرانا چاہئے اور یہ بتانا چاہئے کہ یہ ہدایت فرد اور سماج کے لئے جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے کیوں کر بہتر اور اچھی ہے [۴:۱۱۵]۔ اچھے اور صحیح کاموں پر لوگوں کو کاربند رکھنے کے لئے اور برے وغلط کاموں سے انہیں روکنے کے لئے تعلیم اور سماجی اصلاح لازمی ہے۔ اللہ کی ہدایت انسان کو ان پر لدے بوجھوں اور طوقوں سے نجات دیتی ہے، خواہ یہ ان پر ان کی جہالت، بے بصیرتی اور توہمات کی وجہ سے لدے ہوں یا ایک دوسرے کے ذریعہ گمراہ ہونے اور استحصال کے باعث ان پر تھوپے گئے ہوں۔ جو لوگ اس پیغام ہدایت میں یقین رکھتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں انہیں ان سارے انسانی حقوق اور فرائض کو یقینی بنانا چاہئے جو زندگی کے ہر معاملے میں اس پیغام ہدایت نے واضح کئے ہیں، اور پورے سماج کے لئے، اور جہاں تک ممکن ہو پوری دنیا کے لئے اس مکمل انصاف کا اہتمام کرنا چاہئے، اور اس کے لئے انہیں زندگی کے تمام جائز لوازمات وضروریات اور زینت وآرائش کی اچھی چیزوں کو شریعت کی رہنمائی میں اور اس کے مقاصد کے تحت فروغ دینا، تقسیم کرنا اور دوسری اچھی چیزوں سے ان کا تبادلہ کر کے انہیں فراہم کرنا چاہئے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰

اللہ تمہیں انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (۹۰:۱۶)

انصاف ایک جامع اور ہمہ گیر عمل ہے اور حاکموں ومحکوموں سب پر برابر سے لازم ہوتا ہے [دیکھیں اگلے حصہ ''حاکم اور محکوم کا تعلق''، میں اس آیت کی تشریح]۔ افراد کے اپنے حقوق ہوتے ہیں جو انہیں ملنا چاہئیں، اور اسی کے ساتھ انہیں اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بھی پورے کرنے چاہئیں۔ حکام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قانون اور اس پر عمل کے ذریعہ افراد کے حقوق کی حفاظت کریں، ساتھ ہی ان کا اپنا حق یہ ہے کہ وہ ہر فرد کے فرائض کی تکمیل کو بھی یقینی بنائیں، نظم عامہ کو برقرار رکھیں اور عوام کی حمایت وتعاون حاصل کریں۔ حاکموں اور محکوموں دونوں کو باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ البتہ، عوام کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ادائیگی میں حکام کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ عوامی املاک یا نظم عامہ اور امن وامان یا صحت عامہ یا عوام کے اقتصادی ور مالیاتی استحکام کو اس صورت میں انفرادی

مفادات پر ترجیح حاصل ہوتی ہے جب مفاد عامہ کے لئے کچھ ایسے خاص اقدامات جو لوگوں کے انفرادی مفادات سے ٹکراتے ہوں ضروری ہو جائیں۔ دوسری طرف حکام کے فرائض اور ذمہ داریاں ان کے حقوق سے بڑھ کر ہیں اور ان فرائض میں کوتاہی کو انفرادی طور پر قانون کے خلاف ورزی کے برابر نہیں لیا جا سکتا کیوں کہ حکام تو پورے سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگی قیدیوں کے حقوق کا لحاظ ہر حال میں رکھا جائے گا بھلے ہی ان میں سے ہر ایک نے عوام کی سلامتی کو نقصان پہنچایا ہو۔

عوام اور حکام کے درمیان انصاف سے آگے بڑھ کر احسان اور مہربانی کا معاملہ کرنے کی تاکید کی جانی چاہئے اگر اس سے غلط کاروں کے جارحانہ رویوں کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ خاندان کے ساتھ وفاداری اور اس کی خدمت گزاری پر خاص توجہ دی جانی چاہئے کہ یہ حقوق و فرائض کی تعلیم اور اس پر عمل کرنے نیز دونوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا پہلا سماجی دائرہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک انسانی ضرورت ہے کہ غیر اخلاقی باتوں و کاموں اور ظلم و زیادتی کو ممنوع رکھا جائے اور ایسے بعض معاملوں میں سزا کا التزام بھی کیا جائے تاکہ اخلاقیات اور انصاف کی حفاظت ہو اور ان کو بڑھاوا ملے۔ انصاف کے نام پر انسان کی قوتوں و صلاحیتوں کو فروغ دینے یا انہیں تباہ کرنے والے اچھے یا برے موقعوں کو برابری کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا کیوں کہ دوسروں کو نقصان پہنچانا چاہے یہ نقصان انفرادی ہو یا سماجی، انصاف کی بنیادی روح کے ہی خلاف ہے۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اُس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔
(۱۷:۳۶)

انسانی حواس سے کام لینا اور ان حسی قوتوں کی حفاظت و ترقی ایک بنیادی انسانی حق ہے۔ حالانکہ یہ حق بھی دوسرے کسی بھی حق کی طرح اس ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہے کہ ان کا کوئی غلط استعمال نہ ہو۔ اپنی حسی قوتوں کا استعمال دوسروں کے نجی دائروں میں داخل ہونے کے لئے کرنا یا حکومت کے راز جاننے کے لئے کرنا سخت منع ہے۔ اپنے حواس کا استعمال دوسروں کے انفرادی حقوق یا پورے سماج کے اجتماعی حقوق کی قیمت پر نہیں کیا جانا چاہئے۔ کسی فرد کو مطلقاً آزادی دوسرے افراد اور مجموعی طور پر پورے سماج کی آزادی کے خلاف ہے اور یہ چیز خود فرد کے اخلاق کے لئے نقصان دہ ہے۔ بلا تحقیق افواہیں پھیلانا جس سے افراد یا سماج کو نقصان پہنچتا ہے، یا جاسوسی کرنا اور ٹوہ لگانے کے لئے گھر کی حرمت کو پامال کرنا اور خلوت میں دخل اندازی کرنا اخلاقی اور قانونی لحاظ سے منع ہے [۲۴:۲۷ تا ۲۹؛ ۴۹:۶ تا ۸، ۱۲]۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔
(۱۷:۷۰)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی روحانی اور عقلی قوتوں سے نوازا ہے، اور اسے صحیح و غلط میں جو چاہے انتخاب

کرنے کی آزادی دی ہے [۹۰:۱۰؛۹۱:۷ تا ۹]۔ انسان بری یا بحری راستوں سے یا فضا اور خلاء میں سفر کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے اپنی جسمانی اور عقلی لیاقتوں کا استعمال کر سکتا ہے [۲:۲۹؛۴۵:۱۲ تا ۱۳]۔ یہ افراد، سماج اور حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمہ جہت انسانی صلاحیتوں کی تکمیل کے لئے انسانی قوتوں کی حفاظت کریں اور انہیں ترقی دیں۔ انسان کو عالم گیر رسائی کا اہل بنایا گیا ہے اور روزی کمانے یا علم میں اضافے کے لئے اور دوسرے لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنے نیز اقتصادی تعاون کو فروغ دینے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی صلاحیت بخشی گئی ہے۔

صحت افزا اور تغذیہ بخش اچھی چیزوں سے اپنی روزی حاصل کرنا ایک انسانی حق ہے جن کی پوری دنیا میں مناسب ومنصفانہ طریقے سے تقسیم اور ادل بدل ہو۔ روزی وروزگار کی یہ فراہمی کام کرنے کے جائز مواقع سے یقینی ہونا چاہئے اور اس کے لئے ایسے قوانین کا التزام ہونا چاہئے جو کاروباری دنیا اور لیبر مارکیٹ میں انصاف کو یقینی بناتے ہوں اور استحصال و دھوکہ دہی سے بچاتے ہوں۔ جب تک انفرادی اور عوامی ذمہ داری کا شعور لوگوں کو نہیں دیا جائے گا تب تک انسانی وقار کو بحال نہیں رکھا جا سکتا، اور انسانی فرائض کی تکمیل انسانی حقوق کے مطالبوں کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ قرآن جس اکرام انسانیت کی بات کرتا ہے وہ حقوق اور ذمہ داریوں سے مرکب ہے۔ یہ انسان کے مجموعی اکرام کی بات ہے یعنی جسمانی لحاظ سے بھی، عقلی لحاظ سے بھی اور روحانی واخلاقی لحاظ سے بھی۔ یہ ایک آفاقی پیغام ہے کیوں کہ بنی آدم یعنی پوری بنی نوع انساں کے لئے یہ بات کہی گئی ہے قطع نظر ان کی جنس کے، نسل وقوم کے، مذہب وعقیدے کے اور ان کی طاقت و قوت کے۔ یہ اللہ کا بیان ہے جو کہ تمام انسانوں کا خالق ہے اور وہ کسی سے کوئی تعصب یا کسی کے لئے کوئی طرف داری نہیں رکھتا، اور اللہ کی معرفت وتقویٰ سے اس فرمان پر عمل ہوتا ہے جس کی جڑیں کسی بھی انسانی فلسفے، ملکی قانون یا بین الاقوامی قرارداد سے کہیں زیادہ گہری ہیں اور جس کا دائرہ ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں سے اجازت لئے اور اُن کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (اور ہم یہ نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ) شاید تم یاد رکھو۔ اگر تم گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے اس میں مت داخل ہو اور اگر یہ کہا جائے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے، اور جو کام تم کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔ (ہاں) اگر تم کسی ایسے گھر میں جاؤ جس میں کوئی بستا نہ ہو اور اس میں تمہارا اسباب (رکھا) ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ (۲۴:۲۷ تا ۲۹)

انسانی حقوق آدمی کے گھر اور خلوت کی حفاظت کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ ایک فرد کی حفاظت کرتے ہیں۔ درج

بالا آیات میں اُس زمانے کے عربوں کو نیز تمام لوگوں کو گھروں کی حرمت اور ان میں داخل ہونے کے ادب و تہذیب کی تعلیم دی گئی ہے۔ کوئی بھی آدمی کسی دوسرے کے گھر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اجازت نہ لے لے اور یہ نہ سمجھ لے کہ اسے خوش آمدید کہا جائے گا۔ اور اجازت بھی مہذب طریقے سے مانگنی چاہئے [۴۹:۵ تا ۵]۔ اس طرح کی بندشیں گھر والوں کی خلوت کی حفاظت کرتی ہیں اور آنے والے کی شخصیت و کردار کی حفاظت کرتی ہیں جسے دوسری آیات میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے یہ جاننے کی جستجو نہ کرے، کوئی ٹوہ نہ لے، غیبت نہ کرے اور۔۔ [۴۹:۶، ۱۲]۔ تہمت اور بہتان تراشی اخلاقی اور قانونی اعتبار سے سخت ممنوع ہے اور کسی کی عزت و وقار پر حملہ کرنے کو ایک بڑا جرم مانا گیا ہے اور اس پر سخت سزا کی وعید ہے [۲۴:۱۱ تا ۲۱؛ ۲۳ تا ۲۴]۔ قرآن جہاں ایک طرف آپس میں ملنے ملانے کو ایک سماجی ضرورت تسلیم کرتا ہے اور مومنوں کے درمیان اس میل جول اور ملنساری کو فروغ دینے کی تعلیم دیتا ہے وہیں ساتھ ہی ساتھ یہ گھروں کی حرمت اور خلوت کے حقوق کی حفاظت کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ ملاقاتی کو نہ صرف یہ کہ گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینی چاہئے بلکہ اسے یہ بھی اندازہ کر لینا چاہئے کہ وہ جن سے ملنے آیا ہے وہ اس وقت ملاقات کے موڈ میں ہیں بھی یا نہیں، اور پھر ملاقات و بات چیت سے پہلے ہی سلام دعا کا تبادلہ کرنا چاہئے۔ البتہ یہ اہتمام وہاں لازمی نہیں ہے جو عوامی مقامات ہوں، جیسے کاروبار کی جگہیں، سرکاری دفاتر، حکومت کے ادارے، اسکول، میوزیم اور ہوٹل وغیرہ۔

وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۹

اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادہ کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پس جب وہ رجوع کرے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۴۹:۹)

انصاف ایک جامع عمل ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایک لازمی حکم ہے، جس پر عمل کرنا تمام مومنوں، مرد و عورتوں، کے لئے لازم ہے۔ جب کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو رہی ہو اور اس کے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہوں تو لوگوں کو خاموش تماشائی نہ بنے رہنا چاہئے۔ انہیں ناانصافی کرنے والے اور حقوق انسانی کی پامالی کرنے والے کو روکنے کے لئے ہر طرح کا سیاسی دباؤ بنانا چاہئے اور قانونی اقدامات کرنے چاہئیں۔ اگر یہ تمام کوششیں مظلوم کو انصاف دلانے میں ناکام ہو جائیں اور ظالم مزید ظلم پر آمادہ ہو تو مظلوم کو اپنا دفاع کرنے اور ظلم کی مزاحمت کرنے کا حق ہے اور دوسرے مومنوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مظلوم کی حمایت و مدد کریں۔ یہ آیت انصاف اور انسانی حقوق کے دفاع میں عمومی فکرمندی کو ایک لازمی اصول کے طور پر پیش کرتی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کریں اور ترازو (یعنی قواعدِ عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم

فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

رہیں اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کر لے؛ بے شک اللہ قوی (اور) غالب ہے۔ (۲۵:۵۷)

یہ آیت اور اس کی تشریح ''عام اصول'' سرخی کے تحت اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہے لیکن یہاں اسے اس لئے دوہرایا جا رہا ہے کہ انسانی وقار کے حوالے سے اس کی مناسبت بالکل عیاں ہے۔ اللہ کی نازل کردہ کتب اور اس کے پیغمبروں کے ذریعہ بندوں کو پہنچایا گیا پیغام انہیں صحیح اور غلط کو سمجھنے کا درست پیمانہ فراہم کرتا ہے اور ایک دوسرے کو برتنے اور اس برتاؤ میں توازن اور درستگی کے ساتھ فیصلے کرنے کے لئے معیار دیتا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اور اخلاقی قدریں انسانی حقوق اور ذمہ داریوں کے لئے ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہیں، لیکن اللہ کے پیغام کی وضاحت اور اس کو عمل میں لانے کے لئے لوگوں کو عقل وفہم کی بھی ضرورت ہے اور یہ عقل وفہم یعنی حکمت اللہ کے پیغمبروں اور ان کے بعد ان کے جانشیں ذمہ داروں (اولی الامر) کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، حقوق سے مستفید ہونے اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے ایک طاقت بھی موجود ہونا چاہئے اور یہ طاقت حکومت اور حکام کے پاس مسلح افواج کی شکل میں موجود ہوتی ہے اور اس کی طرف اشارہ لفظ حدید (لوہا) سے کیا گیا ہے۔ لیکن لوہے کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور یہ فوائد انسانی تہذیب کی طویل تاریخ سے ثابت ہیں۔ دفاع اور تہذیبی ترقی میں معدنیات اور توانائی کی خدائی نعمتوں کے استعمال سے توازن قائم رکھنا چاہئے، اور ایک اور توازن مادی تکنیکی ترقی اور انسان کی روحانی واخلاقی ترقی کے درمیان بھی برقرار رکھنا چاہئے۔

❀ ❀ ❀

حکام اور محکوموں کے درمیان تعلقات

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۱۸۸

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اُس کو (رشوت میں) حاکموں کے پاس پہنچاؤ اس لئے کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ جانتے بوجھتے ناجائز طور پر کھا جاؤ۔ (۱۸۸:۲)

حکام اور عوام کے درمیان تعلقات میں بدعنوانی ایک سنگین مسئلہ ہے، اور یہ بدعنوانی دونوں طرف سے ہوسکتی ہے: ایک طرف محکومین یعنی عوام کا رویہ بدعنوانی پر مبنی اور حکام و افسران کو بدعنوان بنانے والا ہوسکتا ہے اور دوسری طرف خود حکام اور افسران کا رویہ بدعنوانی پر مبنی ہوسکتا ہے۔ یہ دونوں رویے عموماً برابر سے یا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے ہیں، لیکن بعض اوقات کوئی ایک فریق شروعات کرتا ہے اور دوسرے کو بدعنوانی پر مبنی معاملہ کرنے کے لئے قائل کرتا ہے۔ درج بالا آیت عوام یعنی محکوموں کو مخاطب کرتی ہے جو ایک دوسرے کو اس کے حق و اختیار سے محروم کرنے کے لئے رشوت ستانی سے کام لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں ایسے شخص کی مذمت کی گئی ہے جو رشوت کی پیش کش کرتا ہے، جو رشوت قبول کرتا ہے اور جو ان دونوں کے درمیان واسطہ بنتا ہے [بہ روایت ابن حنبل]۔ یہی ضابطہ عوام کے حقوق اور عوامی ملکیت غصب کرنے کے معاملہ میں بھی عائد ہوتا ہے۔ ایمان داری ایک سماجی قدر ہے جس پر پورے سماج کو قائم رہنا چاہئے، لیکن بے ایمانی والی کوئی ایک بات بھی سماج میں بدعنوانی یا بے ایمانی پھیلنے کی وجہ بن سکتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس اختیارات ہوتے ہیں، چاہے سیاسی اختیارات ہوں، انتظامی اختیارات ہوں، عدالتی اختیارات ہوں یا کسی اور قسم کے اختیارات ہوں، انہیں رشوت ستانی کے کسی بھی لالچ اور اکساوے کو مسترد کر دینا چاہئے اور ایسی کسی بھی کوشش کو ناکام بنا دینا چاہئے۔ لیکن سماج میں ایمان داری قائم رکھنے کی زیادہ ذمہ داری عوام پر ہی ہے اور انہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ حکام اور عہدیداروں کو بدعنوانی میں مبتلا ہونے سے روکنے کے لئے ان پر نظر رکھیں۔ تاہم اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ کسی خاص زمانہ اور مقام پر ایمان دار لوگ تہی دست ہوتے ہیں اور بے ایمان لوگ بھرے پرے ہوتے ہیں۔

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اورتم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جولوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اوراچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جونجات پانے والے ہیں۔(۳:۱۰۴)

یہ ایسی جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کوفروغ دینے کی ایک ترغیب ہے جوان کاموں کوانجام دیں جو پورے مسلم معاشرے کی ذمہ داری ہیں[۳:۱۱۰]، جیسے سبھی لوگوں کو اچھی باتوں اور اچھے کاموں کی طرف بلانا اور ایسے کام کرنے کا حکم دینا جنہیں سبھی لوگ اچھا جانتے ہوں (معروف)، اور ایسے کاموں سے روکنا جنہیں لوگ خود اپنی عقل سے ہی غلط اور برا جانتے ہوں (منکر)۔ یہ تنظیمیں اور ادارے سرکاری بھی ہوسکتے ہیں، عوامی بھی ہوسکتے ہیں اور عوام وحکومت دونوں کے اشتراک سے چلنے والے بھی ہوسکتے ہیں؛ اور مقامی سطح کے بھی ہوسکتے ہیں اور ملکی یا قومی سطح کے بھی۔ سیاسی پارٹیاں پیشہ وارانہ یونینیں یا سماجی تنظیمیں ان گروپوں کی نمائندہ ہوسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ تعلیمی ادارے اور ماس میڈیا اس تعمیری کام کو بڑھاوا اور توسیع دینے کا موثر وسیلہ ہیں۔ ان گروپوں اور ذرائع کے واسطے سے پوری عوام کو آواز اٹھانے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ اخلاقی بگاڑ اور گراوٹ کے بارے میں سماجی بے حسی کے تباہ کن نتائج کے حوالے سے قرآن بار بار شدت سے متنبہ کرتا ہے چاہے یہ اخلاقی گراوٹ اوپر سے آئے یا نیچے سے[۸:۲۵؛۱۱:۱۱۳]۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں جہاز کی مثال دی گئی کہ مسافروں سے بھرے کسی جہاز میں اگر کوئی نادان انسان پانی لینے کے لئے سوراخ کرنے لگے اور باقی لوگ اسے نہ روکیں تو سب کے سب ہی ڈوب جائیں گے [بخاری، ابن حنبل اور ترمذی]۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

(مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم اُن سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے تو اُن کیلئے بہت اچھا ہوتا۔ اُن میں ایمان لانے والے بھی ہیں (لیکن تھوڑے) اور اکثر نافرمان ہیں۔ (۳:۱۱۰)

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات، جنہیں لانے والے پیغمبروں نے سخت محنت کی اور بہت زیادہ تکالیف برداشت کیں، محض اس لئے نہیں بھیجے کہ لوگ صرف اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ کائنات کا خالق اللہ ہے، باقی عمل کی دنیا میں اس بات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ تو اللہ کے وجود کا اس طرح سے اقرار کرنا ہوا جیسے کسی ستارے، سیارے یا کہکشاں کی موجودگی کا اقرار کرنا۔ ایسے غیر عملی اقرار واعتراف سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور یقینی طور سے اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کی ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ (اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف) انسان کے دل اور دماغ پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنے اثرات مرتب کرے اور یہ اثرات افراد سے سماج تک پھیل جائیں۔ اللہ کا تقویٰ اخلاق کو وسعت و گہرائی دے، اور نیک کاموں کا حکم دینے و برے کاموں سے روکنے کے لئے انسان کو مستعد کرے۔ وگرنہ ایک انحراف اور زوال کی شروعات ہوگی جو اگرچہ شروع میں محدود ہوگا لیکن اگر شروع میں ہی اسے نہ روکا جائے تو پھر پھیلتا جائے گا اور سماج کے

بڑے حصے کو متاثر کرے گا[۸:۲۵؛۱۱:۱۱۳]۔ یہ اللہ کی تمام ہدایات کا مقصد ہے، اور اللہ کے کسی بھی پیغمبر پر ایمان رکھنے والے لوگوں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ ان مشترک بنیادوں پر مسلمانوں کے ساتھ تعلق قائم کریں۔ حالانکہ ان ماننے والوں میں سے اکثر لوگوں نے گھمنڈ میں رہنا پسند کیا اور مادی مفادات کے پیچھے ہی لگے رہے۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ہی عقیدے کے تئیں مخلص ہیں اگرچہ وہ اپنے عقائد پر ہی برقرار ہیں اور اسلام کی طرف کبھی نہیں آتے۔ دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں ایمان داری اور صحیح طرز عمل کی تعلیم کے علاوہ، اس آیت میں اخلاقی کاموں کے لئے مشترک بنیاد کو اجاگر کیا گیا ہے جس پر مسلمان دوسروں سے مل سکتے ہیں تاکہ سماج میں ایک اخلاقی نگرانی کا نظام قائم ہو اور یہ اخلاقی معاملہ تمام میدانوں میں ہو، خاص طور سے حکام اور عوام کے درمیان تعلقات میں۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹

(اے محمد ﷺ!) اللہ کی مہربانی سے تمہاری اُفتادمزاج ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، تو اُن کو معاف کردو اور اُن کے لئے (اللہ سے) مغفرت مانگو اور اپنے کاموں میں اُن سے مشورہ لیا کرو اور جب (کسی کام کا) عزمِ مصمم کرلو تو اللہ پر بھروسا رکھو؛ بے شک اللہ تعالیٰ بھروسا رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۳:۱۵۹)

اس آیت میں قیادت کی ایک لازمی صفت کو اجاگر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ قیادت کے اندر یہ وصف ہونا چاہئے کہ وہ انسانی رویوں، میلانات، کمزوریوں اور حدود کو سمجھ سکے اور لوگوں کے ساتھ فہم وفراست، ہمدردی اور عفو ودرگزر سے پیش آئے۔ ایک قائد کو کسی بھی شخص سے کوئی معاملہ کرتے وقت اس کی مثبت صلاحیتوں اور آئندہ امکانات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے، صرف اس وقت خاص میں اس کی کیفیت کو ہی نہیں دیکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ، قائد ان تمام لوگوں کا نمائندہ ہوتا ہے جو اس کے پیچھے چلتے ہیں، اور کسی شخص کو اس طرح نہیں برتنا چاہئے جیسے کہ یہ برتاؤ دو لوگوں کے درمیان محض تعلقات کا حصہ ہو۔ ایک قائد کو اس بارے میں ہمیشہ محتاط اور حساس رہنا چاہئے کہ اس کے قول اور فعل کا کسی پر کیا اثر پڑے گا۔ جب کوئی پیروکار حدود سے تجاوز کرے اور غلط کر بیٹھے تو قائد کو اسے نہ صرف معاف کردینا چاہئے بلکہ اس کے لئے اللہ سے دعا بھی کرے کہ اللہ بھی اس کی یہ خطا معاف کرے۔ اسی سے یہ ظاہر ہوگا کہ قائد نے اسے واقعی معاف کردیا ہے۔

عام دل چسپی کے معاملات میں یا بعض اوقات کچھ خاص اہمیت والے نجی معاملوں میں فیصلہ لینے میں شرکت قائد اور متبعین کے درمیان تعلقات کے لئے لازمی ہے۔ اور اگر یہ چیز خود نبی ﷺ اور ان کے امتیوں کے درمیان تعلق میں بھی مطلوب ہے تو پھر حکام اور عوام کے درمیان تعلق میں تو بدرجہ اولیٰ لازمی ہوگی[۴۲:۳۸]۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ جیسے عام معاملات میں اس صلاح ومشورے کے عمل کو ہمیشہ اختیار کیا، حتیٰ ایسے نجی معاملوں میں جن سے عوام متاثر ہورہے تھے (مثلاً اپنی زوجہ محترمہ اماں عائشہؓ پر تہمت لگائے جانے کے معاملہ میں، دیکھیں آیت ۲۴:۱۱ تا ۲۵] مشورہ کیا۔ چنانچہ، پبلک پالیسی بنانے میں اور اہم فیصلے لینے میں عوام کی شرکت وشمولیت عوام کا ایک بنیادی حق ہے جو ہر ایک کو ملنا چاہئے، چاہے اس کے اندر کتنی ہی خامیاں رہی ہوں۔ رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ آپؐ ان لوگوں کو معاف

کر دیا کریں جن سے قصور ہوا ہو اور انہیں مشوروں میں شامل کریں ان معاملوں میں جن میں ان کے مشوروں کی ضرورت ہو۔ انسان کبھی بے خطا نہیں ہوسکتا، اور خطا کار انسان کو اپنے حقوق ملنا چاہئیں اور عام معاملات میں اس کی شرکت ہونی چاہئے اور اسے کبھی الگ تھلگ نہیں کر دینا چاہئے، کیوں کہ سماج کے ساتھ افراد کے تعامل سے سبھی کو خود کی اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ عوامی معاملات میں اس طرح اجتماعی طور پر فیصلے لینے سے انارکی پیدا نہیں ہوتی۔ قائد کا فیصلہ عام رائے سے الگ یا اس کے متوازی یا اس کے برابر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس مشورے سے کسی فیصلہ پر پہنچتا ہے، جیسا کہ متعدد قدیم مفسرین نے یہ نکتہ اجاگر کیا ہے [مثال کے طور پر دیکھیں ابن کثیر کے ذریعہ دی گئی مثالیں، خاص طور سے یہ کہ نبی ﷺ نے جنگ بدر کے موقع پر صحابہ سے مشورہ، جنگ خندق کے موقع پر صحابہ سے مشورہ اور حضرت سلمان فارسی کی رائے پر عمل کرنا، اور اپنی بیوی سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت کے معاملہ میں مشورہ]۔

عوام کے ذریعہ اختیار و اقتدار تفویض کئے جانے والے حکمراں اور ان کی حاکمیت

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بلا شبہ اللہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ مومنو! اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ حکم ہیں اُن کی بھی، اور اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو اگر تم (واقعی) اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہت بہتر بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔ (۴:۵۸ تا ۵۹)

لوگوں پر اختیار حاصل ہونا ان لوگوں کے اوپر ایک ذمہ داری ہوتی ہے جنہیں لوگ خود اپنے درمیان سے یہ اختیارات تفویض کرنے کے لئے منتخب کرتے ہیں، کیوں کہ انہیں انصاف کے ساتھ معاملات انجام دینا ہوتے ہیں۔ ایک مسلم معاشرے کے لئے سب سے اعلیٰ قانون (سپریم لاء) اللہ کا قانون ہے جو قرآن میں دیا گیا ہے اور مستند و متواتر حدیثوں (سنت) سے ملتا ہے۔ قرآن و سنت کے ضابطوں کو کسی بھی دوسرے سماجی اور قانونی ضابطے پر فوقیت حاصل ہے اس کے باوجود کہ حکام کی عزت اور ان کے ساتھ وفاداری کو قرآن و سنت نے لازم کیا ہے اور اس کا بہت شدت سے حکم دیا ہے۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تحفظ کے مطلق فرماں برداری تو اللہ کے قانون کے لئے ہی ہے، اس کے بعد قائدین کی اطاعت کا معاملہ آتا ہے جن کے فیصلوں کو تبھی مانا جائے گا جب وہ اللہ تعالیٰ کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کے مطابق ہوں گے اور انسانی ضرورت کو پورا کرنے والے ہوں گے۔ اطاعت کا حکم سب سے پہلے آیت ۵۹ میں صرف اللہ کی اطاعت کے لئے آیا ہے جس سے اللہ کی حاکمیت سب سے بالاتر، سب سے پہلے اور غیر مشروط ہونے کا واضح اشارہ ملتا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول کریم ﷺ کی مستند احادیث بھی وحی کا درجہ رکھتی ہیں جو اللہ کے قانون کا جزو لاینفک ہیں اور جن پر عمل لازمی ہے۔ البتہ،

آپ ﷺ کے وہ اقوال واعمال جو آپؐ کے بشری احساسات اور تجربات کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے جنگ کے میدان میں جنگی کارروائیوں کو انجام دینا، اور ایسے ہی دوسرے دنیوی معاملات میں آپ ﷺ کی ہدایات جن میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذاتی صواب دید پر انحصار کیا ہو، ان کو ماننا اس وقت آپ کے ساتھ لڑنے والے صحابہ کے لئے ایک سپہ سالار کے حکم کے بطور لازم تھا، انہیں ایک مستقل قانون نہیں سمجھا جاسکتا [مثال کے طور پر دیکھیں آیت ۳:۱۵۹ پر ابن کثیر اور قرطبی کی تشریح]۔ جن قائدین نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے امیر کی حیثیت سے آپؐ کی جانشینی کی انہیں عوام نے ہی اپنے میں سے منتخب کیا تھا اور اختیارات تفویض کئے تھے، جیسا آیت ۵۹ میں زور دے کر کہا گیا ہے۔ عوام جب کسی کو اپنا قائد منتخب کرتے ہیں تو ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ پالیسی سازی اور دیگر اہم معاملوں میں بھی شریک ہوں [۳:۱۵۹؛ ۴۲:۳۸] نیز اپنے قائدین پر نظر رکھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قانونی اور اخلاقی ضابطوں کے مطابق وہ کس حد تک عمل کر رہے ہیں۔

جن لوگوں کو عوام اختیارات اور اقتدار تفویض کرتے ہیں وہ جب اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں تو ان کے درمیان اختلاف رائے بھی پیدا ہوتا ہے کیوں کہ وہ کسی ایک شخص کے نمائندہ نہیں ہوتے بلکہ ایک دارہ جاتی اجتماعی قیادت کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں، جیسا کہ آیت ۵۹ میں صیغہ جمع کے استعمال سے بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ، قیادت کے درمیان اختلاف رائے بھی ہوسکتا ہے اور دوسری طرف خود عوام کے درمیان بھی اختلاف رائے ہوتا ہے۔ لہذا، ان اختلافات کو ایک ایسے ادارے کے زیر غور لایا جائے جو صلاح و مشاورت اور عدالتی حیثیت سے اللہ کے قوانین کی ترجمانی کا اعلیٰ ترین اختیار رکھتا ہو: ''یہ (تم سب کے فائدے کے لئے) بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے''۔ مشہور فقیہ ابن تیمیہ نے درج بالا آیتوں کو بجا طور سے ''حکام اور محکوموں سے متعلق آیات'' قرار دیا ہے، کہ یہ آیات صاف طور سے دونوں کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کو بیان کرتی ہیں۔

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اُسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اُس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اُس کی تحقیق کر لیتے؛ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی مہربانی نہ ہوتی تو چند اشخاص کے سوا سب شیطان کے پیرو ہو جاتے۔ (۴:۸۳)

یہ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ ایسی خبروں کو بلا تحقیق پھیلانے سے بچے جن سے عوامی سلامتی خطرے میں پڑتی ہو۔ جب عوام میں سے کوئی ایسے حساس معاملوں کو ان لوگوں تک پہنچائے جنہیں انھوں نے اپنے معاملات کا ذمہ دار بنایا ہے (یعنی اولی الامر) تو ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو صحیح معلومات سے باخبر کریں تاکہ باخبر رہنے کے لوگوں کے حق کو پورا کیا جائے، یا ان کی درخواست پر انہیں باخبر کیا جائے ضروری احتیاطی تدابیر کے ساتھ۔ ہر معاملے میں عدالتوں کو ہمیشہ یہ یقینی بنانا چاہئے کہ اطلاعات حاصل کرنے کے عوام کے حق اور مطلوبہ معلومات کو احتیاط و تحدیدات کے ساتھ جاری کرنے کے حکومت کے حق میں توازن بنا رہے۔ یہ آیت یہ بتاتی ہے کہ جب کوئی فرد جو عوامی سلامتی سے متعلق کسی معاملے کی تحقیق چاہتا ہے، متعلقہ ذمہ دار کو براہ راست اس کی اطلاع دے تو اسے وہ معلومات ان سے حاصل

ہوں، اوراس طرح حکام کی اس ذمہ داری پر زور دیا گیا ہے کہ وہ صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کے عوامی حق کو پورا کریں۔ اسی طرح، اس مجبوری کا ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری بھی حکام پر ہی عائد ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کسی معلومات کو ریاست کی بہتری اور عوامی مفاد میں روک کر رکھیں۔ اس طرح، یہ قرآنی آیت اس جدید اور ترقی پسندانہ رجحان کی تائید کرتی ہے جس کی رو سے معلومات حاصل کرنے کو عوام کا بنیادی حق مانا گیا ہے۔

مردوں اور عورتوں کی مساوی سماجی ذمہ داری

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور نماز کھڑی کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ و اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا، بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (۹:۷۱)

یہ آیت ایک لازمی سماجی وقانونی اصول کو بیان کرتی ہے کہ مرد وار عورتیں ایک دوسرے کے تئیں برابر کی ذمہ داری رکھتے ہیں، اور یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں وکاموں پر زور اور بری باتوں وکاموں سے روکنے)، عبادات کے ذریعہ اللہ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھنے نیز اس کی ہدایت پر چلنے، زکوٰۃ کے ذریعہ سماجی اتحاد واتفاق کو بنائے رکھنے اور مجموعی طور پر اللہ ورسولؐ کی تعلیمات پر چلنے کی ذمہ داری دونوں کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ دونوں اصناف کے لئے جمع مذکر اور جمع مؤنث کو الگ الگ ایک ہی طرح سے بیان کیا گیا ہے اور عورتوں کے حقوق اور ذمہ داریوں میں کسی بھی قسم کا ابہام نہیں ہے یہ کہ مردوں کے برابر ہیں اور مردوں سے جداگانہ ہیں۔ چنانچہ پالیسی سازی کے عمل اور عام مسائل سے متعلق اہم معاملات میں بھی عوام کی سماجی اور سیاسی ذمہ داریوں میں عورتیں مردوں کے ساتھ شریک ہیں۔ اور جب وہ کسی سماجی اور سیاسی منصب کی ذمہ داری انجام دینے کی اہل ہوں تو وہ اس میں حصہ لینے کی مجاز ہیں۔ اسلام کے فقہی ذخیرے میں الطبری اور ابن حزم کا یہ نتیجہ فکر موجود ہے کہ عورت جج بن سکتی ہے اگر وہ اس منصب کے تقاضے پورے کرتی ہو [دیکھیں ابن رشد کی بدایۃ المجتہد، جلد ۲، بن حزم کی المحلہ جلد ۱۰: جج کے منصب کے لئے لوازم، نیز دیکھیں الحکم جلد ۳: جمع مذکر کے ساتھ جمع مونث کا ذکر آنے پر بحث]۔ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے اللہ کے انصاف کی عظمت اور اس کی بالاتری کو بیان کیا ہے، اور نزول قرآن کے وقت عرب میں یا اور کہیں پر بھی انسانوں کی جو سماجی اور قانونی فکر تھی اس کی عکاسی نہیں کی ہے۔

عوامی رائے اور کاموں کی رہنمائی میں حکومت کی اخلاقی ذمہ داری

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع

عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ (۴۱:۲۲)

چوں کہ صالحیت (عمل کی درستگی یعنی راست روی) اور انصاف کی تبلیغ اور منکرات و ناانصافی کی مخالفت و مزاحمت اسلام اور اس کے پیروکاروں کے پیغام کا خلاصہ ہے اس لئے اپنے میں سے جن لوگوں کو وہ کسی بھی جگہ اختیار و اقتدار تفویض کرتے ہیں یہ کام ان کا ایک لازمی فریضہ بن جاتا ہے۔ ایسے افراد کو اللہ کے دین میں سکھائی گئی اخلاقی قدروں اور انصاف کے اصولوں کو اپنے زیر اقتدار علاقہ میں نافذ کرنے کے لئے اپنا اختیار استعمال کرنا چاہئے اور پوری دنیا میں اخلاقیات، انصاف اور امن کی تائید و حمایت کرنا چاہئے۔ یہ تبھی ہوگا جب راست بازی اور انصاف پر داخلی طور پر عمل کیا جائے گا اور عالمی سطح پر مسلمان خود اپنے اور ساری انسانیت کے لئے ایک تعمیری قوت بنیں گے [۳:۱۱۰]، اور اللہ کے رسول ان پر اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے گواہ بنیں گے جب کہ مسلمان خود اس معاملہ میں تمام انسانوں کے لئے گواہ بنیں گے [۲۲:۷۸]۔ یہ تمام اہل ایمان کی، مردوں و عورتوں کی، عالم گیر اخلاقی ذمہ داری ہے، لیکن اس کی انجام دہی اور اس میں تعاون وہ لوگ کریں گے جن کے پاس اقتدار کی طاقت ہوگی۔

پبلک پالیسی بنانے میں عوام کی شرکت (شوریٰ)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) اللہ کی مہربانی سے تمہاری اُفتادِ مزاج ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، تو اُن کو معاف کر دو اور اُن کے لئے (اللہ سے) مغفرت مانگو اور اپنے کاموں میں اُن سے مشورہ لیا کرو اور جب (کسی کام کا) عزمِ مصمم کر لو تو اللہ پر بھروسا رکھو؛ بے شک اللہ تعالیٰ بھروسا رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۳:۱۵۹)

وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں اور نماز کھڑی کرتے ہیں، اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (۴۲:۳۸)

یہاں ہم پالیسی سازی اور عام دل چسپی کے معاملوں کو طے کرنے میں عوام کی شرکت کا حکم دیکھتے ہیں، اور یہ کہ سماجی ضروریات کے لئے افراد کی مستعدی اسلامی معاشرے کی بنیادی خصوصیات ہیں، اور اس کے پہلو بہ پہلو اللہ کی پکار پر لبیک کہنا اور نماز قائم کرنا۔ ایسے معاشرے کے لئے ''شوریٰ'' (مشاورت) اپنے جامع تناظر اور لازمی نتائج کے ساتھ ایک لازمی عمل ہے اور اس کی شروعات خاندان میں کنبہ کی سطح سے شروع ہوتی ہے۔ شوہر و بیوی کو گھر کے معاملات آپسی رضامندی اور صلاح و مشورے سے چلانا چاہئیں [۲:۲۳۳]، اور گھر

کے چھوٹے افراد یعنی بچوں کو ان کے والدین اخلاقیات اور راست بازی کی تعلیم دیں[۳۱:۱۷]۔ اسی طرح، ضرورت مند افراد پر اور اجتماعی معاملات کے لئے خرچ کرنے کی ذمہ داری بھی گھر اور پڑوس سے ہی شروع ہوتی ہے[۲:۸۳، ۱۷۷، ۱۸۰، ۲۱۵؛ ۴:۸، ۳۶، ۱۳۵؛ ۶:۱۵۲؛ ۱۶:۹۰؛ ۱۷:۲۶، ۳۰ تا ۳۸]۔ صالحیت یا راست بازی اور انصاف جیسی اخلاقی قدریں سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے خاندان ایک ابتدائی معاشرہ ہوتا ہے، اور پھر خاندان سے ہی یہ قدریں پورے معاشرے میں پھیلتی ہیں[۲۵:۷۴]۔ جب تک لوگ از خود اور نچلی سطح پر آپس میں مشورہ کرنے اور اجتماعی فیصلہ لینے کے عادی نہیں بنیں گے، اس بنیادی تصور کو اعلیٰ سطح پر حکام کے ذریعہ بروئے کار لانے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

سماجی ومعاشی انصاف

ضرورت مندوں کو دینا اوران پر خرچ کرنا

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں ہے (کہ یہ کلامِ باری تعالیٰ ہے۔ اللہ سے) ڈرنے والوں کی رہنما ہے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (۲:۲ تا ۳)

اللہ کا تقویٰ رکھنے والا شخص محض اپنے حواس سے حاصل ہونے والی معلومات تک محدود رہنے سے گریز کرتا ہے، اور نتائج اخذ کرنے کی عقلی صلاحیت، قیاس اور بصیرت کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا (یا کرتی) ہے، جس کے وجود کو وہ اپنی ان انسانی قوتوں سے پہچانتا (یا پہچانتی) ہے۔ صرف اللہ کی عبادت کرنا اور اس کے لئے نماز پڑھنا تصوراتی اور عملی لحاظ سے اللہ سے جڑے ہونے کا اظہار ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ان لوگوں پر خرچ کرنے کو کہا گیا ہے جو ضرورت مند ہیں اور ان کاموں پر خرچ کرنے کے لئے جو سماج کے لئے ضروری ہیں۔ اس سے اسلام میں 'انفاق' (اللہ کی راہ میں خرچ) اور خیرات کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ کا تقویٰ رکھنے والا شخص اپنے مال واسباب میں سے محروم لوگوں کو دینے کا پابند ہے، اور یہ دینا (یعنی انفاق) مادی شکل میں بھی ہوسکتا ہے یعنی دولت کی شکل میں یا کھانے اور کپڑے کی شکل میں، یا جسمانی مدد، تعلیم و دیگر خدمات کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ اللہ کا تقویٰ خودغرضی اور انا پرستی کو کچلنے اور دوسروں کا خیال کرنے سے اور ان کے ساتھ ہمدردی و تعاون سے ثابت ہوتا ہے۔ اللہ کے تقویٰ کی یہ بنیادی باتیں اسلامی عقیدے میں سماجی کاموں کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں، اور اس بات کو سختی سے مسترد کرتی ہیں کہ تقدس صرف نماز اور روزے سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت اتنی ہی گہرائی، گیرائی اور جامعیت کے ساتھ ہونی چاہئے جتنا انسان کا دل اللہ کے تقویٰ سے معمور ہے، اور تمام معاملوں میں اللہ کی ہدایت کی پیروی سے ہی اس کا مطلب سمجھا جانا چاہئے۔ اللہ کو خود کو ظاہر کرنے اور اپنی عبادت کرانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اپنی مخلوق بنی نوع انساں کے فائدے کے لئے وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے رب کو پہچانے اور اس کی عبادت کرے، اچھے کاموں کو فروغ دے اور ضرورت مند افراد کی مدد کرے تاکہ سماج کا بھلا ہو۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو، بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔(۱۹۵:۲)

یہ ایک اور قرآنی آیت ہے جو ضرورت مند افراد کو دینے اور سماج کی فلاح و بہبود کے کاموں میں خرچ کرنے کے اصول پر زور دیتی ہے۔ یہ آیت لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ان کی ناکامی اور ناعاقبت اندیشی خود اپنے آپ کو ایک اجتماعی نقصان اور سماجی خودکشی میں مبتلا کرنے کا سبب بنے گی۔ دوسرے افراد اور مجموعی طور پر پورے سماج کے تئیں افراد کی اس ذمہ داری پر قرآن کی متعدد آیات میں زور دیا گیا ہے، اور رسول کریم ﷺ کی کئی احادیث میں مسلمانوں کی اجتماعی حرکت و عمل کو ایک جسم کے اعضاء کی حرکت و عمل سے تشبیہ دی گئی ہے [بہ روایت: مسلم، ابن حنبل]، اور ایک عمارت کے مختلف حصوں کے ایک دوسرے پر منحصر ہونے کی مثال بیان کی گئی ہے [بخاری، ابن حنبل اور ترمذی]۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن (کے مال) کی مثال اُس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں، اور اللہ جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے اور وہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں صرف کرتے ہیں پھر اُس کے بعد نہ اُس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں اُن کا صلہ اُن کے رب کے پاس (تیار) ہے اور (قیامت کے روز) نہ اُن کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جس صدقہ کے بعد (لینے والے کو قلبی یا ذہنی) اذیت پہنچے اُس سے تو بہتر ہے اچھا بول (بول دینا) اور مغفرت (طلب) کرنا۔ اور اللہ بے نیاز اور بُردبار ہے۔ مومنو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھانے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، کہ اُس (کے مال) کی مثال اُس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اُس پر زور کا مینہ برس کر اُسے صاف کر ڈالے؛ (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے؛ اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اور جو لوگ

مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ
بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ
لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ
نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ
ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ
مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ
مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا
فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ
يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ
يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَ
مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا
الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ
سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ
هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا

اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور خلوصِ نیت سے اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ (جب) اُس پر مینہ پڑے تو دُگنا پھل لائے اور اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی؛ اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور اس میں اُس کے لئے ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور اُسے بڑھاپا آ پکڑے اور اُس کی اولادیں ابھی کمزور ہوں کہ (اچانک) اُس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولہ چلے اور وہ جل (کر راکھ کا ڈھیر ہو) جائے! اس طرح اللہ تم سے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو (اور سمجھو)۔ مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں اُن میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور بُری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کر لو اُن کو کبھی نہ لو۔ اور جان رکھو کہ اللہ بے نیاز اور لائق حمد ہے۔ شیطان فقر (غریبی) کا خیال دلاتا ہے اور فحش بات کرنے کو کہتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ لامحدود ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۲:۲۶۱ تا ۲۶۸)

وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے، اور جس کو دانائی ملی بے شک اُس کو بڑی نعمت ملی؛ اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔ اور تم (اللہ کی راہ میں) جس طرح کا خرچ کرو یا کوئی نذر مانو اللہ اُس کو جانتا ہے؛ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر تم صدقہ ظاہر کر کے دو تو وہ بھی ٹھیک ہے اور اگر پوشیدہ رکھ کر دو اور دو بھی اہلِ حاجت کو تو وہ اور بھی بہتر ہے اور (اس طرح کا دینا) تمہارے گناہوں کو بھی دور کر دے گا؛ اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔ (اے محمد ﷺ!) تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے؛ اور (مومنو) تم جو مال خرچ کرو گے تو اُس کا فائدہ تمہیں کو ہے، اور تم تو جو خرچ کرو گے اللہ

مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۲ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۲۷۳ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۴

کی خوشنودی کے لئے ہی کرو گے، اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ (اور ہاں تم جو خرچ کرو گے تو) اُن حاجت مندوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں رُکے بیٹھے ہیں اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے (اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں) یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص اُن کو غنی خیال کرتا ہے (جب کہ) تم چہرے سے اُن کو پہچان سکتے ہو (کہ حاجت مند ہیں اور شرم کے سبب) لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگ سکتے؛ اور تم جو مال خرچ کرو گے کچھ شک نہیں کہ اللہ اُس کو جانتا ہے۔ جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کا صلہ اللہ کے پاس ہے اور اُن کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ غم۔

(۲۶۹:۲ تا ۲۷۴)

یہ آیات انفاق یعنی ضرورت مند افراد پر یا مجموعی طور پر پورے سماج کی ضرورتوں کے لئے خرچ کرنے کے اصولوں کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں، اور اس سے متعلق اہم تصورات اور اخلاقیات کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہ انفاق نہ صرف راست طور پر کھانے پینے کی ضروریات کے لئے ہونا چاہئے، بلکہ کام کرنے کی ضروری تربیت یا مناسب سرمایہ اور اوزار و آلات فراہم کرنے کے لئے بھی ہونا چاہئے تاکہ ضرورت مند کے لئے کاروبار اور آمدنی کے مواقع پیدا ہوں۔ انفاق کا یہ عمل خواہ کھانے پینے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہو یا اس سے بھی آگے بڑھ کر پیداواری صلاحیت پیدا کرنے اور اسے بڑھانے کے لئے ہو، پورے سماج تک پہنچتا ہے اور اس سے انسانی اور مادی وسائل فروغ پاتے ہیں؛ اس طرح اقتصادی مواقع بڑھتے ہیں اور اس طرح سے بڑھتے ہیں جیسے ''ایک دانہ جس سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں''۔ انفاق یعنی صدقہ اور خیرات کے فوائد بخش نتائج پورے سماج کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن اس کا اخلاقی جوہر بھی بہت لازمی ہے جس سے انسانی ترقی کی حفاظت ہوتی ہے جو سماجی اور معاشی ترقی کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ انفاق دکھاوے کا ایک عمل نہیں ہونا چاہئے جس سے دینے والے کی سخاوت اور فیاضی کا مظاہرہ ہو اور لینے والے کو شرمندگی کا کرب جھیلنا پڑے [۲۶۲:۲ تا ۲۶۶]، کیوں کہ ایک طرف غرور اور دوسری طرف بے عزتی کے احساس سے اس پورے عمل کے اخلاقی اثرات اور تسلسل کو نقصان پہنچتا ہے۔

قرآن کی اس مثال سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس طرح کے غلط برتاؤ سے وہ زمین خراب ہو جائے گی جس میں صدقہ و خیرات کے بیج ڈالے گئے ہوں اور اس وجہ سے وہاں پھل آنے کی امید نہیں کی جا سکتی، جب کہ ایک مناسب اخلاقی طرز عمل سے متوقع نتائج برآمد ہوں گے یا دوسرے پہلوؤں سے اور بھی زیادہ فوائد حاصل ہوں گے۔ البتہ اعلانیہ انفاق کرنے کو ممنوع نہیں کیا گیا ہے، خاص طور سے تب جب کہ یہ سماجی ضرورت کے لئے کیا جا رہا ہو [۲۷۱:۲]۔ لوگوں کے سامنے یعنی اعلانیہ خرچ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دوسروں کو ترغیب ملتی ہے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ عام حالات میں صدقہ اور خیرات کو ایک سماجی قدر

بن جانا چاہئے جو آنے والی پیڑھیوں میں منتقل ہوتی رہے، لیکن اگر اس کی اخلاقی جڑیں سوکھ جائیں یعنی اخلاقی بنیادوں کو نظر انداز کر دیا جائے جس سے زندگی بنی رہتی ہے، تو یہ تسلسل جاری نہیں رہے گا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کا فائدہ کمزور بزرگوں اور بچوں کو حاصل نہیں ہوگا۔ جب کوئی فرد اپنی کوئی چیز صدقہ کرے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ یہ چیز اور اس پر تصرف جائز طریقے سے اور ایمان داری کے ساتھ حاصل کیا گیا ہو [۲:۲۶۷ تا ۲۶۹]۔ کسی فرد یا سماج کو نقصان پہنچا کر دولت حاصل کرنا اور پھر اس دولت میں سے کچھ افراد کو دینا یا سماجی بہبود کے لئے خرچ کرنا ایک بے مطلب اور بے نتیجہ بات ہے۔ انفاق اور صدقہ حلال، جائز اور ایمان داری کی آمدنی سے ہونا لازمی ہے، اور ایک عقل مند آدمی کو ضرورت مند افراد یا سماج کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کے واسطے ناجائز طریقے سے کمانے کے اکساوے اور تاویل سے بچنا چاہئے۔ یہ شیطان ہے جو لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ انفاق اور خیرات سے خود ان کو نقصان پہنچے گا اور ان کا مال کم ہو جائے گا اور انہیں ایسے کام کرنے پر اکساتا ہے جو نامناسب ہوں اور بے شرمی کے ہوں۔ جو شخص عقل رکھتا ہو اور غور و فکر سے کام لے تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ کمانے اور خرچ کرنے کے عمل کو افراد اور سماج کی اخلاقی اور اقتصادی ترقی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ناجائز طریقے سے کمانے اور دکھاوے کے لئے خرچ کرنے میں انسان جو تدبیریں اختیار کرتا ہے اس سے وہ خود کو اور دوسرے انسانوں کو دھوکا دے سکتا ہے، لیکن اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتا [۲:۲۷۰]۔

اس آیت [۲:۲۷۲] کی رو سے ضرورت مند افراد کو دینے کا عمل صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان تمام لوگوں کی مدد کرنی چاہئے جو ضرورت مند ہوں۔ یہ آیت جس میں نبی ﷺ اور مدینہ کے مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے، غیر مسلم ضرورت مندوں کو صدقہ و خیرات کے دائرے سے باہر نہیں کرتی، کیوں کہ جس چیز کا لحاظ کرنا ہے وہ ''ضرورت'' ہے، نا کہ ''ایمان'' [دیکھیں اس آیت کے سلسلے میں الطبری، ابن کثیر، الرازی، القرطبی اور دیگر مفسرین کی تفاسیر، نیز وہ احادیث جو ان لوگوں نے نقل کی ہیں]۔ اسی طرح، ایک غیر مسلم کی انسانی ضرورت اس کے ضرورت مند ہونے کی وجہ سے کی جانی چاہئے اور اس کے بدلے میں اسے اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کرنا چاہئے [دیکھیں خاص طور سے الرازی کی تفسیر]۔ یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ امیر المومنین خلیفہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک ضرورت مند بزرگ یہودی کو زکوٰۃ کے اموال میں سے مستقل امداد جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہیرا میں مسلمانوں کے خزانہ عامرہ کو غیر مسلم ضرورت مندوں کے لئے استعمال کرنا منظور کیا تھا، جیسا کہ ابو یوسف نے اپنی ''کتاب الخراج'' میں ذکر کیا ہے۔ شریعت میں انسانی حقوق اور سماجی و اقتصادی انصاف کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں جو انہیں انسان اور بنی آدم ہونے کی بنا پر دئے جانے چاہئیں، قطع نظر اس کے کہ ان کی جنس کیا ہے، قوم یا نسل کیا ہے اور مذہب یا عقیدہ کیا ہے [۱۷:۷۰]۔

کسی فرد کے لئے زمین پر چلنے پھرنے اور روزگار حاصل کرنے سے معذوری، پابندی یا حد بندی کا مطلب یہ ہے کہ وہ ضرورت مند ہے۔ جن لوگوں کو ان کے دین و ایمان کی وجہ سے دنیا میں آزادانہ گھومنے پھرنے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے روک دیا جائے وہ ان لوگوں کی مثال ہیں جو انفاق کے مستحق بنتے ہیں، لیکن صرف وہ لوگ ہی اکیلے مستحق نہیں ہیں۔ وہ تمام لوگ جو جسمانی معذوری کی وجہ سے یا جبر و ستم کی وجہ سے روزگار کی تلاش میں زمین پر چل پھر نہیں سکتے وہ انسانی حقوق کے بنیادی عناصر اور انسانی وقار سے محروم ہیں جو کہ اللہ نے تمام بنی آدم کو بخشا ہے، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا: ''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی'' [۱۷:۷۰]۔ روزگار کے لئے کام کرنا ضروری ہے، اور کام کے وسیع مواقع حاصل

کرنے وانسان ہونے کے آفاقی کردار کو پورا کرنے کے لئے چلت پھرت اور آنے جانے کی آزادی ضروری ہے۔

انفاق اور زکوٰۃ وخیرات کو اس طرح سے منظم بھی کیا جاسکتا ہے کہ سال میں ایک یا اس سے زیادہ بار متعین وقت پر نکال دیا جائے، لیکن انفرادی اور سماجی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے یہ خرچ موقع بہ موقع بھی ہوسکتا ہے اور ''دن رات خرچ کرتے رہنا'' بھی ہوسکتا ہے؛ [۲:۲۷۴] اسے قانون بنا کر متعین بھی کیا جاسکتا ہے اور لوگوں کی صواب دید پر بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بنیادی حقوق اور ذمہ داریوں کو تو قانون کے ذریعہ طے کر دیا گیا ہے اور خاص طور سے زکوٰۃ فرض کر کے اس کی ادائیگی کا پابند کر دیا گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ انفاق اور صدقات کے لئے انفرادی طور پر ہمیشہ مواقع ملے ہوئے ہیں اور اس عمل میں لوگ اپنی وسعت کے مطابق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں [۳:۱۳۳ تا ۱۳۴، ۵۷:۲۱]۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

(مومنو!) جب تک تم اُن چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور جو چیز تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اُس کو جانتا ہے۔ (۳:۹۲)

دوسروں کو دینے یا ان پر خرچ کرنے سے متعلق یہ آیت اس عمل کی نفسیاتی اور قانونی بنیاد کو اجاگر کرتی ہے جو سماج کے لئے لازمی ہے۔ احسان اور ایثار کے لئے ایک مستقل ومتواتر اصلاح نفس یعنی خود اپنی تربیت ضروری ہے تاکہ آدمی دوسروں پر نہ صرف وہ چیز خرچ کرے جو اس کے پاس بچی رہ گئی ہو بلکہ وہ چیز بھی جو اسے مرغوب ومطلوب ہو [۲:۱۷۷] اگر دوسرے کو اس چیز کی زیادہ ضرورت ہو۔ کیوں کہ صرف وہی چیز دینا جو آدمی آسانی سے دے سکتا ہے یا جسے اپنے پاس سے نکال دینا ہی وہ چاہتا ہو اس سے احسان اور ایثار کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ اس اعلیٰ معیار پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد خود غرضی اور اپنے مال واسباب سے انتہائی محبت کو ترک کرنے کا عادی ہو جائے اور دوسروں پر وہ خرچ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے، ''اور جو حرصِ نفس سے بچ گئے تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں'' [۹:۵۹]

وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال انسانوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ و روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہوا تو (کچھ شک نہیں کہ) وہ بُرا ساتھی ہے۔ (۴:۳۸)

دولت کی نمائش اور انفاق وصدقہ پر اپنا احسان جتانا اور ضرورت مند کے جذبات کو مجروح کرنا اس بات پر پچھلی آیت [۲:۲۶۳] میں متنبہ کیا گیا تھا، کیوں کہ یہ برے افعال واحساسات صدقہ اور انفاق کے عمل کو متاثر کرتے ہیں اور اس کے تسلسل کو ختم کرتے ہیں اور اس سے افراد کی اخلاقیات اور سماجی ومعاشی انصاف کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو شخص صرف اپنی شبیہ بنانے میں لگا رہتا ہے اور اللہ کا سچا

تقویٰ نہیں رکھتا یا اپنی اس سماجی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا جس کی جواب دہی آخرت میں اسے اللہ کے سامنے کرنی ہوگی، اس نے گویا شیطان سے قربت کو چن لیا اور اس کی ترغیبات پر چلنے والا بن گیا۔ پہلے مذکور آیت میں قرآن ہر انسان کو متنبہ کرتا ہے کہ ''شیطان (کا کہا نہ ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے'' [۲:۲۶۸]، تو جو انسان شیطان کو اپنا دوست بنالے تو یہ کتنی بے عقلی اور بدنصیبی کی بات ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

(اے پیغمبر!) میرے مومن بندوں سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی (کام آئے گی) ہمارے دئے ہوئے مال میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے رہیں۔ (۱۴:۳۱)

انفاق کی عادت پیدا کرنے اور اسے ایک روایت بنا لینے، اور کھلے و چھپے خرچ کرنے کی یہ ایک اور قرآنی تاکید ہے۔ یہاں اسے نماز پر قائم رہنے کے حکم کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ جتایا گیا ہے کہ نماز اور انفاق دونوں ہی اللہ کی عبادت کی شکلیں ہیں، اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا اللہ کی عبادت سے الگ معاملہ نہیں ہے اور نماز و انفاق دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں [ملاحظہ کریں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا باہمی ربط متعدد قرآنی آیات میں جیسے: ۲:۴۳، ۸۳، ۱۱۰، ۱۷۷، ۲۷۷؛ ۴:۱۶۲؛ ۵:۱۲، ۵۵؛ ۹:۵، ۱۱، ۱۸، ۷۱؛ ۱۹:۳۱، ۵۵؛ ۲۱:۷۳؛ ۲۲:۴۱، ۷۸؛ ۲۴:۳۷، ۵۶؛ ۲۷:۳؛ ۳۱:۴؛ ۳۳:۳۳؛ ۵۸:۱۳؛ ۷۳:۲۰؛ ۹۸:۵]۔ ایک اور مقام پر غفلت اور بے توجہی کے ساتھ یا دکھاوے کے لئے نماز ادا کرنے کو یتیم کو جھڑکنے اور مسکین کو کھانا کھلانے میں کوئی دل چسپی نہ ہونے کی بات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے؛ اور اس طرح اللہ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ تعلق رکھنے میں انسان کی خرابی کو اس کے ایمان کی خرابی مانا گیا ہے [۱۰۷:۱ تا ۷]۔

وَ اللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور اللہ نے رزق (و دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں کو فضیلت دی ہے (ان میں سے اکثر) اپنا رزق اپنے غلاموں (خادموں) کو نہیں دیتے کہ وہ بھی اس میں (زندگی کی ضروریات پوری کرنے میں) برابر ہو جائیں۔ تو کیا (اس خود غرضانہ عمل سے) وہ اللہ کی نعمتِ کے منکر ہو رہے ہیں؟ (۱۶:۷۱)

اس آیت میں انفاق کے اصول کو بہت واضح اور دوٹوک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جن لوگوں پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا ہے اور رزق کے زیادہ اسباب و ذرائع فراہم کئے ہیں لیکن وہ اللہ کے اس فضل میں سے دوسرے ضرورت مندوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں وہ دراصل اپنے رب اور رازق کے ناشکرے ہیں۔ آیت میں اگرچہ اپنے مملوکوں کو دینے کا ذکر ہے لیکن یہ بات ان تمام لوگوں کے لئے ہے جو

اپنی ضرورتوں کے لئے دوسروں کی مدد اور سہارے کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو اللہ کا فضل ملا ہوا ہے انہیں اپنے رب کی شکر گزاری کے طور پر اپنے ملازمین کی تنخواہیں دینے میں سخاوت وفیاضی سے کام لینا چاہئے۔ جو لوگ مملوک یعنی انسان کے دست نگر ہوں، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ وہ ہمارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے ہمارے اختیار میں دے دیا ہے اور انہیں بھی وہی کھلانا چاہئے جو ہم کھاتے ہیں اور وہی پہنانا چاہئے جو ہم پہنتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے، اور کوئی زیادہ مشکل کام ہو تو اس میں اس کی مدد کرنا چاہئے [بخاری، مسلم، ابن حنبل، ترمذی]۔ جو لوگ عارضی طور سے یا مستقلاً کام کرنے سے معذور ہوں ان کی مدد پورے سماج کو کرنا چاہئے، اس عوامی خزانے سے ان کی مدد ہونا چاہئے جس کا بڑا حصہ ان لوگوں سے وصول ہوتا ہے جن کے پاس کافی وسائل ہیں، کیوں کہ پورے سماج کی فلاح و بہبود اس کے تمام افراد کی معاشی اور سماجی ضروریات کو پورا کرنے پر منحصر ہے۔ ایک اور آیت میں نجی ملکیت کے سماجی پہلو پر اور زیادہ واضح انداز میں زور دیا گیا ہے [۵۷:۷]۔ فرد سماج اور اس کی معیشت کی بنیاد ہے، لیکن ایک مناسب اور بہترین توازن فرد اور سماج کی بہبود کے درمیان بنائے جانے کی ضرورت ہے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا
لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾ وَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ
عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ
كَالصَّرِيْمِ ۙ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى
حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا وَ هُمْ
يَتَخَافَتُوْنَ ۙ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
مِّسْكِيْنٌ ۙ﴿۲۴﴾ وَّ غَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا
قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ
اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا
سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾
قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۲﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ
يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۳﴾ كَذٰلِكَ
الْعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

ہم نے ان لوگوں کی اسی طرح آزمائش کی ہے جس طرح باغ والوں کی آزمائش کی تھی جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے۔ اور کوئی استثنا نہیں رکھا (یعنی ان شاء اللہ نہ کہا)۔ سو وہ ابھی سو ہی رہے تھے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے (راتوں رات) اس پر ایک آفت پھر گئی۔ تو وہ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔ جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگے، کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔ تو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج وہاں کوئی فقیر داخل ہو کر تمہارے پاس نہ آئے۔ اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔ پر جب اسے (باغ) کو دیکھا تو (ویران پا کر) کہنے لگے کہ ہم (شاید) رستہ بھول گئے ہیں۔ (پھر بولے کہ) نہیں بلکہ ہم تو محروم ہو گئے۔ ان میں سے ایک میانہ رو بولا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم سبحان اللہ کیوں نہیں کہتے؟ (تب) وہ کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار! سبحان (پاک) ہے بے شک ہم ہی قصوروار ہوئے۔ پھر لگے ایک دوسرے کو ملامت کرنے۔ کہنے لگے کہ ہائے شامت ہم ہی حد سے نکل گئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارا پروردگار اس کے بدلے میں ہمیں اس سے بہتر باغ عنایت کردے ہم اپنے پروردگار کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ یہ ہے عذاب

(عذاب دنیا) اور آخرت کا عذاب تو اس سے بڑھ کر ہے کاش یہ سمجھیں۔(۶۸:۱۷ تا ۳۳)

ضرورت مند لوگوں کو دینے یا ان کو اپنے رزق اور وسائل میں شریک کرنے کی تعلیم ابتداء سے ہی اللہ کے متواتر پیغامات میں دی جاتی رہی ہے [۲:۸۳؛۶:۱۴]۔ اللہ تعالیٰ انسان کو صرف اپنی عبادت کی طرف بلاتا ہے، اور اگر اس کے پیغامات کو ٹھیک سے سمجھا جائے تو اللہ کی ہدایت انسان کو خود پسندی اور لالچ سے بچا لیتی ہے، اور انہیں دوسروں کے تئیں حساس بناتی ہے اور انسانی اجتماعیت کی طرف لے جاتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں باغ کے مالکوں نے اپنی خدا فراموشی کے سبب ضرورت مندوں کی مدد سے خود کو باز رکھنے کا ارادہ کیا تھا: ''۔۔۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ ڈالیں گے، اور ان شاء اللہ نہ کہا''؛ ''آج کسی فقیر کو آنے مت دینا''۔ ان کی لالچ نے انہیں خدا فراموشی میں مبتلا کر دیا اور ضرورت مندوں کو اپنی فصل میں سے حصہ دینے سے باز رہنے پر اکسایا، وہ اس بات کو بھول گئے کہ اللہ کی مشیت و قدرت ان کے منصوبوں اور ان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ صرف غریب اور ضرورت مند ہی اپنا حصہ لینے سے محروم نہیں رہ گئے بلکہ خود باغ کے مالکوں کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا، جب انھوں نے دیکھا کہ ''باغ تو ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی''، اور یہ کہ ان کی تو قسمت ماری گئی۔ اس واقعہ کا درس عبرت پوری طرح واضح ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے نوازا ہے وہ اس میں سے ان لوگوں پر خرچ کریں جو محروم ہیں۔ اس میں امیروں اور غریبوں کا امتحان ہے، اور اللہ کی ہدایت سب کے لئے انصاف کا سامان رکھتی ہے۔

ہر ایک کو اپنا روزگار خود کمانے کے لئے محنت و مشقت کرنا چاہئے، اور جو لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے کسی بھی موقع سے محروم ہیں چاہے وقتی طور سے یا مستقلاً ان کی مدد وہ لوگ کریں جنہیں اللہ کا فضل حاصل ہے۔ فرد کی کمائی میں پورے سماج کی حصہ داری اور تعاون ہوتا ہے، اور ضرورت مند کو دینے سے قوت خرید میں اضافہ ہوتا ہے اور معیشت کو ترقی ملتی ہے۔ یہ باہمی منافع کا ایک دائرہ اور گردش ہے جو انسانوں کے باہمی تعاون اور خیر سگالی سے مکمل ہوتا ہے، جب کہ خود غرضی اور لالچ سے اخلاق اور ایمان تباہ ہوتا ہے اور سماج میں تصادم و تضاد پیدا ہوتا ہے اور زوال آتا ہے، اور اس کے نتیجے میں اس دنیا میں انسانوں کی زندگی اجیرن بنتی ہے اور آخرت میں باعث عذاب ہوگی۔ البتہ خود کی اصلاح ہمیشہ ممکن ہے اور جب تک انسان دنیا میں زندہ ہے اسے توبہ کرنے اور اپنے عمل کو درست کرنے کا موقع ملا ہوا ہے۔ ''امید ہے کہ ہمارا پروردگار اس کے بدلے میں ہمیں اس سے بہتر باغ عنایت کرے، (سواب) ہم اپنے پروردگار کی طرف راغب ہوتے ہیں''۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۲۵﴾ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۶﴾ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۚ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغْنٰى عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۚ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۙ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا

اور جس کا نامہ (اعمال) اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا اے کاش مجھ کو میرا (اعمال) نامہ نہ دیا جاتا۔ اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ اے کاش موت (ابدال آباد کے لئے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی۔ (آج) میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔ (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی۔ (حکم ہوگا کہ) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔ پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دو۔ پھر ستر گز لمبی

فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾

زنجیر سے جکڑ دو۔ یہ نہ تو اللہ جل شانہ پر ایمان لاتا تھا، اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔ سو آج اس کا بھی یہاں کوئی قریبی دوست نہیں۔ اور نہ پیپ کے سوا (اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔ (۶۹:۲۵ تا ۳۷)

مندرجہ بالا آیات بہت واضح طریقے سے ان دولت مندوں کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں جو ضرورت مندوں پر خرچ نہیں کرتے اور ان کو اپنے مال میں سے حصہ نہیں دیتے۔ ان کے ہاتھ مال بھی ہوتا ہے اور اختیار بھی، اور جو کچھ بھی ان کو ملا ہوا ہے اس کی جواب دہی ان کو آخرت میں کرنی ہے۔ ان کے غلط سلوک اور راہ حق سے انحراف کو جتانے کے لئے ان کی پوری زندگی کے اعمال کا سارا ریکارڈ ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور اس ریکارڈ کی صحت و درستگی کو دیکھ کر وہ دنگ رہ جائیں گے۔ وہ اپنے اعمال نامے کا انکار نہیں کر سکیں گے اور کوئی حجت پیش نہیں کر سکیں گے، بلکہ وہ یہ آرزو کریں گے کہ کاش ان کی موت کے ساتھ ان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ ان کی ہولناک اذیتیں ان کے کفر کا نتیجہ ہوں گی، یعنی اللہ اور اس کی ہدایت کا انکار، اور ضرورت مندوں کی مدد اور بھوکوں کو کھلانے سے ان کے گریز کا خمیازہ ہوں گی۔ اپنی ان بداعمالیوں کے صلہ میں ان بدکاروں کو آخرت میں کوئی مدد اور سہارا نہیں ملے گا، اور ان کا کھانا صرف جھاڑ جھنکار اور کوڑا کرکٹ ہوگا، ایسا کھانا ''جسے گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا''۔ ضرورت مندوں کو دینے اور ان پر خرچ سے گریز کے موجودہ اور آئندہ نتائج کتنے بھیانک ہیں، اور اس بدعملی کی وجہ سے اس دنیا میں انفرادی اور سماجی لحاظ سے ملنے والی اذیت کتنی سنگین ہے اور آخرت میں کس قدر سخت ہوگی!! قرآن مختلف طریقوں سے اس بات پر زور دیتا ہے کہ دوسروں کا خیال رکھنا، ان کی مدد کرنا اور مل جل کر رہنا اللہ کا خاص پیغام ہے اور انسانوں کی جواب دہی کا مرکزی عنوان ہے۔

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝

اور باوجود یہ کہ ان کو خود طعام کی خواہش (اور حاجت) ہے وہ فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو خالص اللہ کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے بدلے کے خواہش مند ہیں نہ شکرگزاری کے (طلبگار)۔ (۷۶:۸ تا ۹)

اس آیت میں ضرورت مندوں اور یتیموں کے ساتھ ''قیدیوں'' کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ یہ بھی مدد کے مستحق لوگوں میں شامل ہیں۔ قیدیوں کا یہ حوالہ بہت اہم ہے خاص طور سے تب جب ہم ذہن میں اس بات کو رکھیں کہ ابھی حال حال تک یہ ضرورت مند نظر انداز ہوتے رہے ہیں۔ آیت میں ''کھانے'' کا ذکر دراصل قیدیوں کی تمام انسانی ضرورتوں اور حقوق کے لئے ایک مثال کے طور پر ہے، یہ قیدی چاہے اپنے ملک کی جیلوں میں ہوں یا جنگ میں گرفتار ہو کر دوسرے ملک کی قید میں چلے گئے ہوں۔ ماضی میں یہ حکم ان جنگی قیدیوں پر عائد ہوتا تھا جنہیں غلام بنالیا گیا ہو، اور جو کوئی ان میں کسی کا تحویل دار (ذمہ دار) ہو اس کا یہ فرض تھا کہ وہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے، اور اس سے اس کی استعداد سے زیادہ کام نہ لے، اور اگر کبھی ایسی صورت پیش آئے تو اس کام میں اس کی مدد کرے،

جیسا کہ رسول اللہ نے تعلیم دی ہے [بحوالہ بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ]۔ ایک اور آیت یہ بتاتی ہے کہ جب کوئی دشمن مسلمانوں سے پناہ کا طلب گار ہو تو اسے یہ پناہ دی جائے گی [۹:۶]، اور ہر پناہ گزیں کی ایک مسافر کی طرح حفاظت و مدد کی جائے گی۔ [۹:۶۰] دریں اثنا، ایسے شخص کو اپنے وطن واپس جانے کا حق ہوگا جب بھی وہ جانا چاہے [۹:۶]۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے، اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو، اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔ (۸۹:۱۷ تا ۲۰)

یہ آیات نزول قرآن کے وقت مکہ کے معاشرے کی، یا وہاں کے کچھ دولت مندوں کی، ایک بدصورت تصویر پیش کرتی ہیں۔ یتیم اور محروم جیسے کمزور لوگوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا، اور مال و دولت کا لالچ چاہے وہ کسی بھی طرح سے حاصل کی گئی ہو، سب پر سوار تھا۔ اللہ کا پیغام کمزوروں کی حمایت اور ہر ایک کے لئے انصاف کو یقینی بنانے کے لئے آیا اور اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ایک اللہ کی عبادت اور زندگی کے تمام شعبوں میں انصاف کا قیام اور دوسروں کی مدد کا معاملہ ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ دوسروں کے مال پر قبضہ کر کے یا ان کا حق غصب کر کے مال حاصل نہیں کیا جا سکتا، اور مال کو فضول کاموں میں نہیں اڑایا جانا چاہئے اور ضرورت مند افراد کو یا سماج کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ خود محمد ﷺ جنہیں اللہ نے اپنا نبی بنایا، ایک یتیم تھے اور کوئی دولت مند آدمی نہیں تھے [۹۳:۶ تا ۸]۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا، اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی (کی) گردن کا چھڑانا۔ یا بھوک کے دن کھانا کھلانا یتیم رشتہ دار کو یا فقیر خاکسار کو۔ پھر ان لوگوں میں (شامل) ہونا جو ایمان لاتے ہیں اور صبر کی نصیحت کرتے ہیں اور (لوگوں پر) رحمت و شفقت کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔ یہی لوگ صاحبِ سعادت ہیں۔ اور جو ہماری آیات کا کفر کرنے والے ہیں وہ بدبخت لوگ ہیں۔ یہ لوگ آگ میں بند کر دیئے جائیں گے۔ (۹۰:۱۱ تا ۲۰)

اوپر کی آیت میں خودغرضی اور لالچ سے بچنے کی کوشش کو ایک ایک گھاٹی سے گزرنے کے مترادف بتایا گیا ہے۔ اس گھاٹی سے وہی گزر سکتا ہے جو دولت بٹورنے اور جمع کرنے کی حرص سے چھٹکارہ پا سکے اور اپنا مال قیدیوں کو چھڑانے، بھوکوں کو کھلانے اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں لگائے چاہے یہ ضرورت مند اس کے رشتے دار ہوں یا غیر۔ جو دوسروں کے مددگار، حمایتی اور ہمدرد بنتے ہیں وہ صحیح

راستے پر چلتے ہیں وہ راستہ جو دنیا اور سماج کو انصاف اور امن کی راہ پر لے جاتا ہے اور جس پر چلنے کا انعام آخرت میں ملے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی انانیت میں پڑے رہیں اور مادی مسرتوں میں مگن رہیں اور غلط راستے کا انتخاب کریں وہ آخر کار اپنی لالچ کے گھیرے میں آجائیں گے اور اس دنیا میں اپنی تباہ کن خواہشات کے قیدی بن جائیں گے اور آخرت میں آگ کا عذاب جھیلیں گے جو انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

تو جو یتیم ہے تم اس پر ستم نہ کرنا۔ اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔ (۹۳:۹ تا ۱۱)

رسول کریم محمد ﷺ خود بھی ایک یتیم تھے: ''بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟'' اور دولت مند بھی نہیں تھے: اور ''تنگدست پایا تو غنی کر دیا'' [۹۳:۶، ۸]۔ ایسی ہی ایک سورۃ جس میں محمد ﷺ کے بچپن کی کیفیت بیان کی گئی ہے، محمد ﷺ اور ان کے تمام متبعین کو اس بات سے منع کرتی ہے کہ یتیم کے ساتھ زیادتی کی جائے، یا کسی سائل کو، جو مادی، اخلاقی یا اور کسی قسم کی مدد کا طلب گار ہو، جھڑک دیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی ضرورت مند کی مدد نہیں کر سکتا، تو اسے انتہائی نرمی کے ساتھ معذرت کرنی چاہئے کیوں کہ کسی مدد کے طلب گار شخص کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے سے اس شخص پر بھی اس کے برے اثرات پڑتے ہیں اور جس سے مدد مانگی جا رہی ہے اور وہ بے حسی اور خود پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے اس پر بھی، نیز پورے سماج پر اس کے غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حتیٰ یہ کہ جب کوئی آدمی کسی کی مدد کرے تو اسے اپنے اس اچھے کام کو اس شخص کی توہین کر کے ضائع نہیں کرنا چاہئے جس کی اس نے مدد کی ہے [۲:۲۶۲ تا ۲۶۴]، کیوں ہر فرد کا اکرام اور وقار تمام انسانوں کا اکرام اور وقار ہے اور اس کی حفاظت ضروری ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے دئے ہوئے رزق میں سے کسی ضرورت مند کو کچھ دیتا ہے تو وہ گویا اللہ کے فضل و مہربانی پر شکر گزاری کا اظہار کرتا ہے، چاہے یہ فضل اسے مادی شکل میں حاصل ہو، عقلی یا اخلاقی حیثیت سے ہو اور اس فضل سے وہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہو۔ سماجی انصاف اور خیر سگالی اسلام کے پیغام کا ایک مستقل اور فوری ہدف ہے۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے، جب وہ اپنے آپ کو غنی دیکھتا ہے۔ (۹۶:۶ تا ۷)

ایک اللہ پر ایمان سے انفرادی اور سماجی توازن قائم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین انسانوں کے فائدے کے لئے بھیجا ہے اور اس توازن کو قائم کرنے میں وہ انسانوں کی رہنمائی اور مدد کرتا ہے۔ خود غرضی اور غرور نہ صرف غیر اخلاقی بات ہے بلکہ اس سے نفسیاتی اور سماجی مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ لوگوں کو اپنے درمیان مساوات اور برابری کا احساس کرنا چاہئے اور ایک اچھی انفرادی و سماجی زندگی جینے کے لئے اپنے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور تعاون کو فروغ دینا چاہئے۔ خود کو ہی سب کچھ سمجھ لینے کا غرور انفرادی اور سماجی توازن کو تباہ کر دیتا ہے، اور ایک اللہ پر ایمان اور جواب دہی کا یقین اس توازن کو قائم رکھتا ہے اور لوگوں کو برتری و کم تری کے احساسات سے بچاتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۸﴾

کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان ناشناس (اور ناشکرا) ہے، اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے؛ وہ تو مال سے شدید محبت کرتا ہے۔
(۱۰۰:۶ تا ۸)

قرآن انسان کی قوتوں کو بیان کرتا ہے [۱۷:۷۰؛ ۹۵:۴؛ ۹۶:۵]، اور اس کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے [۴:۲۸؛ ۱۴:۳۴؛ ۱۶:۴؛ ۱۷:۱۱، ۱۰۰؛ ۱۸:۵۴؛ ۲۱:۳۷؛ ۲۲:۶۶؛ ۳۳:۷۲؛ ۳۶:۷۷؛ ۴۳:۱۵؛ ۷۰:۱۹؛ ۸۰:۱۷]۔ کچھ لوگ اللہ کی مدد کی ضرورت تب محسوس کرتے ہیں جب وہ کسی مشکل میں پھنس جاتے ہیں، لیکن جب وہ مشکل سے نکل جاتے ہیں تو اسے بھول جاتے ہیں، جب کہ کچھ دوسرے لوگ ایسے ہیں جنہیں اگر مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اور زیادہ مایوس اور اللہ سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں [۱۰:۱۲؛ ۱۱:۹ تا ۱۱؛ ۱۷:۱۱، ۶۷ تا ۶۹، ۸۳؛ ۳۹:۸، ۴۹؛ ۴۱:۹ تا ۴۹؛ ۴۲:۵۱؛ ۴۸:۴؛ ۸۹:۱۵]۔ درج بالا آیات میں اپنے رب کے ناشکر گزار ہونے، اور بعض اوقات دوسرے انسانوں کے ناشکر گزار ہونے کی انسانی کمزوری کا حوالہ دیا گیا ہے، اور دولت و حشمت رکھنے کی انسان کی حرص کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اسلام ایک جامع اصلاح کے ذریعہ سماجی و اقتصادی انصاف قائم کرنا چاہتا ہے۔ جامع اصلاح یعنی انسان کے دل و دماغ کی اصلاح اور سماجی و اقتصادی ڈھانچے اور تعلقات کی اصلاح۔ اللہ پر ایمان اور اللہ کے سامنے انسانوں کی جواب دہی کا یقین نفسیاتی اور سماجی توازن کے لئے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے کیوں کہ اس سے گھمنڈ اور خود پسندی ختم ہو جاتی ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۧ﴿۹﴾

ہر طعن آمیز اشارے کرنے والے چغل خور کے لئے تباہی ہے؛ جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے، (اور) خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہوگا۔ ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا؛ اور تم کیا سمجھتے ہو کہ حطمہ کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں پر جا لپٹے گی، (اور) وہ اس میں بند کر دیئے جائیں گے، (یعنی آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔ (۱۰۴:۱ تا ۹)

یہ وہ آیات ہیں جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی دماغ اور دل کو دولت جمع کرنے کی حرص سے بچایا جائے۔ دولت جمع کرنے کی حرص ایک اخلاقی بیماری ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ عیش کی زندگی جینے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ فریب کن خیال بھی اس حرص کو بڑھاتا ہے کہ دولت سے دائمی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ آدمی اس میں سے کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتا، دوسرے ضرورت مندوں پر خرچ نہیں کرتا، ان کی مدد نہیں کرتا اور انہیں اس میں شریک نہیں کرتا کیوں کہ اسے لگتا ہے کہ کچھ بھی خرچ کرنے سے اس کی دولت گھٹے گی اور اس نے اس دنیا میں مستقل سلامت و محفوظ رہنے کا جو تصور کر رکھا ہے اس کی رو سے اس کے استحکام میں کمی آئے گی۔ اس طرح آدمی اس دنیا میں خود اپنی خوشیوں کو محدود کر لیتا ہے کیوں کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور اپنی دولت کے حصار میں گرفتار رہتا ہے اور دوسروں کے تعلق سے اس کی صرف یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کے قصور تلاش کرتا رہے اور ان میں کمیاں نکالتا رہے تا کہ وہ خود کو مطمئن رکھے کہ بس

وہی صحیح راستے پر چل رہا ہے اور جو کچھ اسے ملا ہوا ہے یہ اس کا حق ہے۔ ایسا آدمی حقیقت میں غریب ہوتا ہے اور اس دنیا میں نامرادی کی زندگی جیتا ہے کیوں کہ اس کی دولت اسے کبھی آسودہ نہیں ہونے دیتی، اور اسے اس کی لالچ اور مادی ہوس کے دائرے میں بند کر دیتی ہے۔ آخرت میں یہ دولت اسے اس کے غلط افکار اور غلط اعمال کے نتائج کی سزا بھگتنے سے نہیں بچا سکے گی، اور اللہ کا عذاب اسے گھیر لے گا، جس طرح دنیا میں اس کی دولت اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰي طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔ تو ایسے نمازیوں کے لئے خرابی ہے؛ جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں، اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے۔ (۱۰۷:۱ تا ۷)

ان آیات میں یتیم کو دھتکارنے اور ضرورت مند کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینے کو اللہ پر اور اس کے انصاف پر ایمان کے خلاف بتایا گیا ہے۔ ایسا آدمی اگر ایمان کا دعویٰ بھی کرے اور نماز بھی پڑھے تو اصل میں اس کا یہ عمل لوگوں کو دکھانے کے لئے ہے۔ اگر وہ ان لوگوں کی مدد نہیں کرتا جو مدد کے ضرورت مند ہیں تو حقیقت میں نماز اور اللہ کی عبادت سے وہ بہت دور ہے کہ نماز کی روح تو یہ ہے کہ اللہ کے لئے پڑھی جائے۔ یہ آیات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ سماجی و اقتصادی انصاف اللہ کے پیغام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اللہ کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان زبان اور عقل سے اللہ کا اقرار کر لے؛ انسانوں کے لئے اللہ کا پیغام خود انسانوں کے فائدے کے لئے ہے اور اس پیغام پر ایمان انسانوں کے باہمی تعلقات میں نظر آنا چاہئے۔ جن لوگوں کو اللہ کا فضل ملا ہوا ہے اور جو اس سے محروم ہیں ان کے درمیان تعلق میں نظر آنا چاہئے کہ اللہ دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے جانچتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق اور ایک دوسرے کے تئیں ذمہ داریوں کی انجام دہی کس طرح کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٧٥ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گی جیسے کسی کو جن نے لپیٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ تجارت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اُس کا اور (قیامت میں) اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں

اَثِیْمٍ ﴿۲۷۶﴾ کرتا ہے۔(۲:۲۷۵تا۲۷۶)

ربوٰ یعنی سود ممنوع ہے کیوں کہ یہ مال رکھنے والوں کے ذریعہ مال نہ رکھنے والوں کے استحصال کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ ایک یقینی اور لگا تار بڑھتا ہوا نفع ہے جو بغیر کسی محنت اور خطرے کے دوصول کرنے والے کو ملتا رہتا ہے، جب کہ سود دینے والا مجبور ہوتا ہے کہ اصل رقم پر یہ اضافی منافع شروع سے ہی لگا تار اور وقت پر دیتا رہے چاہے حالات جو کچھ بھی ہوں، کیوں کہ وہ قرض لینے کے ضرورت کے تحت مجبور ہوتا ہے۔ اسلام منافع کمانے کے خلاف نہیں ہے اگر وہ جائز طریقے سے کسی کاروبار میں حاصل کیا جائے اس شرط کے ساتھ کہ اگر مال دینے والا اور مال لینے والا دونوں ہی متوقع نفع میں بھی شریک ہوں اور کسی خسارے کی صورت میں بھی دونوں ہی اس خسارے میں حصہ دار بنیں۔ اس طرح جو لوگ کسی معاملہ میں شریک ہوں دونوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کے درمیان برابر کا توازن رکھا گیا ہے۔

استحصال یعنی سود کے حمایتی لوگ دلیل دیتے ہیں کہ نفع کمانا اور سود حاصل کرنا دونوں ایک ہی باتیں ہیں، اس لئے سود کو بھی جائز ہونا چاہئے۔ یہ خود غرضانہ اور لالچی رویہ اسلام کے سماجی و اقتصادی انصاف کے خلاف ہے۔ اسلام لین دین کے منصفانہ اور متوازن اصول پر نفع کمانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس میں سبھی فریق بغیر کسی ظاہری یا اخلاقی دباؤ کے اپنی رضامندی سے نفع اور نقصان میں شریک ہونے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ نفع اور نقصان میں شرکت کے اصول پر مختلف اور متعدد طریقوں سے معاملے طے کئے جاسکتے ہیں۔

انصاف سے آگے بڑھ کر انفرادی طور پر سخاوت و فیاضی کا معاملہ کرنا اسلام میں اور بھی زیادہ پسندیدہ ہے اور اس پر بہت اجر کا وعدہ ہے۔ ضرورت مند افراد کو دینا اور سماج کی اجتماعی ضرورتوں میں خرچ کرنا عوامی سلامتی کے لئے مادی اور اخلاقی لحاظ سے مفید ہوتا ہے۔ اس سے مجموعی طور پر سماج کی مادی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور اس سماجی خیر سگالی اور تعاون سے لینے والوں کو بھی اور دینے والوں کو بھی نیز پورے سماج کو مادی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ صدقات کو کئی گنا اور کئی طرح سے بڑھاتا چلا جاتا ہے، جب کہ استحصال اور سود کی کمائی لالچ اور حسد و جلن کی وجہ سے سکڑ کر رہ جاتی ہے کیوں کہ اس سے پیداواری عمل رک جاتا ہے، اور سماج اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا

مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سُود باقی رہ گیا ہے اُس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لئے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔ اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو (اُسے) وسعت (کے حاصل ہونے تک) مہلت (دو) اور اگر (زرِقرض) بخش ہی دو تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اور اُس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان

كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ نہ ہوگا۔ (۲:۲۷۸تا۲۸۱)

سودی لین دین میں ایک انسان دوسرے انسان کا استحصال کرتا ہے، اور بغیر کسی محنت اور خطرے کے نفع حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سودی لین دین پر پابندی اصل میں اس عام اصول کو عمل میں لانا ہے جس کے تحت غلط طریقے سے دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا اور کسی کا بھی کسی بھی طرح سے استحصال کرنا ممنوع ہے [۲۹:۴]۔ البتہ ناجائز طریقے سے کمائی کرنے کی اس ممانعت کی وضاحت تاریخی اور فقہی نظیروں کے عین مطابق کرنا چاہئے، اور اسے اتنا عام نہیں کرنا چاہئے کہ آج کے زمانے میں بینکوں یا دوسرے مالیاتی اداروں میں جو ٹرانزیکشن ہوتا ہے اسے بھی اس میں شامل کرلیا جائے۔ آج کے زمانے میں بینکوں کے لین دین میں جس چیز کو ''انٹریسٹ'' کہا جاتا ہے اسے سود یا ربوٰی کی طرح سمجھنا یا انہیں ایک دوسرے کا مترادف قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔ [نوٹ: یہاں فاضل مصنف نے اپنا ذاتی خیال پیش کیا ہے۔ مترجم یہاں یہ وضاحتی نوٹ لکھنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ یہ خیال اگرچہ بعض جدید مفکرین کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں ہوئے مباحث اور غور وفکر میں پورے عالم اسلام کے جمہور علماء دین اور ماہرین اسلام معاشیات نے نیز فقہی اداروں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بنکوں اور مالیاتی اداروں کا ''انٹرسٹ'' اپنی فطرت کے لحاظ سے سود (Usury) ہی ہے۔ ''انٹرسٹ'' اپنی فطرت اور کاروباری مفادات کے لحاظ سے اسی طرح استحصال کا باعث ہے جس طرح مہاجن کا سود ہوتا ہے اور اس کی مار معاشرے کے ضرورت مند اور غریب لوگوں کے عام استحصال اور خودکشی جیسے اقدامات کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی لئے دنیا بھر میں اسلامی معاشیات کے ماہرین ''انٹرسٹ فری بنکنگ'' کو رواج دینے کی کوششوں میں لگے رہے ہیں اور انٹرسٹ فری بنکنگ کو اسلامی بنکنگ کے نام سے اب بینک اور معاشیات سے متعلق اداروں میں ایک متبادل نظام کے طور پر قبول بھی کیا جارہا ہے]۔

مساوی مواقع

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾

کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے۔ (۳:۲۶تا۲۷)

ہر ۲۴ گھنٹوں میں رات دھیرے دھیرے اور آہستگی سے دن کو اپنی گرفت میں لیتی جاتی ہے اور اسی طرح دن رات کو دھیرے دھیرے اور آہستگی سے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور یہ سلسہ آگے پیچھے مستقل چلتا رہتا ہے، البتہ الگ الگ موسموں میں ان کی لمبائی گھٹتی

اور بڑھتی رہتی ہے اور یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون قدرت کے تحت ہوتا ہے [۳۶:۴۰]۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے کوئی جان دار بے جان ہو جاتا ہے اور زرخیز غذائی مادوں سے جو کہ اپنے آپ میں کوئی زندہ مخلوق نہیں ہیں جان دار پیدا ہوتا ہے، مثلاً زمین سے پیڑ پودوں کا پیدا ہونا ، اور حیوانوں و انسانوں میں غذائی اشیاء کا مادہ تولید میں بدلنا؛ اور یہ سب کچھ متعین قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ سماجی اور سیاسی اختیارات کی جانشینی (منتقلی) اور رزق و معاشی قوت کا حصول بھی، طبیعاتی اور حیاتیاتی قوانین کی طرح، ان متعین سماجی قوانین کا پابند ہے جو ہم نے دریافت کئے ہیں اور جن سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بخششیں بے حد و حساب ہیں لیکن کائنات میں موجود اللہ کی بخششوں کو ٹھیک سے سمجھنا اور جاننا اور ان سے فائدہ اٹھانا انسانوں کی اپنی ذمہ داری ہے اور ان بخششوں کو نیز ان کے فوائد کی تمام انسانوں کے درمیان انصاف کے ساتھ تقسیم بھی ہونا چاہئے۔ یہ انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سماجی تبدیلیوں کے ضابطوں دیکھیں اور سمجھیں اور سماجی و اقتصادی انصاف اور ترقی کے لئے ان ضابطوں کو پوری دانش مندی کے ساتھ استعمال کریں۔

نجی ملکیت عوامی مفاد کے خلاف استعمال نہیں ہوسکتی

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

اور بے عقلوں کو اُن کا مال جسے اللہ نے تم لوگوں کے لئے سبب معیشت بنایا ہے مت دو (ہاں) اس میں سے اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور اُن سے معقول باتیں کہتے رہو۔ (۵:۴)

یہاں اہم بات یہ ہے کہ مخاطبوں کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی ''تم لوگ'' اور یہ خطاب اس معنی میں ہوا ہے کہ تمھارے پاس بے عقل لوگوں (جو اپنے معاملات کو ٹھیک سے نہیں چلا سکتے اور مال کو استعمال میں لانے کے بجائے اسے ضائع کر سکتے ہیں) کا مال ہے جو سبب معیشت ہے۔ یہاں تم لوگ سے مراد پورا سماج ہے جسے اللہ نے اپنے پیدا کردہ وسائل پر تصرف کا اختیار دیا ہے [دیکھیں ۲۴:۳۳؛ ۸:۵۷]۔ سماج کی نمائندگی وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اس مال کا تحویل دار بنایا گیا ہو۔ انہیں، یعنی بالواسطہ طور سے پورے سماج کو، یہ خبردار کیا جا رہا ہے کہ بے عقل لوگوں کی جو ملکیت اور اموال ہیں انہیں ان کے حوالے نہ کرو جب تک وہ صحیح الدماغ نہ ہو جائیں۔ اس بندوبست کا مقصد اموال کو ضائع ہونے سے بچانا ہے اور دیانت دار اہل لوگوں کے ذریعہ اس میں اضافہ کو یقینی بنانا ہے اور اس طرح یہ حکم ان لوگوں کے مفاد میں ہے جو مال کے مالک تو ہیں لیکن دماغی طور سے اسے سنبھالنے اور بڑھانے کے اہل نہیں ہیں، یہ بات سماج کے اجتماعی مفاد میں بھی ہے کیوں کہ کسی ایک فرد کے مال کی بربادی نتیجہ کے اعتبار سے پورے سماج کے مال کی بربادی ہے۔ اگر مخاطبین وہ لوگ ہیں جن کے پاس مال کا انتظام کرنے کا اختیار ہے، تب یہ اموال ان سے متعلق ہیں اور ان کا رول اموال کے قانونی مالک معذور لوگوں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ سماج کے اجتماعی مفاد کی جزوی نمائندگی کرنا بھی ہے۔ اس صورت میں اپنے زیر انتظام اموال سے متعلق ان کی ذمہ داری پر یہاں زور دیا گیا ہے۔

اس طرح یہ آیت نجی اموال اور ملکیت کے معاملہ میں سماجی مفاد کو اجاگر کرتی ہے، کیوں کہ کوئی بھی انفرادی غفلت یا مال کو سنبھال کر رکھنے کی لیاقت کی کمی کا برا اثر سماج کے اجتماعی مفادات پر پڑے گا۔ جب کہ شریعت نجی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتی ہے، اس کی حفاظت کرتی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، لیکن یہ انفرادی حقوق کو مطلقاً چھوٹ نہیں دیتی کہ کوئی فرد اپنے مفادات اور اپنے اموال کو خود ہی نقصان پہنچائے۔ چنانچہ شریعت ایسے معاملوں میں مداخلت کرتی ہے تاکہ دونوں طرف ایک توازن بنا رہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ انفرادی حقوق کو عارضی یا استثنائی طور سے روکا جا سکتا ہے۔ شریعت نہ تو مطلقاً انفرادیت پسندی کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے اور نہ مطلقاً اجتماعیت پسندی کی طرف؛ یہ بنیادی طور سے انفرادی حقوق اور توازن کو سماجی مفادات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ محفوظ کرتی ہے۔ تمام انسانی حقوق اور فرائض کی، انفرادی ہوں کہ سماجی، نشان دہی اگرچہ قرآن وسنت میں کر دی گئی ہے لیکن ان کی تفصیلات وضع کرنا اور انہیں واضح طریقے سے متعین اور منطبق کرنا اپنے اپنے وقت اور حالات کے لحاظ سے ہر زمانے کے اہل ایمان کا کام ہے، اور یہ کام قرآن وسنت اور قرن اول سے متواتر چلے آرہے طریقوں سے یکسر مختلف نہیں ہوسکتا نہ کسی فرد واحد کے حکم پر ہوگا، بلکہ قرآن وسنت میں دئے گئے ضابطوں کے عین مطابق اجتماعی غور وفکر اور فیصلوں سے، بالخصوص شوریٰ کے ذریعہ ہوگا، جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴿۳۵﴾

مومنو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) اللہ کے رستے سے روکتے ہیں؛ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے اُن کو اس دن کے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا پھر اُس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا سو (اب) مزہ چکھو اس کا جو تم جمع کرتے تھے۔ (۹:۳۴ تا ۳۵)

قرآن دوسروں کے مال پر ناحق قبضہ کرنے کو منع کرتا ہے [۲۹:۴] چاہے یہ قبضہ کرنے والا کوئی بھی ہو اور اس کا مقصد کچھ بھی ہو۔ اوپر کی آیت میں قرآن خاص طور سے 'احبار' اور 'رہبان' (بنی اسرائیل کے علماء اور مشائخ) کا ذکر کرتا ہے جو دوسروں کا مال غصب کرنے میں ملوث ہوتے تھے اور سونا و چاندی جمع کر کے رکھتے تھے لیکن اپنے مذہبی منصبوں کے تقدس میں چھپے رہتے تھے، یا یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ مال وہ عبادت گاہوں کی ضرورتوں کے لئے جمع کرتے ہیں۔ مذاہب اور عبادت گاہیں اور جو لوگ ان سے متعلق ہوتے ہیں ان کی حرمت و حفاظت کا شریعت نے حکم دیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہب اور مذہبیت کے اس طرح غلط استعمال پر اخلاقی اور قانونی بندش نہیں لگائی جائے گی۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے نکالا گیا مال ضروری ہے کہ جائز طریقے سے ہی کمایا گیا ہو [۲:۲۶۷]، اور سونا و چاندی جمع کرنا جو مال کی گردش کو منجمد کرتا ہے اور معیشت وسماج کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اسے محفوظ اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ آیت نہ صرف علماء اور مشائخ کے اخلاق کو شخصی لالچ یا منصبی مرتبہ کے غلط استعمال سے بچاتی ہے بلکہ سماجی انصاف کا ایک عام اصول طے

کرتی ہے کہ دولت کو جمع کر کے رکھنا اور کچھ ہاتھوں میں ہی اس کا گردش کرتے رہنا معیوب ہے۔ جو لوگ مذہبی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر اس طرح کے کام کرتے ہیں جو ان کے اخلاقی مرتبے کے بھی خلاف ہے اور سماجی و معاشی انصاف کے بھی خلاف ہے، انہیں ایک شدید عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ یہ بات ان تمام دیگر لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو دوسروں کے اموال غصب کرتے ہیں، یا مال جمع کر کے رکھتے ہیں۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

(تو) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو، جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (مال) خرچ کرتے رہے ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔ (۵۷:۷)

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات میں اور خاص طور سے اس زمین پر بے شمار وسائل پیدا کئے ہیں جو انسانوں اور دیگر تمام مخلوقات کے لئے کافی ہیں، اوپر کی آیت کا یہی مطلب ہے اور یہ بات دوسری کئی آیات میں بھی کہی گئی ہے جیسے ''اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اُس کا رزق اللہ کے ذمے ہے وہ جہاں رہتا ہے اُسے بھی جانتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے اُسے بھی، یہ سب کچھ کتابِ روشن میں (لکھا ہوا) ہے [۱۱:۶، نیز ۲۹:۶۰؛ ۵۱:۲۲]۔ انسانوں کو اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے ترقی دینے کی ذمہ داری دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان قدرتی وسائل کو فروغ دینے اور انہیں منصفانہ طریقے سے تقسیم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے [۱۱:۶۱؛ نیز دیکھیں ۱۶:۱۴؛ ۱۷:۱۲، ۶۶؛ ۲۸:۷۳؛ ۳۰:۴۶؛ ۳۵:۱۲؛ ۴۵:۱۲؛ ۶۷:۱۵]۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی معیشت و قانون میں انفرادی ملکیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، لیکن سماجی پہلو کا لحاظ رکھنا بھی لازمی ہے، چوں کہ ہر فرد جو کچھ بھی مال کماتا ہے تو مال کمانے کے اس عمل میں دوسرے افراد اور کل سماج کا تعامل و تعاون شامل ہوتا ہے۔ قرآن مال کے مالکوں کو یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ مال کے تحویل دار یا متولی (ٹرسٹی) ہیں، مال کا مالک تو اللہ ہے اور اسی نے تمھیں اس میں سے کچھ پر اختیار دیا ہے۔ تمام وسائل اللہ نے اپنی مخلوقات کے لئے پیدا کئے ہیں اور لوگوں کو اس بات میں آزمایا جاتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ان وسائل کو کتنا اور کس طرح فروغ دیتے اور تقسیم کرتے ہیں [۱۱:۶۱؛ ۶۲:۱۰؛ ۶۷:۱۵]۔ ہر فرد کو اپنی ضرورت سے زائد مال دوسرے ضرورت مندوں یا سماج کی اجتماعی ضرورتوں پر خرچ کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس طرح اسلام سماجی و معاشی انصاف قائم کرتا ہے اور انسانی سماج میں آپسی خیر سگالی کو فروغ دیتا ہے۔ یہ فرد اور اس کی سرگرمیوں کو انسانی اور مادی ترقی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ

جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو بستی والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجت مندوں کے اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ گھومتا رہے، سو جو چیز تم کو پیغمبر

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ﴿۷﴾ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۬ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۹﴾ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۧ﴿۱۰﴾

دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو؛ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (اور) ان مفلس مہاجروں کے لئے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیئے گئے ہیں (اور) اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار اور اللہ اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں، یہی لوگ سچے (ایمان والے) ہیں۔ اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے وہ محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور) خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو؛ اور جو حرصِ نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔ (۵۹:۷ تا ۱۰)

اسلام جس طرح سماجی و اقتصادی انصاف کے لئے مال کمانے اور خرچ کرنے کے اصول طے کرتا ہے اسی طرح یہ مال غنیمت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور بتاتا ہے کہ اس کی تقسیم کس طرح کرنا ہے۔ جنگ میں ہاتھ لگنے والے مال غنیمت کو فوجیوں (لڑنے والوں) کی ذاتی کمائی تسلیم نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو متواتر ہونے والی لڑائیوں میں حاصل ہونے والا مال غنیمت بار بار ان لوگوں کو ہی ملتا رہتا، اس طرح لڑنے والے (فوجی یا جنگجو) لوگ مراعات یافتہ اور دولت مند طبقہ بن جاتے، جب کہ وہ اصل میں اللہ کی خاطر لڑتے ہیں اور پورے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لہذا، مسلمان مجاہدین کو دشمنوں سے پہلی سنگین لڑائی میں جب مال غنیمت ہاتھ لگا تو قرآن نے بتا دیا کہ یہ مال غنیمت ریاست کے خزانہ میں شامل کیا جائے گا اور افراد یا قبیلوں کی ملکیت نہیں بنے گا اور یہ اللہ کے قانون اور رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی کے ماتحت ہوگا [۸:۹۱]۔ اوپر کی آیت پورے سماج کے حق کو بیان کرتی ہے کہ ''جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو بستی والوں سے دلوایا ہے'' وہ سب سے پہلے اللہ کا ہے، اور اسلام کی قانونی اصطلاح میں پورے سماج کے حق کو اللہ کا حق باور کیا جاتا ہے یہ جتانے کے لئے کہ اس کی حیثیت وقف کی ہے اور اس کی ملکیت منتقل نہیں ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی حیات میں مسلمانوں کے امیر المومنین کی حیثیت میں تھے، اور آپ کے بعد جائز اسلامی حکومت کا یہ حق تھا کہ مال غنیمت کو مجاہدین کے گھر والوں، یتیموں، ضرورت مندوں اور

مسافروں کو تقسیم کرے تا کہ مال صرد دولت مندوں میں ہی گردش نہ کرتا رہے۔
قرآن نے بار بار اور اہمیت کے ساتھ ان لوگوں کی مادی اور اخلاقی مدد کرنے پر زور دیا ہے جو اپنے وطن کے علاوہ کسی اور جگہ جا کر رہتے ہیں، یعنی مسافر۔ اس طرح ہر مقام پر ہر انسان کے مساوی حقوق اور یکسانیت پر زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ درج بالا آیات بہت وضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ پورا معاشرہ اور اس کے تمام ضرورت مند افراد اس مال غنیمت میں حق دار ہیں، جب تک بھی وہ واقعتا اس کے ضرورت مند ہیں۔ نزول قرآن کے وقت یہ بات ان لوگوں کے لئے تھی جو مکہ میں اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال دئے گئے تھے اور جنھوں نے مدینہ میں انھیں پناہ دی تھی یعنی انصار مدینہ۔ ایسے عوامی حقوق اور سماجی فوائد پورے سماج اور اس کے تمام اجزاء کو اور آنے والی نسلوں کو پہنچتے ہیں چاہے یہ اموال غنیمت کسی خاص وقت پر کسی خاص گروہ نے ہی حاصل کئے ہوں، اس طرح یہ اموال غنیمت ان تمام لوگوں تک پہنچتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں۔ یہ آیات ''عوامی حقوق'' کا تصور دیتی ہیں اور اسی طرح ''عوامی خزانے، ملکیت اور دولت'' کا تصور دیتی ہیں، اور یہ تصور اسلامی ریاست کے بالکل ابتدائی مرحلے میں ہی انتہائی واضح انداز میں ملتا ہے، اور یہ اصول سماجی و اقتصادی انصاف کے لئے لازمی ہے۔

مساوی مواقع کے لئے ان لوگوں کی خصوصی مدد ضروری ہے جو اپنے حالات کی کچھ ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے محرومی کی حالت میں ہوں، بصورت دیگر ان لوگوں کو بعد میں ملنے والے مساوی مواقع سے وہ فائدہ کبھی حاصل نہیں ہوگا جو ان لوگوں کو مل چکا ہوگا جو پہلے سے اچھی حالت میں رہے ہیں۔ یہ اصول جسے ہمارے زمانہ میں اب ''افرمیٹیو ایکشن'' (مثبت کارروائی) کا اصول کہا جاتا ہے پیغمبر اسلام محمد ﷺ نے اس وقت اپنایا جب آپ نے ہجرت کے تیسرے سال بنونضیر سے ہوئی جنگ میں حاصل مال غنیمت مہاجرین میں تقسیم کیا جنہیں مکہ میں اپنے گھر بار اور جائدادیں چھوڑ کر آنا پڑا تھا، اور انصار مدینہ کو باوجود ان کے ایثار اور نصرت اسلام کے اس مال غنیمت سے کچھ نہیں دیا تھا، کیوں کہ وہ لوگ اپنے گھروں میں اور اپنی جائدادوں کے ساتھ تھے۔ اس تقسیم میں آپ ﷺ نے مدینہ کے دو غریب مسلمانوں کو ان کی غربت کی وجہ سے ضرور شامل کیا تھا۔ [دیکھیں ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، بیروت: ۱۹۸۷، جلد ۴، ص۔ ۷۷]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹

مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ؛ ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔ (۲۹:۴)

ان آیات میں مخاطبین کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کر کے اموال کو 'تمھارے اپنے اموال' کہا گیا ہے اور اس طرح مجموعی معاشی مفادات کو بتانے کے لئے پورے سماج کے مفادات کا حوالہ ہے، اگر چہ ہر فرد کا مال خود اس کی اپنی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ پورے سماج کا اجتماعی مفاد اس بات سے خطرے میں پڑتا ہے اگر کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے مال پر دھوکہ و فریب کے ذریعہ یا کسی اور طرح سے ناجائز قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ سماجی و اقتصادی انصاف کے لئے دولت کمانے کے بھی اصول ضروری ہیں صرف خرچ کرنے کے نہیں۔ ضرورت مندوں پر یا سماج کی ضرورتوں کے لئے خرچ کرنا اسی مال سے جائز ہے جو جائز طریقے سے کمایا گیا ہو [دیکھیں پہلے مذکور آیت

۲:۲۶۷ اور اس کی تشریح]۔ ناجائز کمائی یا دوسروں کے مال کو غلط طریقے سے ہڑپ لینے کا مطلب ہر اس طریقے سے ہے جو کسی بھی مقام پر اور کسی بھی زمانے میں نامناسب طریقے سے اور بے ایمانی سے حاصل کیا گیا ہو؛ یہ اخلاقی اور اقتصادی لحاظ سے تباہ کن ہوتا ہے۔ کسی بھی جائز کمائی کی بنیاد متعلقہ فریقوں کی آپسی رضامندی پر ہے، جو کہ جائز اصولوں کے تحت ہو، جس میں دونوں کو ہی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ دھوکہ دھڑی، استحصال یا اور کسی طریقے سے مال غصب کرنا، جس میں محنت کشوں کے ساتھ ناانصافی بھی شامل ہے، کچھ افراد کے لئے بھی نقصان دہ ہوگی اور پورے سماج کے لئے بھی اور نتیجے کے طور پر سماج کی معیشت کے لئے بھی، کیوں کہ معیشت تب تک مستقل طور سے اور افزودگی کے ساتھ مستحکم نہیں رہ سکتی جب تک تمام معاملات میں معقولیت و درستگی نہ ہو اور اس کی اخلاقی نگرانی نہ ہو۔

زکوٰۃ: سماجی بہبود کے لئے ایک واجب ادائیگی

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰

صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنانِ صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیفِ قلب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہئیے یہ حقوق) اللہ کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔(۹:۶۰)

صدقات اور رفاہ عامہ کے لئے خرچ کرنے سے سماجی و اقتصادی انصاف کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ سماجی انصاف کے لئے ایک سہارا بنتے ہیں، لیکن انصاف کی بنیاد صرف یہی نہیں ہے۔ شریعت نے کمانے اور خرچ کرنے کی رہنمائی دینے کے لئے قانونی اصول دئے ہیں، جیسے یہ کہ دھوکہ دھڑی، فریب کاری اور استحصال و ظلم کے ذریعہ سے مال کمانے کی ممانعت، اور عیش و عشرت میں مال کو ضائع کرنا یا ضرورت سے زائد خرچ کرنے کی ممانعت جو کہ سماج اور افراد کے لئے، نیز معیشت و اخلاقیات کے لئے نقصان کا موجب ہوتے ہیں[اسراف و تبذیر کی ممانعت کے لئے دیکھیں ۱۱:۱۱۶؛ ۱۷:۱۶؛ ۲۱:۱۳؛ ۲۳:۳۳، ۶۴؛ ۳۴:۳۴؛ ۴۳:۲۳؛ ۵۶:۴۵، ۶:۱۴۱؛ ۷:۳۱؛ ۱۷:۲۶ تا ۲۷؛ ۲۵:۶۷؛ نقصان دہ اعمال کے لئے دیکھیں ۴:۲۹، ۵:۹۰ تا ۹۱، ۶:۱۵۱، ۷:۳۲، ۸۰، ۱۶:۹۰،؛ ۱۷:۳۱ تا ۳۸]۔ جس طرح انفرادی اور سماجی فوائد کے لئے کمانے اور خرچ کے عمل کو صحیح سمت دکھانا اسلام میں سماجی و اقتصادی انصاف کی بنیاد ہے، اسی طرح صدقات اور خیرات کی تاکید انصاف کے عمل کو مکمل کرنے اور سہارا دینے کا وسیلہ ہے۔ یہ فرق کو کم کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اور کمیوں و غلطیوں کی اصلاح کا ایک نظام ہے۔

اس کے علاوہ، اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے افراد کو انفاق پر ابھارا جائے اور باہمی مسابقت کی ترغیب دی جائے۔ یہ چیز سماجی ترقی کے لئے فرد اور سماج دونوں کے لئے بہت فوائد رکھتی ہے۔ یہ لازمی زکوٰۃ اور نفلی صدقات و انفاق ہی ہیں جو مال کو پاک کرتے ہیں اور فرد کا تزکیہ کرتے اور اخلاق کو ترقی دیتے ہیں۔ اوپر کی آیت میں ان طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ان سماجی انفاق کو حاصل کرنے کے مجاز اور مستحق ہیں۔ جو لوگ اپنا روزگار کمانے سے مستقل طور سے معذور ہیں جیسے معمر لوگ اور بیمار یا اپاہج لوگ، نیز وہ لوگ جو اپنا روزگار کمانے سے

عارضی طور سے قاصر ہوں جیسے بچے اور بیمار لوگ یا وہ لوگ جو انفرادی طور پر یا ایک اجتماعی معاشی بحران سے دوچار ہوں، ان لوگوں میں سرفہرست ہیں جنہیں ان صدقات وخیرات کا یعنی سماجی مدد کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

قرآن عارضی ضرورت مندوں اور مستقل ضرورت مندوں میں فرق کرتا ہے۔ فقراء (یعنی مستقل غریب) اور مساکین (یعنی ضرورت مند)، مقروض (غارمین) اور مسافر (ابن السبیل)، تاہم ہر ایک کو لوگوں کی مدد کا مستحق بتایا گیا ہے۔ یہ فرق اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسلام لوگوں کے لئے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ مستقل طور سے سماجی مدد پر گزارہ کریں۔ اگر کچھ وقت کے بعد وہ خود کوئی کام کرنے کے لائق ہو جائیں گے اور موجودہ مشکل دور ہو جائے گی، ایسے لوگوں کو اسلام تاکید کرتا ہے کہ وہ تعمیری کاموں کے ذریعہ اپنا روزگار خود کمانا شروع کریں جتنی جلدی وہ کر سکتے ہیں۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ اسلام نے زمانہ قدیم سے چلی آرہی غلامی کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے متعدد اقدامات کئے کیوں کہ انسانوں کو غلام بنا کر رکھنا اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے اور یہ اسلام سے پہلے کی ایک روایت ہے جو اس وقت بھی قائم تھی۔ اسلام نے غلاموں کی حیثیت کو اوپر اٹھانے اور ان کی حالت کو بدلنے کے لئے مختلف تعمیری طریقے اپنائے۔ انہی میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے بھی سماجی امداد اور عوامی خزانوں سے مدد مقرر کی گئی۔

ان مستحقین کے علاوہ سماجی مدد کا مجاز ان طبقوں اور افراد کو بھی بنایا گیا جو معاشی دباؤ میں ہوں اور ان کی ذمہ داریاں ان کی استطاعت سے زیادہ ہوں، اور ان کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یا معاش وروزگار شروع کرنے میں ان کی مدد کے لئے سماجی امداد ضروری ہو، یا کسی کی بازآبادکاری کرنی ہو یا روزگار کی تربیت فراہم کرنی ہو۔ کسی ایسے شخص کی سماجی مدد بھی بہت اہم ہے جس نے اپنا وطن چھوڑ دیا ہو اور معاشی یا سیاسی مشکلات کی وجہ سے وطن واپس آنا اس کے لئے دشوار ہو۔ اس سے یہ بات اجاگر ہوتی ہے کہ اسلام ساری دنیا کو ایک سمجھتا ہے اور اس کے کسی بھی خطہ میں رہنے اور بسنے کو ہر انسان کا حق سمجھتا ہے، کیوں کہ وہ سارے انسانوں کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح کے سماجی امداد کے فنڈ کو ایک آزاد انتظامی ادارے کے تحت رکھنا بالکل فطری بات ہے، اور اسی لئے اس ادارے کے کارکنوں کی تنخواہ اور اس کے دیگر اخراجات بھی اسی فنڈ سے دینے کا اصول دیا گیا ہے۔ کوئی دیگر ایسی ضرورت جو بعد میں سامنے آئے لیکن ان مدوں میں اس کا احاطہ نہ کیا گیا ہو اسے ''فی سبیل اللہ'' اللہ کے راستے میں دی جانے والی مدد کے تحت لایا جا سکتا ہے کہ یہ مدان تمام خرچوں پر محیط ہے جو سماجی واقتصادی انصاف کے لئے مختلف حالات میں سماج کی ترقی کے لئے درپیش ہوں۔ مادی ترقی اور امور عامہ پر جیسے راستوں وسڑکوں، پلوں، ریلوے، عمارتوں، ڈیم وغیرہ کی تعمیر اور سینچائی وغیرہ کے کام زکوٰۃ وصدقات کے علاوہ دیگر ٹیکسوں سے کئے جانے چاہئیں کیوں کہ زکوٰۃ وصدقات فوری اور عارضی انسانی ضرورتوں کے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی امداد کے تمام سرکاری اقدامات رضا کارانہ انفاق کا موقع دیتے ہیں جن میں انفرادی طور سے یا مل جل کر اجتماعی طریقے سے تعاون کیا جا سکتا ہے، یا کچھ ایسے لازمی تقاضے سامنے آجائیں جو حکام کی طرف سے کسی عوامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کئے جائیں تو ان میں بھی تعاون کرنا مال داروں کے لئے ضروری ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ

اُن کے مال میں سے زکوٰۃ لے لو کہ اس سے تم اُن کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو؛ اور اُن کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا اُن کے لئے موجبِ تسکین ہے، اور اللہ سننے

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ والا جاننے والا ہے۔(۹:۱۰۳)

زکوٰۃ جو کہ سماجی و اقتصادی انصاف کے اسلامی اصولوں کی تکمیل کرتی ہے اس کی جمع و تقسیم حکام کی ذمہ داریوں میں شامل ہے جنہیں عوام اپنے درمیان سے ہی منتخب کر کے اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا مجاز بناتے ہیں ''اولی الامر منکم'' [۴:۵۹]۔ حکام اور عوام کے درمیان باہمی تعلق سماج کے عمومی مفاد کے لئے لازمی ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے حق میں رسول کریم ﷺ کی دعائیں ان کے لئے موجب تسکین تھیں وہیں اسلامی حکام کی ذمہ داری، جو سیاسی قیادت میں رسول اللہ کی نیابت یا خلافت کرتے ہیں، عوام میں، جن میں زکوٰۃ ادا کرنے والے بھی شامل ہیں، مختلف طریقوں سے روحانی و اخلاقی قدروں کو فروغ دینا ہے جیسے تعلیم بالغان کا نظم کر کے، پبلک میڈیا پروگراموں کے ذریعہ، عبادت گاہوں میں، مذہبی تعلیمات اور خطبوں و تقریروں کا انتظام کر کے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سماجی فلاح و بہبود اور خیر سگالی کے لئے رضا کارانہ تعاون، انفرادی پیش کشوں اور مسابقتی کوششوں کا موقع ہمیشہ حاصل رہنا چاہئے۔ اسلام کا سماجی انصاف کلیت پسندانہ یا حاکمانہ نہیں ہے کیوں کہ یہ اوپر سے تھوپا نہیں جاتا ہے بلکہ تمام لوگوں کے تعاون اور جذبے سے فروغ پاتا ہے اور قائم ہوتا ہے، اور انفاق، صدقات و خیرات کے رضا کارانہ کاموں سے جاری رہتا ہے اور معاشرے کے اندر گہری جڑیں رکھنے والی روایت بن جاتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے، مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے (محروم) کا۔(۷۰:۲۴ تا ۲۵)

یہاں قرآن ضرورت مند لوگوں کے حق کی بات کر رہا ہے کہ وہ اس حق کو وصول کریں اور جو لوگ ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی حالت میں ہیں ان کی یہ ذمہ داری بتاتا ہے کہ وہ اس فریضے کو انجام دیں۔ امداد دینا کوئی اختیاری معاملہ نہیں ہے بلکہ آدمی جو کچھ کماتا ہے اس میں ہمیشہ ایک سماجی پہلو اور سماجی تعاون کا عنصر شامل ہوتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ مال خرچ کرنے میں سماجی ضرورت یا سماجی بہبود کا بھی خیال رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ایمان اور عقیدے سے اور اللہ کے پیغام کے قانونی و اخلاقی اصولوں پر ان کے عمل سے سماجی و اقتصادی انصاف قائم کرتا ہے۔ کسی کی ضرورت کا علم خواہ اس کے ذریعہ مدد کی درخواست سے ہو یا کسی ذریعہ سے تحقیق اور کھوج بین کے ذریعہ کسی کے ضرورت مند ہونے کا پتہ چلے، اس کی مدد کرنا لازم ہے ان لوگوں پر جو مدد کرنے کے اہل ہیں، چاہے یہ رضا کارانہ ہو یا قانونی طریقے سے ہو۔ البتہ قانونی لوازم کے علاوہ انفرادی طور پر رضا کارانہ مدد کے جذبے اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے مسابقت کی ترغیب سے اسے عمل میں لانا چاہئے۔ زکوٰۃ تو قانونی طور سے لازم ذمہ داری ہے، جب کہ اس لازمی انفاق کے علاوہ اپنی صواب دید سے رضا کارانہ طور پر اپنے مال، اپنی صلاحیت، علم، توانائی اور دیگر وسائل کو دوسرے ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے کی تاکید قرآن میں بار بار کی گئی ہے اور اس پر بے حساب اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔

عیش وعشرت میں مبتلا ہونا اور فضول خرچی کرنا

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

تو جو اُمتیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں اُن میں ایسے ہوش مند کیوں نہ ہوئے جو ملک میں خرابی کرنے سے روکتے سوائے تھوڑے لوگوں کے جن کو ہم نے اُن سے بچالیا تھا، اور جو ظالم تھے وہ انہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش و آرام تھا اور وہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور تمہارا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو جب کہ وہاں کے باشندے نیکوکار ہوں از راہِ ظلم تباہ کردے۔ (۱۱:۱۱۶ تا ۱۱۷)

سماجی انصاف اور ترقی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے نیک وصالح لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ جب کہیں کوئی غلط بات دیکھیں تو اس کے خلاف آواز اٹھائیں، اور منکرات و برائیوں سے روکنے اور معروف و نیک کام کرنے کی تلقین کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں [۳:۱۰۴ تا ۱۱۰]۔ ایسا سماج اور ایسی تہذیب ختم ہوجاتی ہے اور ترقی تو کجا اپنی بقاء کے لازمی عناصر کو بھی کھو بیٹھتی ہے جس کے افراد سماج کے تئیں اپنی سماجی ذمہ داری کا احساس نہ کریں۔ کسی سماج میں برائی کے خوگر لوگوں کا ہونا ایک فطری بات ہے، لیکن اگر برائیوں کی مخالفت کرنے والے لوگ موجود ہوں تو پورا سماج ایک دوسرے کی اصلاح کا کام کرتا رہتا ہے اور اس کی بدولت بدکار اور برائی کے خوگر لوگوں کی وجہ سے سماج تباہ نہیں ہوتا۔ برائی کے خوگر لوگ بھی انسان ہوتے ہیں اور انہیں معاشرے سے باہر نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان کی برائی سے سماج کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کی مزاحمت اور ان کی روک تھام جہاں تک ممکن ہو کرنا ضروری ہے۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾

اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (فواحش پر) مامور کردیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے، پھر اُس پر (عذاب کا) حکم ثابت ہوگیا اور ہم نے اُسے ہلاک کرڈالا۔ (۱۷:۱۶)

عیش وعشرت میں پڑنے اور دنیاوی لذتوں کا عادی بن جانے سے افراد کا اخلاق و کردار خراب ہوتا ہے، اور پھر مجموعی طور پر پورا سماج بربادی کی راہ پر چل پڑتا ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے دولت مندوں اور دولت سے محروم لوگوں کے درمیان نفسیاتی فرق گہرا ہوجاتا ہے اور سماجی فاصلہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس سے محروموں اور غریبوں کے دل میں دولت مندوں اور امیروں کے لئے بغض پیدا ہوتا ہے جب کہ دولت مندوں میں غرور اور غریبوں کے تعلق سے بے حسی بڑھتی جاتی ہے اور ان کی تکالیف سے وہ بے نیاز اور بے حس بنے رہتے ہیں، اور ان کا غرور و گھمنڈ غریبوں کو اوپر اٹھانے کے لئے سماجی تبدیلی کے عمل کی مخالفت پر انہیں آمادہ کرتا ہے اور وہ جوں کی توں حالت کو بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ بری طرح دنیاوی لذتوں اور عیش ومستی میں مگن ہوجاتے ہیں ان کے اندر سے سماجی اصلاح کے لئے کام کرنے کی عقلی اور عملی تحریک نکل جاتی ہے۔ چنانچہ وہ گھمنڈی، نفس پرست، ردعمل کے عادی، موجودہ صورت حال کو بنائے رکھنے کے لئے

کٹر اور بہتری کے لئے ہونے والی تبدیلیوں کے سخت مخالف بن جاتے ہیں۔ حد سے بڑھی ہوئی عیاشیوں میں مبتلا لوگ لذت کام و دہن اور عیش و مستی میں اپنی دولت خرچ کرتے ہیں اور اس طرح وہ مادی اور انسانی وسائل کی پیداواری ترقی اور ان کی مناسب تقسیم کی ذمہ داری سے منحرف ہوجاتے ہیں۔ قرآن ان لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور متنبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ذہنیت اور سلوک کو بدلیں جو کہ ان کے لئے بھی انفرادی طور سے نقصان دہ ہے اور آخر کار پورے سماج کے لئے تباہ کن ہے۔ ایسے لوگ اپنی دولت کی وجہ سے فطری طور سے سماجی اور سیاسی اثر و رسوخ کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا صحیح راستے سے انحراف کرنا مادی اور اخلاقی لحاظ سے بہت ہی نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیش و عشرت میں مبتلا ہونے اور فضول کاموں میں دولت خرچ سے قرآن میں بار بار منع کیا گیا ہے [نیز دیکھیں ۱۱:۱۶؛ ۲۱:۱۳؛ ۲۳:۳۳، ۶۴؛ ۳۴:۳۴؛ ۴۳:۲۳؛ ۵۶:۴۵]۔ یہ رویہ ایک خاص مدت کے بعد فرد، سماج اور تہذیب کے لئے تباہ کن بن جاتا ہے، جیسا کہ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔ ایسے سنگین نتائج سے بچنے کے لئے اس تباہ کن روش کے خلاف قرآن بے جا، ضرورت سے زائد اور نامعقول طریقے سے دولت خرچ کے جذبے کی ابتداء میں ہی حوصلہ شکنی کرتا ہے، اور جائز کاموں کے لئے بھی اعتدال سے خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے [۶:۱۴۱، ۷:۳۱؛ ۱۷:۲۶ تا ۲۷، ۲۵:۶۷]۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝۱۲ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۳ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۱۴

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگر تھیں ہلاک کر ڈالا اور ان کے بعد اور لوگ پیدا کر دیئے۔ جب انہوں نے ہمارے (مقدمہ) عذاب کو دیکھا تو لگے اس سے بھاگنے؛ (ان سے کہا گیا) مت بھاگو اور جس عیش و آسائش میں تم (پڑے ہوئے) تھے اس کی طرف اور اپنے عشرت کدوں کی طرف لوٹ جاؤ تا کہ تم سے (تمھارے رویوں کے بارے میں) پوچھ گچھ ہو۔ (تب) کہنے لگے ہائے شامت! بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ (۲۱:۱۱ تا ۱۴)

عیش و عشرت میں پڑنے کا انجام اس دنیا میں فرد اور سماج کی تباہی ہے اور آخرت کی بھی بربادی ہے، اور اس رویے سے آدمی سماج سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور اللہ سے بھی دور ہوجاتا ہے۔ دیکھیں آیت [۱۷:۱۶] اور اس کی تشریح۔

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۲۳ وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا

اور ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا (جس نے ان سے کہا) کہ اللہ ہی کی عبادت کرو (کہ) اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے اور آخرت کے آنے کو جھوٹ سمجھتے تھے اور دنیا کی زندگی میں ہم نے ان کو آسودگی دے رکھی تھی کہنے لگے کہ یہ تو تمہارے ہی جیسا آدمی ہے، جس قسم کا کھانا تم کھاتے ہو اسی طرح کا یہ بھی کھاتا ہے اور پانی جو تم پیتے ہو اسی قسم کا یہ

تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

بھی پیتا ہے؛ اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے آدمی کا کہا مان لیا تو گھاٹے میں رہو گے۔ (۲۳:۳۲ تا ۳۴)

یہ آیات اس بات کو اجاگر کرتی ہیں کہ اس دنیا کے عیش و آرام میں مبتلا ہونے سے انسان کی انفرادی اور سماجی فعالیت تھم جاتی ہے اور جو لوگ صرف عیش و آرام میں جیتے رہنا چاہتے ہیں وہ اس صورت حال میں کسی بھی تبدیلی کے مخالف بن جاتے ہیں جس میں وہ عیش اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مخالفانہ روش کے لئے ہر طرح کی دلیل اور حجت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ اللہ کے پیغمبر انہی کی طرح صرف ایک انسان تھے اور انہیں کوئی مافوق الفطری قوت حاصل نہیں تھی [۶:۸ تا ۸؛ ۱۷:۹۰ تا ۹۶؛ ۲۳:۲۴؛ ۲۵:۲۱؛ ۴۱:۱۴؛ ۴۳:۶۰]، اور یہ کہ یہ پیغمبر اور ان کی پیروی کرنے والے لوگ نہ تو دولت مند ہیں اور نہ ان کی کوئی سماجی حیثیت ہے [۱۱:۲۷ تا ۳۱، ۹۱ تا ۹۳؛ ۲۵:۷ تا ۱۱، ۲۰؛ ۳۴:۳۴ تا ۳۵؛ ۴۳:۳۱ تا ۳۲]۔ قرآن بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ کا ہر نبی ایک بشر ہی ہے اور انہی لوگوں میں سے ہے جن کی ہدایت کے لئے انہیں بھیجا گیا ہے، اور اگر وہ ان میں سے نہیں ہوگا تو وہ ان سے بات چیت کرنے اور انہیں اللہ کا پیغام دینے کا اہل ہی نہیں ہوگا۔

علاوہ ازیں، اللہ کے نبی کو ان کے اخلاقی مرتبہ اور معتبریت کے لحاظ سے دیکھا جانا چاہئے، اور ان کے پیغام کی افادیت اور اہمیت کو سمجھنا چاہئے، ان کی دولت و حشمت یا سیاسی طاقت کے لحاظ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ ان کا تو پیغام ہی خود اپنے آپ میں اپنی اہمیت اور پیغمبر کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ پر ایمان اور آخرت میں انسانوں کی جواب دہی کا یقین بالکل ایک عقلی اور منطقی بات ہے۔ لیکن جو لوگ عیش و مستی میں پڑے ہوتے ہیں اور حالت موجودہ سے مستفید ہوتے رہتے ہیں وہ تبدیلی اور جواب دہی سے ڈرتے ہیں، اور اپنے حال میں مگن رہتے ہیں، خاص طور سے تب جب کہ اللہ کے دین اور پیغام میں مضمر اس کے انصاف کی زد ان کی نامناسب سماجی و اقتصادی حیثیت و حشمت پر پڑتی ہے۔ اس تکبر اور سماج و اخلاقیات سے دوری کو روکنے کے لئے اسلام عیش پسندی اور فضول خرچی کی مخالفت کرتا ہے چاہے یہ فضول خرچی جائز طریقے سے کمائی گئی دولت سے ہی کی جا رہی ہو اور جس کام میں خرچ کی جا رہی ہو وہ بنیادی اور اصولی طور پر مباح ہو۔ جائز چیزوں یا دولت کا غلط استعمال بھی غیر قانونی اور ناجائز دولت کے استعمال کے اخلاقی اور سماجی نقصان سے کم مہلک نہیں ہے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَ ابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور ان پر ظلم کرتا تھا اور ہم نے اُس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ اُن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں؛ جب اُس سے اُس کی قوم نے کہا کہ اِترائیے مت کہ اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور جو (مال) تمہیں اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کیجئے اور دنیا سے بھی اپنا حصہ نہ بھلائیے، اور جیسی اللہ نے آپ سے بھلائی کی ہے (ویسی) آپ بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو اور ملک میں طالبِ فساد نہ ہو

الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَ لَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۟ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ ۚ لَوْ لَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ بولا کہ یہ (مال) مجھے میرے علم (عقل دانش) سے حاصل ہوا ہے؛ کیا اُس کو معلوم نہیں کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی اُمتیں جو اس سے قوت میں بڑھ کر اور جمعیت میں زیادہ تھیں ہلاک کر ڈالی ہیں؟ اور گنہگاروں سے اُن کے گناہوں کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔ پھر (ایک روز) قارون (بڑی) آرائش (اور ٹھاٹھ باٹ) سے اپنی قوم کے سامنے نکلا، تو جو لوگ دنیا کی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے کہ جیسا (مال و متاع) قارون کو ملا ہے کاش (ایسا ہی) ہمیں بھی مل جائے وہ تو بڑا ہی نصیب والا ہے۔ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے کہ تم پر افسوس، مومنوں اور نیکوکاروں کے لئے (جو) ثواب اللہ (کے ہاں تیار ہے وہ) کہیں بہتر ہے اور وہ صرف صبر کرنے والوں کو ہی ملے گا۔ پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تو اللہ کے سوا کوئی جماعت اُس کی مددگار نہ ہو سکی اور نہ وہ بدلا لے سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کے سے رتبے کی تمنا کرتے تھے صبح کو کہنے لگے ہائے شامت اللہ ہی تو اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا؛ ہائے خرابی کافر نجات نہیں پا سکتے۔ وہ (جو) آخرت کا گھر (ہے) ہم نے اُسے اُن لوگوں کے لئے (تیار) کر رکھا ہے جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور (نیک) انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔ (۲۸:۷۶ تا ۸۳)

یہ ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو اپنی دولت اور عیش و عشرت میں اتنا مست تھا کہ اللہ کے فضل کا ہی منکر بن گیا اور آخرت کو بھلا بیٹھا، اور اس بات کو کہ اسے فیصلے کے دن اپنے گھمنڈ اور دولت کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا لیکن اس نے اللہ کی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا جو اسے اللہ کے نبی نے پہنچائی۔ اور نبی کی قوم سے ہونا اللہ کی ہدایت کے اس منکر اور متکبر کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکا۔ اس قصے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عیش پسندی کی زندگی دوسرے لوگوں میں جو مال دار نہیں ہوتے رشک پیدا کرتی ہے، جب کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ حق و صداقت پر قائم رہنے اور ہر حال میں نیکی پر ثابت قدم رہنے کی قیمت کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت میں اللہ کے یہاں ملنے والا اجر ان مسرتوں اور لذتوں سے کہیں بہتر ہے جو اس عارضی دنیا کی مختصر سی زندگی میں کسی کو حاصل ہوتی ہیں اور ان سے انسان اکثر ناعاقبت اندیش اور ناشکرا بن جاتا ہے۔

قرآن میں اس شخص کا نام قارون ہے، جبکہ عہد عتیق میں 'کورہ' (Korah) نامی شخص کا ذکر ہے[xvi]۔لیکن یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں یہ بات ثابت نہیں کی جاسکتی اور نہ ایسا کرنا ضروری ہی ہے، کیوں ''ذوالقرنین'' کے قصہ میں اس کا اخلاقی سبق ہی اس قصہ کا مقصد ہے، چاہے اس شخص کی تاریخی تمثیل کوئی بھی ہو۔ یہ قصہ اس اخلاقی پیغام پر ختم ہوتا ہے کہ زمین پر اکڑ کر چلنا فساد پھیلانے اور برائیاں کرنے سے کم لائق مذمت نہیں ہے، اور یہ کہ بہتر انجام چاہے وہ دیر سویر اس دنیا میں ہی سامنے آئے یا آخرت میں سامنے آئے، وہ متقیوں کے لئے ہی ہے۔ اللہ پر ایمان اور جواب دہی کا یقین انہیں قوت واختیار حاصل ہونے کی صورت میں احساس برتری اور بے اختیار و بے قوت ہونے کی صورت میں احساس کم تری سے بچاتا ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝۳۵

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں؛ اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔ (۳۴:۳۴ تا ۳۵)

خوش حال اور اپنے آپ میں مگن رہنے والوں کی ذہنیت اور رویہ کا ایہ ایک اور حوالہ ہے۔ ان کی ساری سوچ اور ان کی سرگرمیاں اپنی دولت، اپنے قبیلے اور اپنی سماجی طاقت کے اردگرد ہی مرکوز رہتی ہے، اور وہ کسی معقول بات اور بے لوث رویہ کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اوپر کی آیت یہ بتاتی ہے کہ ایسے لوگوں کی عقلی، اخلاقی اور سماجی خود پسندی ایک عام حقیقت ہے، اور یہ وضاحت کرتی ہے کہ اسلام نے کمانے اور خرچ کرنے کے لئے رہنمائی کیوں دی ہے کہ اس کا مقصد فرد کے رویہ اور سماج میں اخلاق اور انصاف کی حفاظت کرنا ہے۔ جائز ذرائع سے بہت زیادہ دولت کمانا اسلام میں قانونی اور معاشی لحاظ سے مقبول ہے بشرط یہ کہ انفرادی اور سماجی ضرورتوں کے لئے مناسب طریقے سے خرچ کرنے میں توازن رکھا جائے اور دولت جمع کر کے رکھنے یا اسے فضول خرچیوں میں اڑانے سے بچا جائے۔

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝۲۳

اور اسی طرح ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ہدایت کرنے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم قدم بقدم انہی کے پیچھے چلتے ہیں۔ (۴۳:۲۳)

اس دنیا کے عیش وآرام میں مبتلا لوگ ردعمل کے خوگر ہوتے ہیں اور خود پسند وانا پرست ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار صرف یہ ہوتا ہے کہ باپ دادا کے زمانے سے کیا چلا آرہا ہے۔ ان کی انفرادیت صرف راحت وعیش حاصل کرنے سے ہی تسکین پاتی ہے وہ اپنے طرز زندگی کا محاسبہ نہیں کرتے ہیں۔ عیش طلبی ان کی عقل، اخلاق اور سماجی احساسات کو مقفل کر دیتی ہے اور انہیں تعمیری رویہ اختیار کرنے اور کسی بھی اصلاحی عمل کو شروع کرنے یا اس کی تائید کرنے سے باز رکھتی ہے۔ ان کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں انہیں حاصل ناحق مراعات کے جاری رہنے کا یقین جاگزیں ہوتا ہے، اس لئے وہ ایسی کسی بھی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں جو ان کی حیثیت ومرتبہ کے

لئے خطرہ بن سکتی ہو۔آدمی کو نہ صرف یہ کہ جائز طریقے سے اور کسی کا استحصال کئے بغیر یا دھوکہ دھڑی یا جبر وستم کے بغیر کمانا چاہئے بلکہ اسے اپنی کچھ دولت انفرادی اور سماجی ترقی و بہبود کے لئے بھی خرچ کرنی چاہئے اور یہ انفاق ہر لحاظ سے ہو جسمانی بھی، عقلی بھی اور روحانی و اخلاقی بھی۔

فضول خرچی کی ممانعت

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو اُن کا حق ادا کرو اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔(۲۶:۱۷ تا ۲۷)

تفسیر طبری کے مطابق تبذیر (فضول خرچی) کا مطلب ہے غلط یا غیر معقول مقاصد کے لئے خرچ کرنا، چاہے وہ مباح ہی ہوں۔ اسراف کے ساتھ خرچ کرنے میں مال کی خاصی مقدار بے مقصد خرچ ہوتی ہے اور مال ضائع ہوتا ہے۔فضول خرچی جس میں عیاشی میں اڑانا اور دوسرے بے مطلب کاموں میں خرچ کرنا شامل ہے، اخلاقی اور سماجی خرابیوں کی وجہ بنتی ہے، کیوں کہ خرچ کرنا ایک ذاتی خبط بن جاتا ہے، اور تمام لوگوں کے سماجی و معاشی مفادات نظر انداز ہو جاتے ہیں یا ان پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا جاتا۔حتیٰ کہ خود فضول خرچ آدمی کے انفرادی مفادات کا توازن بھی قائم نہیں رہ پاتا جس سے تمام شخص کی ہمہ پہلو انسانی ضروریات کی ٹھیک سے تکمیل ہو اور حال و مستقبل دونوں کا لحاظ ہو۔اللہ کی بخشی ہوئی چیزوں کو فضول خرچی میں اڑانا جس سے فرد یا سماج کو کوئی حقیقی فائدہ حاصل نہ ہو، اللہ کی نعمتوں کو ضائع کرنا ہے اور نعمتوں سے نوازنے والے رب کے تئیں ناشکری کا رویہ ہے۔چوں کہ شیطان اللہ کا ناشکرا ہے اس لئے فضول خرچ آدمی بھی شیطان کی پارٹی کا حصہ بن جاتا ہے، یا ناشکرے لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔تبذیر (فضول خرچی) کی اتنی شدید مذمت سے اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ اسلام کا سماجی و اقتصادی انصاف کمانے اور خرچ کے مناسب ذریعہ اور طریقے سے شروع ہوتا ہے تاکہ فرد اور سماج کے عارضی و دیرینہ مفادات میں توازن بنا رہے۔اس بنیاد کو درست کرنے کے بعد زکوٰۃ اور صدقات اسلام کے عدل و انصاف کے عمل کی تکمیل کا وسیلہ بنتے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ ان کے درمیان (اعتدال) پر قائم رہتے ہیں۔
(۶۷:۲۵)

یہ خرچ کرنے میں مطلوب میانہ روی اور اعتدال کی ایک اور تعلیم ہے، کہ نہ تو خرچ کرنے میں بخل سے کام لیا جائے اور نہ حد سے زیادہ اور بے جا اڑایا جائے بلکہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان میں رہا جائے۔ دیکھیں اس سے پہلے ذکر کردہ آیات اور ان کی تشریح [۲۶:۱۷ تا ۲۷، ۲۹]۔

مسلم سماج اور ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور بحیثیت مجموعی تمام بنی نوع انساں کو تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی چاہے وہ کہیں بھی پیدا ہوئے ہوں اور ان میں کتنا ہی فرق ہو۔ تمام انسانوں کو چاہے ان کی اصل، نسل، رنگ، زبان، مذہب اور وطن کچھ بھی ہو، برابر کی انسانی استعداد اور خوبیاں بخشی گئی ہیں کہ ان سب کی پیدائش ایک ہی انسانی جوڑے سے ہوئی ہے، یعنی آدم اور حوّا۔ قرآن میں تمام بنی نوع انساں کے لئے ''بنی آدم'' کا لفظ ۸ بار استعمال کیا گیا ہے [۷:۲۶ تا ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۱۷۲؛ ۱۷:۷۰؛ ۱۹:۵۸؛ ۳۶:۶۰]، اور لفظ ''انسان'' کا استعمال ۶۵ سے زائد آیات میں استعمال ہوا ہے [۴:۲۸؛ ۱۰:۱۲؛ ۱۱:۹؛ ۱۲:۵؛ ۱۶:۴؛ ۱۷:۱۱، ۱۳ تا ۱۴، ۱۱۰؛ ۱۸:۵۴؛ ۲۱:۳۷؛ ۲۹:۸؛ ۳۱:۱۴؛ ۳۳:۷۲؛ ۵۳:۳۹ تا ۴۱؛ ۵۵:۳؛ ۷۰:۱۹ تا ۲۲؛ ۷۵:۱۴ تا ۱۵، ۳۶؛ ۷۶:۱ تا ۲؛ ۸۰:۲۴ تا ۳۰؛ ۸۲:۶ تا ۸؛ ۸۴:۶؛ ۸۶:۵ تا ۱۱؛ ۹۵:۴ تا ۶؛ ۹۶:۲ تا ۸؛ ۱۰۰:۶ تا ۸؛ ۱۰۳:۲ تا ۳] اور لفظ ''الناس'' ۲۳۰ سے زائد آیات میں استعمال ہوا ہے [۲:۲۱ تا ۲۲، ۴۴، ۱۲۴، ۱۴۳، ۱۶۴ تا ۶۵، ۱۸۸، ۲۰۰ تا ۲۰۱، ۲۰۴ تا ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۵۱، ۲۶۴؛ ۳:۴، ۱۴، ۱۱۰، ۱۳۴، ۱۴۰، ۱۸۷؛ ۴:۱، ۳۷ تا ۳۸، ۵۳، ۵۸، ۷۹، ۱۱۴، ۱۳۳، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۴؛ ۵:۳۲؛ ۶:۹۱، ۱۲۲؛ ۷:۸۵، ۱۵۸؛ ۸:۴۷؛ ۹:۳۴؛ ۱۰:۱۱، ۱۹، ۲۱ تا ۲۳، ۹۹؛ ۱۱:۸۵، ۱۱۸ تا ۱۱۹؛ ۱۶:۴۴، ۶۱؛ ۱۷:۸۹، ۱۰۶؛ ۲۲:۱ تا ۲، ۵، ۸، ۱۱، ۴۰، ۶۵، ۷۳ تا ۷۶، ۷۸؛ ۲۴:۳۵؛ ۲۶:۱۸۳؛ ۲۹:۲ تا ۳، ۴۳؛ ۳۰:۳۰، ۳۹، ۴۱، ۵۸؛ ۳۱:۱۸، ۲۰، ۳۳؛ ۳۴:۲۸؛ ۳۵:۱۵، ۲۸، ۴۵؛ ۳۹:۲۷، ۴۱؛ ۴۰:۵۷؛ ۴۲:۴۲؛ ۴۹:۱۳؛ ۵۷:۲۵؛ ۸۳:۲ تا ۶؛ ۹۹:۶ تا ۸؛ ۱۱۴:۱ تا ۶]۔ مختلف موقعوں پر قرآن مخصوص طور پر ''ایمان لانے والوں'' سے خطاب کرتا ہے جو وحی الٰہی اور رسول اللہ کی تعلیمات پر ایمان لاتے ہیں۔

سبھی انسانی خوبیاں: جسمانی، عقلی اور روحانی، نفسیاتی و اخلاقی تمام انسانوں کو بخشی گئی ہیں، اور تمام انسانوں پر ان کا احترام لازم ہے اور باہمی تنوع کے باجود انسانوں کو ایک دوسرے سے تعلقات قائم کرنے ضروری ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے جب ایک یہودی کا جنازہ آتے ہوئے دیکھا تو آپؐ کھڑے ہوگئے، اور جب صحابہ نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تو آپؐ نے جواب دیا ''کیا وہ ایک انسان نہیں؟'' [بخاری]۔

مسلم ممالک کے حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مملکت کے زیر اقتدار رہنے والے تمام انسانوں کے اندر انسانی اوصاف کو حتی الامکان فروغ دیں۔ آیت ۱۷:۷۰ میں انسانوں پر اللہ کی کچھ نوازشات کا ذکر کیا گیا ہے جن کی حفاظت کرنا اور انہیں ترقی دینا ضروری ہے،

جیسے آمد و رفت اور مواصلات کے تمام ذرائع سے پوری دنیا میں نقل و حرکت اور باہمی تعلقات کو استوار کرنا، زندگی کو ترقی دینے والی اچھی چیزیں بنانے کے لئے اقتصادی وسائل کو استعمال کرنا اور اس طرح سے کام میں لانا کہ وہ نہ تو ضائع ہوں اور نہ آلودگی کا باعث بنیں، اور وہ تمام چیزیں اور وسائل فروغ دینا جن سے انسانی سماج مہذب بنے اور ''انسانی تہذیب'' ترقی کرے، جو دوسری تمام مخلوقات کی دنیاؤں سے بالکل مختلف ہو۔ غیر مسلم بھی اس انسانی سماج کا ہی حصہ ہیں جسے اللہ نے تکریم سے نوازا ہے، ان کی انسانی خوبیاں بھی لائق عزت و احترام ہیں اور مسلم سماج و مسلم مملکت میں ان کی عزت و توقیر کی جاتی ہے۔ سماجی و اقتصادی انصاف کے قیام میں تحفظ، صحت عامہ، تعلیم، کام اور روزگار کے مواقع نیز مختلف قسم کی فلاحی اسکیمیں تمام انسانوں کے لئے فراہم ہونا بھی شامل ہے جو مسلم مملکت کے اقتدار اور ذمہ داری میں رہتے ہوں۔ سماج میں ہر فرد کو ایک دوسرے سے سابقہ پیش آتا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے ملنا جلنا و تعامل کرنا ہوتا ہے، پڑوس میں رہنے کے تعلق سے، ساتھ میں کام کرنے کے تعلق سے، شہر یا ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے وغیرہ وغیرہ۔

انسانی تنوع اور تبدیلی

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور اگر تمہارا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، مگر جن پر تمہارا رب رحم کرے؛ اور اسی لئے اس نے ان کو پیدا کیا ہے اور تمہارے رب کا قول پورا ہو گیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔

(۱۱:۱۱۸ تا ۱۱۹)

نوع انسانی اصلاً ایک ہی نسل اور ایک ہی برادری ہے لیکن انسانی سماج مختلف و متنوع لوگوں سے مل کر بنا ہے جس پر قرآن میں بار بار زور دیا گیا ہے۔ اوپر کی آیتوں میں تنوع اور اختلاف کا جو تصور واضح طور سے دیا گیا ہے اسے قرآن میں ۲۰ سے زائد بار ذکر کیا گیا ہے [۲:۲۱۳؛ ۵:۴۸، ۶:۴۲، ۱۰۸؛ ۷:۳۸، ۱۰:۱۹؛ ۱۳:۳۰؛ ۱۶:۶۳، ۹۲ تا ۳؛ ۲۳:۴۴؛ ۲۹:۱۸؛ ۳۵:۲۴، ۴۲؛ ۴۰:۵؛ ۴۱:۲۵؛ ۴۲:۸؛ ۴۳:۲۲ تا ۲۳، ۳۳:۴۵، ۱۷، ۲۸:۴۶، ۱۸]۔ اختلاف ایک انسانی فطرت ہے، اور قرآن یہ بات زور دے کر بار بار کہتا ہے کہ انسانوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ آخرت کے دن کرے گا [۲:۱۱۳، ۱۵۳؛ ۳:۵۵؛ ۵:۴۸؛ ۶:۱۶۴؛ ۱۰:۹۱، ۹۳:۱۶؛ ۳۳ تا ۳۹، ۹۲، ۱۲۴؛ ۲۲:۶۹؛ ۳۲:۲۵؛ ۳۹:۳، ۴۶]۔ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو جو خصوصیات اور لیاقتیں عطا فرمائی ہیں ان میں انسان کی عقل اور مرضی کی آزادی سب سے ممتاز خصوصیات ہیں، اور اسی کی وجہ سے ان میں مستقل اختلافات قائم رہتے ہیں، جب کہ ان میں پیدائشی اور خلقی طور پر بھی جسمانی، نفسیاتی، عقلی فرق ہوتا ہے جو موروثی طور سے بھی چلا آتا ہے اور ماحول و جغرافیائی عناصر کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ انسانوں کے پوری دنیا میں پھیل جانا بھی، جو کہ پچھلی آیت ۱۷:۷۰ کی رو سے ایک خاص انسانی وصف ہے، انسانی تنوع کو پیدا کرنے کا ایک مزید سبب ہے۔ مزید برآں، ایک ہی طرح کے انسانوں میں کسی خاص زمانہ اور خاص مقام کی وجہ سے بھی مستقل تبدیلی آتی رہتی ہے۔ [۲:۱۵۵؛ ۳:۱۴۰، ۱۸۶؛ ۵:۱۴۸؛ ۶:۱۶۵؛ ۸:۵۳؛ ۱۳:۱۱؛ ۱۸:۷؛ ۲۱:۳۵؛ ۷۶:۲؛ ۸۹:۱۵ تا ۱۶]۔

اس طرح کے وسیع الاطراف فرق اور مستقل تبدیلیوں کی بدولت اسلام کے پیغام پر تمام انسانوں کا متفق ہو جانا، نیز دوسرے

ایسے معاملوں میں مکمل اتفاق رائے قائم ہوجانا جو انسان اپنی عقل سے طے کرتے ہیں، ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ الگ الگ طرح کی سوچ اور مرضی کی آزادی رکھنے والی انسانی فطرت کے خلاف ہے: ''کہہ دو کہ (لوگو!) یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے'' [۲۹:۱۸]۔ انسانوں کے درمیان اختلافات کا ہونا ایک فطری حقیقت ہے، اور جو لوگ اللہ کے فضل اور اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ اپنے اختلافات کو سوجھ بوجھ اور کامیابی کے ساتھ حل کرلیں گے۔ انسانوں کو ان کی خصوصیات اور لیاقتوں کے ساتھ اس دنیا میں مستقل آزمائش کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ ان چیلنجز کو کس طرح حل کرتے ہیں۔ مختلف طرح کے انسانوں کے درمیان باہمی تعاون اور بقائے باہم پر قرآن میں زور دیا گیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ ایمان وعقیدے یا دوسرے معاملات میں تمام انسانوں کے یکساں ہونے کی سوچ انسانوں کے درمیان فطری تنوع کے برخلاف ہے۔ مسلمانوں کو دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اخلاقی قدروں کی مشترک بنیادوں، تعمیری مذاکرات اور تخلیقی تعاون کو فروغ دینے کے لئے اسے عمل میں لانا ہوگا۔

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت (شیطان اور شیطانیت) کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا اُس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (سب کچھ) سنتا اور جانتا ہے۔ (۲۵۶:۲)

عقیدے کی آزادی کے اس اصول کو قرآن میں کئی جگہ دوہرایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر: ''اور اگر تمہارا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہوجائیں؟ [۹۹:۱۰]''۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! تم کیا سوچتے ہو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے (روشن) دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے جس سے تم سے اندھے رکھے گئے ہو تو کیا ہم اس کے لئے تمہیں مجبور کریں گے جب کہ تمھیں وہ ناگوار ہے؟ [۲۸:۱۱]''، ''اور تم ان پر کسی بھی طرح سے جبر کرنے والے نہیں ہو''، ''(اے پیغمبرؐ) تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، تم ان پر داروغہ نہیں ہو [۲۱:۸۸ تا ۲۲]۔ کسی شخص کو کسی عمل پر کسی بھی طرح مجبور کرنے سے اس عمل کے تئیں اس شخص کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے، چاہے وہ اچھا کام ہو یا برا؛ چنانچہ کسی انسان پر اسلام کو جبراً تھوپنے سے نہ تو اس شخص کو اللہ کی رضا حاصل ہوگی یا کوئی اجر ملے گا اور نہ اسے مجبور کرنے والے کو۔

اس آیت (۲۵۶:۲) کی شان نزول یہ بتائی گئی ہے کہ قبل از اسلام کے مدینہ (یثرب) کے بعض لوگ جن کے بچے یہودیوں کے یہاں پل رہے تھے اور اپنی نذر پوری کرنے کے لئے انھوں نے ان بچوں کو یہودی بنانا طے کرلیا تھا، اسلام میں آنے کے بعد یہ خواہش رکھتے تھے کہ ان بچوں کو واپس لے لیں اور مسلمان بنادیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جبر کرنا صحیح نہیں ہے۔ ایک اور روایت میں شان نزول کے لئے

ایک اور قصہ بیان ہوا ہے، کہ یثرب کے ایک آدمی کے دو بیٹوں کو شام کے تاجروں نے عیسائی بننے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ان کے والدین ان بچوں کو جبر کر کے واپس اپنے دین میں لانا چاہتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا حق دیا، اور تب یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ کے فیصلے کی تائید ہوئی۔ ممتاز مفسر قرآن اور ماہر لسان الزمخشری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے عقیدے کے معاملہ میں جبر اور دباؤ کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ فرد کو رضامندی سے دین اختیار کرنے کے لائق بنایا ہے''۔ انھوں نے اس اہم قیمتی اصول کی مثال میں آیت ۱۰:۹۹ بھی نقل کی ہے۔

اس اصول پر موثر طریقے سے عمل کرنے کے لئے مسلم فقہاء نے یہ بحث کی ہے کہ کسی مسلمان شوہر کا اپنی بیوی کو اسلام قبول کرنے کے لئے کہنا کیا جبر اور زبردستی کرنے کے زمرے میں آئے گا؟ احناف کا رجحان یہ ہے کہ اس کی اجازت ہے بشرط یہ کہ اس میں کوئی دباؤ شامل نہ ہو، شافعی فقہا نے یہ مانا ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا دباؤ ہے (عبدالکریم زیدان، احکام الذمیین والمستمنین فی دارالاسلام، بغداد یونیورسٹی، ص۔ ۶۲۹)۔ ابن القیم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک مسلمان شوہر اپنی عیسائی یا یہودی بیوی کو شراب پینے سے منع نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ اس کے مذہب میں ممنوع نہیں ہے، لیکن خود اسے یہ چاہئے کہ وہ شراب یا نشے میں مبتلا نہ ہو [ابن القیم، احکام الذمہ، بیروت: ۱۹۶۱، ۲: ص۔ ۴۳۹]۔ چنانچہ اکثر فقہاء نے یہودیوں اور عیسائیوں کو شراب نوشی کی وہ سزا دینے سے مستثنیٰ رکھا ہے جو کہ مسلمان پر عائد ہوتی ہے۔ مالکیوں کی رائے دوسروں سے الگ ہے، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلم مملکت میں رہنے والا غیر مسلم (ذمی) جس پر زنا کا الزام ہو اس پر مقدمہ اس کے مذہبی قوانین کے مطابق ہی چلایا جائے گا [زیدان، احکام الذمیین والمستمنین، بیروت، ص۔ ۲۵۱ تا ۱۵۲]۔

مسلمان یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ ان کی تاریخ مسلمانوں میں اس شرعی اصول پر ہمیشہ عمل کئے جانے کی گواہ ہے، کیوں کہ وقتاً فوقتاً انحراف کی بشری کمزوری صادر ہوتی رہی ہیں لیکن یہ خلاف ورزی مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کبھی بھی ایک غالب صورت حال نہیں بنی نہ کوئی عام اصول بنی، جیسا کہ غیر مسلم مورخین اور قانون دانوں نے لکھا ہے۔ گستاف وون گرونبام (Gustave von Grunebaum) نے اعتراف کیا ہے کہ ''زمانہ وسطیٰ میں غیر مذہب والوں پر جبر وستم مغرب کے مقابلے، جہاں یہودیوں کو چھوڑ کر دیگر مذہبی اقلیتیں نہ ہونے کے برابر تھیں، مشرق میں کم تھا''۔ یہ بات صحیح ہے کہ بعض حکمراں افراد نے، نہ کہ مجموعی طور پر مسلم مملکت کے حکام نے، غیر مسلم قوموں یا ان کے بعض معززین کو نقصان پہنچایا ہے، لیکن اس طرح کے واقعات ان حکمرانوں کی شاہانہ عیش کوشی اور سیاسی مطلق العنانی کے زمانے میں ہوئے ہیں جب مسلمان خود بھی بادشاہوں کی مطلق العنانی اور من مانی کا نشانہ بنے ہیں'' [Medival Islam, Chicago:1946, P.180]۔ ماجد کھدوری نے تاریخ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کا یہ منظر نامہ پیش کیا ہے: ''اگر کبھی کسی دور میں عدم رواداری کا کوئی جذبہ ظاہر ہوا ہے تو یہ جبر واستبداد کی حکومتوں کے فروغ کی علامت تھا جس میں مسلم عوام نے بھی غیر مسلموں سے کم مصائب نہیں جھیلے۔ بعض اوقات عوامی فساد کا رخ غیر مسلموں کی طرف بھی رہا ہوگا لیکن عوامی فساد عوام کے اندر بے چینی اور ان پر ناانصاف حکام کے مسلط ہونے کی علامت ہے جن کی حکمرانی میں نہ تو مسلمانوں کو امن وخوش حالی نصیب ہوئی اور نہ ذمی امن وسکون سے رہ سکے۔ اگر کچھ خلفاء اور گورنر ظالم وسفاک گزرے تو دوسرے شریف اور رحم دل بھی تھے۔ ظالم حکومتوں کے دور میں ذمیوں کو بھی جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا ہوگا لیکن ان حکومتوں میں خود مسلمانوں کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ تاہم مسلم حکومتوں کے ماتحت ذمیوں کے ساتھ عام سلوک کا اندازہ صرف بعض مطلق العنان حکمرانوں اور کچھ افراد کے ہاتھوں ذمیوں کو ستائے جانے سے ہی نہیں لگانا چاہئے بلکہ اس بات سے بھی لگانا چاہئے کہ قانون شریعت میں رواداری کے کیا اصول دئے گئے ہیں اور ہر زمانے و ہر نسل کے مسلمانوں میں عام طور سے غیر مسلموں (ذمیوں) کے تئیں کیا

جذبہ رہا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے مسلمانوں کا سلوک کیسا رہا ہے، نیز اس کا اندازہ اس سے بھی لگانا چاہئے کہ اکثر عوام کو جو آسودگی اور تحفظ حاصل تھا اس کی بہ نسبت جبر و تشدد کے واقعات کا تناسب کیا ہے'' [War and Peace in the Law of Islam, 1955:Baltimore, pp. 200– 201]

ماقبل کی الٰہی تعلیمات کے پیروکاروں (یعنی اہل کتاب، خاص طور سے یہود و نصاریٰ) کو ان تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

(یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لئے جاسوسی کرنے والے اور (رشوت کا) حرام مال کھانے والے ہیں۔ اگر یہ تمہارے پاس (کوئی مقدمہ فیصل کرانے کو) آئیں تو تم اُن میں فیصلہ کر دینا یا اعراض کرنا اور اگر اُن سے اعراض کرو گے تو وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے، اور اگر فیصلہ کرنا چاہو تو انصاف کا فیصلہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۴۲:۵)

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور یہ تم سے (اپنے مقدمات) کیونکر فیصل کرائیں گے جب کہ خود اُن کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے (اور یہ اُسے جانتے ہیں) پھر اس کے بعد اُس سے پھر جاتے ہیں اور یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ بے شک ہم نے ہی تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے مطابق انبیاء جو (اللہ کے) فرمانبردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے اور مشائخ اور علماء بھی کیونکہ وہ کتاب اللہ کے نگہبان مقرر کئے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے (یعنی حکمِ الٰہی کا یقین رکھتے تھے)، تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا؛ اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔ اور ہم نے ان لوگوں کے لئے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، اور سب زخموں کا اسی طرح بدلا ہے لیکن جو شخص بدلا معاف کر دے وہ اس کے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

لئے کفارہ ہوگا؛ اور جو اللہ کے فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔ (۵: ۴۳ تا ۴۵)

وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور ان پیغمبروں کے بعد انہی کے قدموں پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے اور اُن کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے اور تورات کی تصدیق کرنے والی ہے جو اُس سے پہلے سے ہے، اور ہدایت و نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔ اور اہلِ انجیل کو چاہئے کہ جو احکام اللہ نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں؛ اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے گا تو ایسے لوگ نافرمان ہیں۔ (۵: ۴۶ تا ۴۷)

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر محیط ہے۔ تو جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمہارے پاس آ چکا ہے اس کو چھوڑ کر اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک (قوم) کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تمہیں دئے ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے، سو نیک کاموں میں جلدی کرو، تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر جن باتوں میں تمہیں اختلاف تھا وہ تمہیں بتا دے گا۔
(۵: ۴۸)

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو (اور کتابیں) اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئیں ان کو قائم رکھتے تو (اتنا رزق ملتا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں کچھ لوگ تو میانہ رَو ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے اعمال بُرے ہیں۔
(۵: ۶۶)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

کہو کہ اے اہلِ کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو (اور کتابیں) تمہارے رب کی طرف سے تم لوگوں پر نازل ہوئیں اُن کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے، اور (یہ قرآن) جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے اُن میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا تو تم قومِ کفار پر افسوس نہ کرو۔ (۶۸:۵)

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

(اے پیغمبر!) لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت سے اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ اور اچھے انداز سے ان سے بحث و استدلال کرو، جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا رب اُسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں اُن سے بھی خوب واقف ہے۔ (۱۲۵:۱۶)

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اہلِ کتاب سے مت جھگڑو مگر ایسے طریقے سے کہ نہایت اچھا ہو، الا یہ کہ جو اُن میں سے ظلم کرنے والے ہوں؛ اور کہہ دو کہ جو (کتاب) ہم پر اتری اور جو (کتابیں) تم پر اُتریں ہم سب پر ایمان لاتے ہیں اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ (۴۶:۲۹)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اُس کی طرف آؤ، وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (اُن سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم (اللہ کے) فرماں بردار ہیں۔ (۶۴:۳)

اہل کتاب کو یہ تاکید کی گئی کہ وہ اپنی تعلیمات پر عمل کریں، کیوں کہ اللہ کے دین کی بنیادی تعلیمات جو اللہ کے نبیوں نے دی ہیں وہ ایک ہی ہیں: ''اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو تو اُن میں بعض ایسے ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی سو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا

''[۱۶:۳۶]،'' اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو ''[۲۱:۲۵]۔ ایک اللہ پر ایمان جس کی ہدایت کے آگے انسان کو جھک جانا چاہئے اور اس ہدایت کے مطابق ہی عمل کرنا چاہئے، اللہ کے تمام پیغامات کی بنیاد ہے، جو انسان کو اندر سے آزاد کر دیتا ہے تا کہ وہ ہر باہری دباؤ اور اندرونی میلان سے آزاد ہو جائے۔ اللہ کی تمام مخلوقات اس تناظر میں اپنا مناسب اور درست مقام رکھتی ہیں، کیوں کہ وہ اعلیٰ و عظیم ہستی جس کے آگے انسان کو جھک جانا ہے وہ ایک ہے، اور باقی تمام دوسری چیزیں اس کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اللہ کی طرف سے آنے والے تمام پیغامات میں انصاف اور مہربانی کے جو اصول دئے گئے ہیں ان کے مطابق ہر انسان دوسروں کے ساتھ معاملہ اور برتاؤ کرنے کے سلسلہ میں جواب دہ ہے۔ یہ یقین عقیدے کو مضبوط کرتا ہے اور اس کے اخلاقی نتائج یقینی طور سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس جواب دہی کے لئے انسان اپنی روحانیت اور تزکیہ نفس کے شعور سے نیز اللہ کی ہدایت کے مطابق سماجی تعلیم اور قانونی نگرانی سے تیار ہوتا ہے۔

ان بنیادوں پر مسلمان اللہ اور اس کے پیغام پر یقین رکھنے والے تمام لوگوں سے اتفاق کرتے ہیں، اور یہ یقین رکھنے والوں کو قرآن میں خطاب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ وہ ان تعلیمات کو اپنی زندگی میں برتیں۔ یہ ان کی اپنی عقل اور اخلاق پر منحصر ہے کہ وہ انہیں اندر سے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ جس چیز پر پہلے سے ایمان رکھتے آئے ہیں اس کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات کو سمجھیں، ان کا موازنہ کریں اور ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔ اس کے لئے کوئی دباؤ تو کجا مسلمانوں کی طرف سے کسی مداخلت کی بھی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کی ذمہ داری تو بس اتنی ہے کہ وہ اللہ کے دین کو جو ان کے پاس موجود ہے پوری معقولیت کے ساتھ اور مہذب انداز میں ان کے سامنے پیش کریں اور ان کے سوالوں اور استفسارات کا تسلی بخش جواب دیں۔

جب لوگوں کے درمیان آپسی معلومات اور سوجھ بوجھ کے لئے کوئی مکالمہ ہو تو یہ انہی لوگوں کے درمیان ہو جو ہر طرح سے ایمان دار اور شریف لوگ ہوں، اور یہ مذاکرہ عقل و فہم اور باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہو۔ مثال کے طور پر، قرآن مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ دین اور عقیدے کے معاملے میں بھی اس طرح سے بات شروع نہ کریں کہ گویا سارا حق ان کے ہی پاس ہے اور دوسرے صرف جھوٹ پر ہی کھڑے ہیں [۳۴:۲۴]۔ اس طرح کی بات چیت یقینی طور سے لاحاصل رہے گی۔ ہر آدمی اپنے عقیدے کے تعلق سے فطری طور پر مطمئن ہوتا ہے اور کسی کو ہاتھوں ہاتھ بات ماننے پر راضی نہیں کیا جا سکتا۔ سبھی فریقوں کو دوسروں کے عقیدے کو بلا تعصب بیان کرنا چاہئے، اور یہ ماننا چاہئے کہ وہاں بھی کچھ نہ کچھ اچھی باتیں موجود ہیں۔ قرآن اہل کتاب سے اپیل کرتا ہے کہ مشترک بات کی طرف آئیں ''یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے''۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بنیاد ان تمام لوگوں کے لئے قابل قبول ہے جو ابراہیمی عقیدے پر ہیں اور اللہ کی کسی کتاب اور نبی کی پیروی کرتے ہیں۔ تثلیث میں یقین رکھنے والے بھی ہمیشہ ایک اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس طرح کی مشترک بنیادوں سے جو کوئی بھی انحراف کرتا ہے وہ اپنی نفسیات کے مطابق عمل کرتا ہے نا کہ دینی تدبر پر۔ اس طرح کے کسی مذاکرے میں حصہ لینے والے مسلمانوں کو اس کے علاوہ کوئی جواب دینے کی اجازت نہیں ہے کہ مہذب انداز میں اور توحید پر اصرار کرتے ہوئے کوئی ایسی بات کہیں جسے کوئی اہل کتاب اصولی طور سے رد نہ کر سکے، چاہے دینی تفصیلات میں کتنا ہی اختلاف ہو۔

اللہ تعالیٰ کے متواتر پیغامات میں انسانوں کے مختلف حالات کے لحاظ سے الگ الگ احکامات، لیکن نفس پیغام ایک؛

محمد ﷺ کا فرمان ہے کہ آپ پر ایمان رکھنے والے کے لئے یہ لازم ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں اور پہلے آئے ہوئے نبیوں پر بھی ایمان رکھے۔

اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ عِیۡسٰی وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡنُسَ وَ هٰرُوۡنَ وَ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾ وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی تَكۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾

(اے محمد!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور ان سے پچھلے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی اور ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم السلام) کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی تھی اور داؤد کو ہم نے زبور بھی عنایت کی تھی۔ اور بہت سے پیغمبر ہیں جن کے حالات ہم تم سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور بہت سے پیغمبر ہیں جن کے حالات تم سے بیان نہیں کئے، اور موسیٰ سے تو اللہ تعالیٰ نے باتیں بھی کیں۔ (سب) پیغمبروں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر بھیجا تھا) تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ (۴:۱۶۳ تا ۱۶۵)

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۸﴾

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر محیط ہے۔ تو جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمہارے پاس آ چکا ہے اس کو چھوڑ کر اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا ہم نے تم میں سے ہر ایک (قوم) کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تمہیں دئے ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے، سو نیک کاموں میں جلدی کرو، تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے پھر جن باتوں میں تمہیں اختلاف تھا وہ تمہیں بتا دے گا۔ (۵:۴۸)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تا کہ انہیں (احکامِ الٰہی) کھول کھول کر بتا دے پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔(۱۴:۴)

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶

اور ہم نے ہر امت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو تو اُن میں بعض ایسے ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی، سو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔(۱۶:۳۶)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۴۳ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۴۴

اور ہم نے تم سے پہلے مَردوں ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اہلِ ذکر (جاننے والوں/اہل کتاب) سے پوچھ لو۔ (اور ان پیغمبروں کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر (بھیجا تھا)، اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو اور تا کہ وہ غور کریں۔(۱۶:۴۳ تا ۴۴)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵

اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔(۲۱:۲۵)

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖۗ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝۹۲

یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کیا کرو۔(۲۱:۹۲)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝۲۰ ع

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے، تو کیا تم صبر کرو گے؟ اور تمہارا رب تو دیکھنے والا ہے۔(۲۵:۲۰)

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور تمہارا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک اُن کے بڑے شہر میں پیغمبر نہ بھیج لے جو اُن کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس حالت میں کہ وہاں کے باشندے ظالم ہوں۔ (۵۹:۲۸)

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴿۷﴾ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۸﴾

اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔ تاکہ سچ کہنے والوں سے اُن کی سچائی کے بارے میں دریافت کریں، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۷:۳۳ تا ۸)

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۭ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

ہم نے تم کو حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے اور کوئی امت نہیں مگر اس میں ہدایت کرنے والا گزر چکا ہے۔ (۲۴:۳۵)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

(مسلمانو) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اُتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں اُن پر اور جو اور پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملیں اُن پر (سب پر ایمان لائے)، ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (معبودِ واحد) کے فرماں بردار ہیں۔ (۲:۱۳۶: نیز دیکھیں ۳:۸۴)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ

رسول (اللہ) اس کتاب پر جو اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی۔ سب اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم اُس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں

اَطَعۡنَا٭ غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَ اِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸۵﴾

کرتے۔ اور وہ (اللہ سے) عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا اور قبول کیا۔ اے رب ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہی۔ (۲:۲۸۵)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ الۡکِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ وَ الۡکِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۳۶﴾

مومنو! اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور جو کتاب اُس نے اپنے پیغمبر (آخر الزماں) پر نازل کی ہے اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل کی تھیں سب پر ایمان لاؤ، اور جو شخص اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں اور روزِ قیامت سے انکار کرے وہ رستے سے بھٹک کر دُور جا پڑا۔ (۴:۱۳۶)

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّهِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾

جو لوگ اللہ سے اور اُس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے بیچ میں ایک راہ نکالنی چاہتے ہیں، وہ بلا شبہ کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں کسی میں فرق نہ کیا (یعنی سب کو مانا) ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان (کی نیکیوں) کے صلے عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۴:۱۵۰ تا ۱۵۲)

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ کَبُرَ عَلَی الۡمُشۡرِکِیۡنَ مَا تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَیۡهِ ؕ اَللّٰهُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾

اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس (کے اختیار کرنے کا) نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (وہ یہ) کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا؛ جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان کو دشوار گزرتی ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے، اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے اپنی طرف سے رستہ دکھا دیتا ہے۔ (۴۲:۱۳)

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾

اور اُس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکمِ الٰہی کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے اور ابراہیم کے دین کا پیرو ہے جو یکسو (مسلمان) تھے۔ اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا۔ (۱۲۵:۴)

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾

کہہ دو کہ مجھے میرے رب نے سیدھا رستہ دکھا دیا ہے (یعنی دین صحیح) مذہب ابراہیم (علیہ السلام) کا جو ایک (اللہ) ہی کی طرف کے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (۱۶۱:۶)

ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۲۳﴾

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (۱۲۳:۱۶)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰی وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا ۗ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۷﴾

جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک، اللہ ان (سب) میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا، بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ (۱۷:۲۲)

قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کے بعد ایک آنے والے تمام پیغاموں کو ایک ہی پیغام کے طور پر پیش کرتا ہے البتہ مختلف زمانوں اور مختلف مقامات کی الگ الگ صورت حال کے لحاظ سے اس کی تفصیلات اور احکامات الگ لگ رہے ہیں: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا'' [۴۸:۵]؛ '' اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا'' [۴:۱۴]۔ اللہ نے اپنے ہر نبی کو خود ان کی اپنی قوم میں بھیجا [۵۴:۲؛ ۲۰:۵؛ ۵۹:۷، ۷۵، ۱۲۸؛ ۱۰:۷۱، ۸۳؛ ۱۱:۲۵، ۳۸، ۷۸؛ ۱۱:۱۹؛ ۲۶:۷۰؛ ۲۷:۵۶؛ ۴۶:۲۱]، اور انہیں ان کا بھائی بتا کر ذکر کیا ہے [۷:۶۵، ۷۳؛ ۸۵؛ ۱۱:۵۰، ۶۱، ۸۴؛ ۲۷:۴۵؛ ۲۹:۳۶]۔ محمد ﷺ بھی اپنی قوم کے درمیان مبعوث ہوئے: ''(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں! تمہاری تکلیف اُن کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں'' [۹:۱۲۸]۔

جیسا کہ درج بالا آیات سے ظاہر ہے، قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ کے تمام نبیوں کا پیغام ایک ہی تھا، اور محمد ﷺ پر ایمان رکھنے والے ہر آدمی کو پچھلے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ خود محمد ﷺ کو بھی یہ تعلیم دی گئی تھی کہ وہ پہلے نبیوں کی طرح ثابت

قدمی سے اپنے پیغام پر قائم رہیں اور ایمان و استقامت میں ان کی پیروی کریں، جس کے بارے میں انہیں قرآن میں بتایا گیا ہے[۱۶:۱۲۳؛۶:۸۹]۔حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں کا ذکر قرآن میں بار بار کیا گیا ہے کیوں کہ ان دونوں کا زمانہ محمد ﷺ کے زمانے سے نسبتاً قریب تر ہے، اور انہیں ماننے والے یہود و نصاریٰ عرب میں رہتے تھے۔اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں کا بالعموم اور ابراہیمی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا بالخصوص مرکزی نکتہ یہی ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس دنیا میں اس کی ہدایت کی پیروی کرو اور مرنے کے بعد اللہ کے سامنے جواب دہی ہونے پر یقین رکھو۔عرب میں رہنے والے یہودیوں کے بارے میں قرآن کے تنقیدی بیانات ان کے اپنے عمل اور رویے کے تعلق سے ہیں جب کہ ان کے پاس آئے پیغام کی اہمیت وتقدس پر قرآن میں زور دیا گیا ہے: ''اور یہ تم سے (اپنے مقدمات) کیونکر فیصل کرائیں گے جب کہ خود اُن کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے (یہ اُسے جانتے ہیں) پھر اس کے بعد اُس سے پھر جاتے ہیں اور یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے، بے شک ہم نے ہی تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔۔۔''[۵:۴۳ تا ۴۴]؛ (ہاں) پھر (سن لو کہ) ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تھی تا کہ اُن لوگوں پر جو نیکوکار ہیں نعمت پوری کر دیں اور (اس میں) ہر چیز کا بیان (ہے) اور ہدایت (ہے) اور رحمت ہے تا کہ (ان کی اُمت کے) لوگ اپنے رب کے روبرو حاضر ہونے کا یقین کریں''[۶:۱۵۴]۔

حضرت عیسیٰ کی طرح ان کی والدہ، ان کی قوم، ان کی تعلیمات اور ان پر نازل ہوئی کتاب اور ان پر ایمان لانے والے ان کے ساتھیوں اور پیروکاروں کا ذکر بھی قرآن میں موثر انداز سے کیا گیا ہے[۳:۳۳ تا ۵۵؛۱۹:۱۶ تا ۳۴؛۵۷:۲۷؛۶۱:۱۴]۔ان کی معجزانہ پیدائش کو بھی تاکیداً بیان کیا گیا ہے، اور اپنے پیغام کے تئیں ان کی ثابت قدمی، انبیاء میں ان کے ایک خاص مقام، اور ان کی ممتاز شخصیت اور کردار کو بھی قرآن میں پیش کیا گیا ہے[۳:۴۵ تا ۴۶، ۴۹، ۵۵؛ ۱۹:۲۹ تا ۳۳]۔حضرت عیسیٰ کو اللہ کا کلمہ کہا گیا ہے جسے ان کی والدہ مریم کی طرف القاء کیا گیا اور اللہ کی طرف سے ایک روح کہا گیا ہے[۴:۱۷۱]۔مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان حضرت عیسیٰ سے متعلق ان حقائق اور معجزات کے بارے میں اختلاف نہیں جن سے ان کی شخصیت کا خاص امتیاز قائم ہوتا ہے بلکہ حضرت عیسیٰ کی ماہیت و کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے کیوں کہ مسلمان ان کے بشر ہونے میں یقین رکھتے ہیں اور ساتھ ہی انبیاء کی تاریخ میں ان کے ایک خاص مقام اور امتیازی شان کے قائل ہیں اور ان کی معجزاتی پیدائش پر ایمان رکھتے ہیں[۳:۵۹؛۴:۱۷۱ تا ۷۲؛ ۵:۱۱۶ تا ۱۱۹؛۱۹:۳۴ تا ۳۶]۔لیکن حضرت عیسیٰ کے بارے میں مسلمانوں کا موقف یہودیوں کے موقف سے بالکل مختلف ہے[۴:۱۵۶ تا ۱۵۸]، باوجود اس کے کہ دونوں ان کے انسان ہونے کو ہی مانتے ہیں۔

مسلمان دوسروں سے ان کے ایمان وعقیدے کے لحاظ سے برتاؤ نہیں کرتے، اور نہ کرنا چاہئے، بلکہ ان کے عمل کی وجہ سے کرتے ہیں۔قرآن یہ سکھاتا ہے کہ ہر آدمی کو اس کی استطاعت، خوبیوں اور اعمال کے حساب سے ہی برتا جائے، قطع نظر اس کے کہ اس کا عقیدہ کیا ہے۔غیر مسلم اپنے رویے وسلوک اور خصوصیات میں سب ایک سے نہیں ہوتے اور قرآن نے اہل کتاب کے بارے میں کہا ہے: ''اور اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اُس کے پاس (روپوں کا) ڈھیر رکھ دو تو تم کو (فورا) واپس دے دے اور کوئی اس طرح کا ہے کہ اگر اُس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اُس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں''؛ اور ''یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں، ان اہلِ کتاب میں کچھ لوگ (اللہ کے حکم پر) قائم بھی ہیں جو رات کے وقت اللہ کی آیتیں پڑھتے اور (اُسکے آگے) سجدے کرتے ہیں۔(اور) اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور اچھے کام کرنے کو کہتے اور بُری باتوں سے منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں اور

یہی لوگ نیکو کار ہیں۔ اور یہ جس طرح کی نیکی کریں گے اُس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہی ''[۳:۱۱۳ تا ۱۱۵] دوسری طرف خود مسلمانوں میں ایسے ظالم لوگ ہو سکتے ہیں جن سے مسلمانوں کو مزاحمت کرنا پڑتی ہے، اس کے باوجود کہ وہ ایک ہی عقیدے کے لوگ ہوتے ہیں: ''۔ اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادہ کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے''[۴۹:۹]۔

ایسے لوگوں کے معاملے میں جو ابراہیمی سلسلے سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ دیوی دیوتاؤں میں یقین رکھتے ہیں، یا وہ لوگ جو پوری طرح ملحد ہوں ان سب کے بارے میں قرآن یہ اصول دیتا ہے کہ ہر فرد کے عقیدے اور ایمان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فیصلے کے دن کرے گا، جیسا کہ اوپر مذکور آیت ۲۲:۱۷ سے اشارہ ملتا ہے۔ وہی ہے جو کسی فرد کے پورے حالات سے باخبر ہوتا ہے چاہے وہ نفسیاتی حالت ہو، عقلی ہو، سماجی ہو یا اور کوئی ''وہ ہر چیز سے خبردار ہے''؛ ''وہ اُن کی چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے''[۱۱:۵]۔ اس کے علاوہ یہ کہ کوئی فرد باہری دباؤ سے کتنا آزاد ہے اور اپنا فیصلہ لینے کی اہلیت اس میں کتنی ہے اس کے مطابق فیصلہ کرنا بھی اس کے اصول انصاف کے عین مطابق ہے، وہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے''[۲:۱۸۶]، اور کسی بھی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے اپنی مرضی میں آزاد ہونا بھی ضروری ہے۔

مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ لوگوں سے انصاف اور مہربانی کے ساتھ پیش آئیں چاہے ان کا مذہب اور عقیدہ کچھ بھی ہو، جب تک کہ وہ ان پر کوئی ظلم نہ کریں۔ وہ لوگ بھی جنہیں مسلمان آج اپنا دشمن مانتے ہیں، لیکن انھوں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے، مسلمانوں کی امن پسندی اور اچھے برتاؤ کے نتیجے میں کل ان کے دوست ہو سکتے ہیں،[۶۰:۷ تا ۸]۔ مسلمانوں کو دوسروں کے خلاف کوئی معاندانہ بات یا حرکت نہیں کرنی چاہئے تاکہ کسی جھگڑے میں پڑنے سے وہ بچیں اور مزید لوگ اس میں ملوث نہ ہوں اور معاملہ آگے نہ بڑھے کہ اسے سلجھانا مشکل ہو جائے اور دین و ایمان کو اس سے زک پہنچے۔ مسلمانوں کو ہمیشہ اس نفسیاتی اور سماجی حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہئے جس کی طرف قرآن بار بار انہیں توجہ دلاتا ہے کہ ''لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی اور دنیا کا مال و متاع خوش نما بنا دیا گیا ہے''[۲:۲۱۲؛ ۳:۱۴؛ ۶:۱۰۸، ۱۲۲؛ ۱۰:۱۲؛ ۱۳:۳۳؛ ۴۷:۱۴]۔

ایک دوسرے کے ساتھ ایمان داری اور مہربانی سے پیش آنا، اور مادی و سماجی حالات کو بہتر بنانے اور تمام بنی آدم کی زندگی کو باوقار بنانے کے باہمی مفاد کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا امن کے قیام، باہمی افہام و تفہیم اور لگاؤ پیدا کرنے اور خیر سگالی کا ماحول بنانے کے لئے سب سے اچھی زبان ہوگی۔ مزید برآں، ہر انسان، خواہ اس کا مذہب آج کچھ بھی ہو، اپنے اندر صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کا ایک روحانی داعیہ رکھتا ہے جو قرآن کے مطابق اس میں ودیعت کیا گیا ہے، اور اس طرح ہر آدمی ہر وقت مستقبل میں ایمان لانے کا امکان رکھتا ہے: ''اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی اُن کی پیٹھوں سے اُن کی اولاد نکالی تو اُن سے خود اُن کے مقابلے میں اقرار کرا لیا (یعنی اُن سے پوچھ لیا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہم گواہ ہیں (کہ تو ہمارا رب ہے یہ اقرار اس لئے کرایا تھا) کہ قیامت کے دن (کہیں یوں نہ) کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی''[۷:۱۷۲]۔ اس نقطہ نظر سے ہر دوسرا آدمی، چاہے مومن ہو یا نہ ہو، مشترک انسانی خصوصیات کی بنیاد پر ہم سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب بہر حال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں اور ایک اللہ پر ایمان رکھنے والے دوسرے لوگوں اور خاص طور سے ابراہیمی سلسلے کے لوگوں کے درمیان ایک خاص تعلق کو کم کر کے دیکھا جائے۔

اہل کتاب سے قریبی تعلق: ایک دوسرے کا کھانا حلال اور اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنا جائز

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵

آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کو حلال ہے اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہلِ کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جب کہ اُن کا مہر دے دو اور اُن سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی۔ اور جو شخص ایمان سے منکر ہو اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔ (۵:۵)

انسانوں کے درمیان مشترک قدروں، ان میں پیدا کئے گئے تنوع اور ان کے روحانی وجود پر توجہ دلانے سے آگے بڑھ کر قرآن مسلمانوں کو مزید یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں اور ان کی عورتوں سے شادی کر کے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔

اہل کتاب

اس میں کوئی شک نہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں قرآن نے ان یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت کے زمانہ میں موجود تھے، اس کے باوجود کہ قرآن میں بیان کردہ اسلامی عقائد سے ان کے عقائد اور طور طریقے مختلف تھے۔ قرآن نے اللہ اور اس کے دین نیز اللہ کے سامنے جواب دہی پر ایمان کی بنیاد پر اہل کتاب کو ایک خصوصی درجہ میں رکھا ہے، لہٰذا اس جازت کو مشرک عورتوں سے شادی کرنے کی ممانعت پر منطبق کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جن کے بارے میں ممانعت اس سے پہلے نازل ہوئی آیت [۲:۲۲۱] میں آچکی ہے۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں اہل کتاب کی خاص حیثیت کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ حیثیت ان لوگوں سے ممتاز ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پیغام پر ایمان نہیں رکھتے اور ایک اللہ پر ایمان کی بھی مشترک بنیاد نہیں رکھتے [۳:۱۸۶؛ ۲۲:۱۷؛ ۹۸:۱]؛ مذکورہ بالا آیت ۵:۵ جو آیت ۲:۲۲۱ کے بعد نازل ہوئی تھی ایک مسلمان مرد اور ایک اہل کتاب عورت کے درمیان شادی کی اجازت دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابہ جیسے خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ نے، طلحہ ابن عبید اللہؓ نے اور حذیفہ بن یمنؓ نے اہل کتاب عورتوں سے شادی کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی بیوی عیسائی قوم سے تھیں اور باقی دونوں صحابہ کی بیویاں یہودی خواتین تھیں۔

اہل کتاب کا کھانا جو کہ مسلمانوں کے لئے حلال کیا گیا ہے اس میں ان کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی شامل ہے اور غالباً اولین طور سے یہی مراد بھی ہے، کیوں کہ مسلمانوں کو جانور ذبح کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ اجازت انہی چوپایوں کے کھانے کے لئے ہے جن کا گوشت کھانا شریعت میں جائز ہے، اور اس کا مطلب کسی بھی طرح سے خنزیر کا گوشت کھانا نہیں ہو سکتا۔ کھانے و پینے کے لئے ممنوعہ چیزیں جیسے مردار،

خون اور شراب [۲:۱۷۳؛ ۵:۳، ۹۰ تا ۹۱؛ ۶:۱۴۵؛ ۱۶:۱۱۵] ، اس اجازت میں شامل نہیں ہوسکتیں۔ مسلمان اہل کتاب کا کھانا کھا لیتے ہیں اور خاص طور سے ان کے ہاتھ کا ذبیحہ یعنی گوشت اگر وہ کسی ممنوعہ جانور کا نہ ہو، وہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ کھلانے سے گریز نہیں کرتے اور انہیں کھانے میں شریک ہونے کے لئے بلانے سے ہچکچاتے نہیں ہیں۔ اہل کتاب عورتوں کے حقوق جن سے مسلمان شادی کریں اسی طرح محفوظ کئے جائیں گے جس طرح مسلم بیویوں کے حقوق ہیں، اور اوپر مذکورہ آیت میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ ان کا مہر اور ایک حلال و جائز نکاح کے لئے شریعت کے جو بھی تقاضے ہیں وہ سب پورے کئے جائیں گے۔

اہل کتاب بیویوں کے حقوق

مسلمانوں کی بیویاں بننے والی اہل کتاب عورتوں کے حقوق اور ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو مسلمان بیویوں کی ہیں لیکن اس پر مستزاد انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہبی حقوق سے بھی مستفید ہوسکتی ہیں۔ پہلے یہ تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ فقہاء کے درمیان یہ بحث رہی ہے کہ اہل کتاب بیویوں کو اسلام کی طرف بلانا کیا جبر کی ایک قسم ہے جسے منع کیا گیا ہے [۲:۲۵۶] ، اور جن فقہاء نے اہل کتاب بیویوں کو اسلام کی طرف بلانے کو ضروری یا صحیح مانا ہے وہ بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ عمل کسی بھی قسم کے دباؤ سے یا ازدواجی تعلقات کے بے جا استعمال سے بچا ہوا ہونا چاہئے۔ اہل کتاب عورت اپنے معبد میں جاسکتی ہے اور اگر اس کی حفاظت کے لئے ضروری ہو تو اس کا مسلم شوہر بھی اس کی ہمراہی کے لئے جاسکتا ہے۔ ایک عیسائی عورت اپنے ساتھ صلیب (کراس) یا اپنی کتاب مقدس رکھ سکتی ہے اس اجازت کی رو سے کہ ایک مسلمان مرد اہل کتاب عورت سے شادی کرسکتا ہے اس صورت میں کہ بت پرستی کی کوئی علامت اس کے عمل میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ بات اگرچہ اس کی غذائی عادتوں (شراب نوشی یا خنزیر کھانا) کے لئے بھی صادق آتی ہے لیکن اس کی غذائی عادتیں اگر مسلم شوہر اور بچوں کے عقیدے اور ان کے حقوق میں حارج ہوں گی تو اس خلاف ورزی کی اجازت اسے حاصل نہیں ہوگی۔ [چنانچہ عملی طور پر یہ دشوار معاملہ ہے کہ ایک مسلمان شوہر کسی کتابی قوم کی عورت سے شادی کرے اور وہ عورت شراب اور خنزیر جیسی اشیاء کا ذوق رکھتی ہو تو اس صورت میں دونوں میں سے کسی ایک کے حقوق کے خلاف ورزی نہ ہو اور ایسا ازدواجی جوڑا اپنی اپنی آزادیوں اور پابندیوں کے ساتھ ایک ہم آہنگ خاندان بنا سکے، اس لئے مسلمانوں کا عمومی عمل کسی غیر مسلم عورت سے شادی نہ کرنے کا رہا ہے اور عملی زندگی کے لئے یہی مناسب ہے، البتہ استثنائی معاملوں کے لئے یہ قرآنی اجازت ایک اصولی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ مترجم]

انصاف اور مہربانی:

سماج اور ملک میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے لئے ایک لازمی ضابطہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ

تمھارے لئے ان میں (یعنی حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں) بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ سے ملنے کی اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو، اور جو کوئی روگردانی کرے تو اللہ بھی بے پروا ہے اور خود اپنے آپ میں لائق حمد و ثنا ہے۔ عجب نہیں کہ اللہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تم دشمنی رکھتے ہو دوستی پیدا کردے، (کیوں

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

کہ) اللہ (ہر چیز پر) قادر ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
(۶۰:۶ تا ۷)

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

تو (اے محمد ﷺ!) اسی (دین کی) طرف (لوگوں کو) بلاتے رہنا اور جیسا تم کو حکم ہوا ہے (اسی پر) قائم رہنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور کہہ دو کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال (کام آئیں گے) اور تمہارے لئے تمھارے اعمال (کا بدلہ ہوگا)، ہم میں اور تم میں کچھ بحث وتکرار نہیں اللہ ہم (سب) کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (۴۲:۱۵)

دوسروں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات استوار ہونے کی بنیاد نہ صرف انصاف ہے بلکہ نرمی اور مہربانی کا رویہ بھی اس کی بنیاد بنتا ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کی بنیادیں ہیں بلکہ خود مسلمانوں کے آپس کے تعلقات میں بھی اور ملک و دنیا کے ساتھ بھی ان کے تعلقات کی بنیاد بنتے ہیں جب تک کہ مسلمانوں کے خلاف دوسرے لوگ کوئی جارحانہ حرکت نہیں کرتے، ان کے خلاف جنگ نہیں چھیڑتے، انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل نہیں کرتے یا ایسے کسی جارحانہ حملے کے لئے کسی کی مدد نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے ساتھ مستقل طور سے رہنے والے ''دوسرے'' لوگوں کے لئے ''ذمی'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کا مطلب ہے ''وہ لوگ جن کے تحفظ اور جن کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہو''۔ یہ ایک تاریخی اصطلاح ہے اور نبی کریم ﷺ کی ان احادیث میں استعمال ہوئی ہے جن میں خود کو مسلمانوں کے اختیار میں دینے والے لوگوں سے کئے گئے وعدے کو پوری ایمان داری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن اس اصطلاح کا مقصد مسلمانوں کے ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کے لئے قرآن وسنت کی رو سے ایک الگ مستقل قانونی حیثیت (یا شناخت) قائم کرنا نہیں ہے۔ فقہی مباحث میں ذمیوں کو دارالاسلام میں رہنے والے مسلمانوں کے برابر مانا گیا ہے [الکسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، قاہرہ: ۱۳۲۷ ہجری، جلد ۵: ص۔ ۲۸۱؛ الزرکشی، شرح الصیار الکبیر بقلم محمد ابن الحسن الشیبانی، حیدرآباد، ہند: ۱۳۳۵ ہجری، جلد ۵: ص۔ ۵۱۶]۔ ہمارے زمانے میں 'سٹیزن' (شہری) کی جو جدید اصطلاح رائج ہے اسے اس کی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے یہ ایک لازمی بات ہے کہ جدید زمانے میں کسی انسان سے اخلاقی طور سے پیش آنا قانونی طور سے مساوی ہونے کا بدل نہیں ہوسکتا اگرچہ یہ بات بار بار ثابت ہوچکی ہے کہ، جہاں کہیں بھی تفریق کی روایت چلی آرہی ہے، اخلاقی عہد اور احساس کے بغیر سماج میں حکام کے ذریعہ قانونی مساوات قائم نہیں کی جاسکتی۔

انسانی حقوق، خاص طور سے انسان کے سیاسی حقوق

کسی مسلم مملکت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مساوی حقوق اور ذمہ داریوں کے تعلق سے ایک معروف اصول یہ ہے کہ ''ان کے حقوق بھی وہی ہیں جو ہمارے ہیں، اور ان کی ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو ہماری ہیں''۔ ممتاز حنفی فقیہ الکسانی (متوفی ۵۸۷ ہجری بطابق ۱۱۹۰ عیسوی) نے اپنی اہم کتاب البدائع میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ ''وہ اگر ذمی ہونے کا معاہدہ قبول کرتے ہیں تو انہیں یہ بتادو کہ ان کے بھی وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں، اور ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو مسلمانوں کی ہیں''، لیکن احادیث کی مشہور کتابوں میں ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی۔ تاہم اس کا مطلب فقہی لحاظ سے قابل قبول ہے۔ حضرت علی کا ایک قول ہے کہ ''انھوں نے محض اپنی املاک کو ہماری املاک کی طرح محفوظ کرنے کے لئے ذمی بننا منظور کیا ہے'' [سنن دار قطنی، دہلی: ۱۳۱۰ ہجری، جلد ۲: ص۔ ۳۵۰]۔ ایسا ہی ایک اور قول ''املاک اور حقوق'' میں مساوات پر زور دیتا ہے [الزرکشی، شرح الصیار الکبیر، جلد ۳: ص۔ ۲۵۰]۔ معروف فقیہ الاوزاعی نے شام کے عباسی گورنر کو، جو کہ عباسی خاندان سے ہی تعلق رکھتے تھے، لکھے اپنے ایک طویل خط میں کچھ ذمی افراد کے قصور کی وجہ سے انفرادی طور پر ان سے نمٹنے کے بجائے تمام ذمیوں کے خلاف لئے فیصلوں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں لکھا تھا کہ کسی مسلم مملکت میں غیر مسلم ذمی غلام نہیں ہوتے ہیں بلکہ آزاد ہوتے ہیں، جن کے حقوق ان کا ذمہ لینے کے وعدے کی رو سے محفوظ ہیں [ابوعبید القاسم ابن سلام، الاموال، قاہرہ: ۱۹۷۵، ص۔ ۲۲۲]۔

آیت ۵:۵۱، ۵۷ تا ۵۸ جیسی آیات جن میں مسلمانوں سے عیسائیوں اور یہودیوں کو ''اولیاء'' نہ بنائے جانے کو کہا گیا ہے اس کا مطلب ''دوست'' بنانے سے نہیں ہے جیسا کہ بعض ترجموں اور تفسیروں میں اس اصطلاح کا ترجمہ کیا گیا ہے، بلکہ عقیدے اور عمل کے معاملے میں ''سرپرست'' بنانے سے ہے جو انہیں دھمکی یا لالچ سے اسلام یا مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے خلاف کسی کام پر مجبور کریں۔ ممتاز مفسر الطبری (متوفی ۳۱۰ ہجری بمطابق ۹۲۲ عیسوی) کی تفسیر میں یہ ظاہر ہوتا ہے لیکن البیضاوی جیسے بعد کے مفسرین نے اس سے اختلاف کیا ہے [متوفی ۷۹۱ ہجری بمطابق ۱۳۸۹ عیسوی]۔ اچھے تعلقات رکھنے اور دوستی کا رویہ رکھنی کی تاکید ایسے تمام لوگوں کے لئے ہے جو مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہ رکھتے ہوں اور مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحیت نہ کریں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں [۹:۷، ۶۰:۷ تا ۸]، جب کہ ان لوگوں سے ایسے تعلقات قائم کرنے سے بچنے کو کہا گیا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے دشمنی کی ہو اور ان کے خلاف جنگ چھیڑی ہو چاہے وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں [۹:۱۳، ۶۰:۷، ۹:۴۹]۔ اور مسلمانوں سے بغض اور کھلی دشمنی رکھنے والوں کے سلسلے میں مسلمانوں کو آئندہ یہ امید رکھنی چاہئے کہ وہ امن کی طرف لوٹ سکتے ہیں اور ان سے دوستانہ تعلق قائم ہو سکتے ہیں [۶۰:۷]۔ چنانچہ، آیات ۵:۵۱، ۵۷، ۵۸ میں اولیاء کا مطلب مخصوص اہل کتاب کو دوست بنانے کی ممانعت سے لینا اس کے تاریخی اور قانونی اسباب تک محدود ہے، جیسا کہ آیت ۵:۵۷ تا ۵۸ سے ظاہر ہے۔ ''جنھوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے ۔۔۔۔ اور جب تم لوگ نماز کے لئے اذان دیتے ہو تو یہ اُسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں''۔ آیت ۵:۵۲ اس دشمنی اور ٹکراؤ کے ماحول کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے لئے یہ ممانعت آئی ہے: ''جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے تم انہیں دیکھو گے کہ ان میں دوڑ دوڑ کے ملے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے سو قریب ہے کہ اللہ فتح بھیجے یا اپنے ہاں سے کوئی اور امر (نازل فرمائے) پھر یہ اپنے دل کی باتوں کو جو چھپایا کرتے تھے پشیمان ہو کر رہ جائیں گے''۔ اصول الفقہ میں یہ بات معروف ہے کہ دنیا کے معاملات میں قانون وجود اور عدم وجود کی علت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے [دیکھیں تفسیر المنار میں ان آیات کی تشریح، جلد ۶: ص۔ ۴۲۳ تا ۴۳۲]۔

اظہار اور اجتماع کا حق

قرآن کے اس اصول کی رو سے غیر مسلموں کے لئے عقیدے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی کو یقینی بنایا گیا ہے: ''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے'' [۲:۲۵۶]۔ اہل کتاب کے لئے اظہار اور اجتماع کے حقوق محفوظ کئے گئے ہیں جن کا عقیدہ اور تعلیمات ان سے یہ تقاضا کرتی ہیں کہ معروف کاموں کا حکم دیں اور منکرات سے منع کریں [۳:۱۱۳ تا ۱۱۴، ۵:۷۸ تا ۷۹]۔ جہاں تک دوسروں کا معاملہ ہے تو ان کا بھی یہی حق ہے جب تک کہ ان کی سرگرمیوں سے اللہ پر ایمان اور اخلاقی قدروں پر کوئی حملہ نہ ہوتا ہو اور اہل ایمان کو اکساتے نہ ہوں۔ غیر مسلم افراد اور گروہوں کے سیاسی حقوق کو بھی وہاں تک محفوظ کیا گیا ہے جہاں تک کہ وہ سماج کی اخلاقی بنیاد کو مضبوط کرتے ہوں اور اخلاقی قدروں پر عمل کرتے ہوں۔

عوامی ادارے

جہاں تک عوامی اداروں کا معاملہ ہے تو رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں سے راستہ بتانے، عربی لکھنا سکھانے اور فوجی معاملوں میں مدد کرنے کی خدمات لی ہیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ اور اطراف میں رہنے والے غیر مسلموں سے کئے گئے معاہدے ''میثاق مدینہ'' کی رو سے مدینہ کے یہودیوں کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ کسی بیرونی حملے کی صورت میں شہر کا دفاع کرنے میں حصہ لیں گے، اور مدینہ کے داخلی انتظامات میں بھی انہیں شامل کرنے کی اجازت دی گئی تھی، یا اسلامی ریاست کی ماتحتی میں خود مختاری دی گئی تھی [دیکھیں عبدالملک ابن ہشام کی سیرت رسول اللہ، قاہرہ: ۱۳۳۶ تا ۱۳۷، جلد ۲، ص۔ ۱۱۹ تا ۱۲۳؛ ابوعبید القاسم ابن سلام، قاہرہ، ص۔ ۱۱۶ تا ۱۱۷]، الماوردی، مشہور شافعی فقیہ نے لکھا ہے کہ ایک غیر مسلم ذمی کو ریاست کے بہت سے منصبوں پر مقرر کیا جا سکتا ہے اور وہ خلیفہ کا ''وزیر تنفیذ'' (ایگزیکیوٹیو منسٹر) بھی بن سکتا ہے۔ الماوردی نے اپنی فقہی اصطلاحوں میں ایک اور اونچے منصب کے لئے ''وزیر تفویض'' (جسے مکمل اختیارات حاصل ہوں یعنی وزیر اعظم) کی اصطلاح استعمال کی ہے، جس کے لئے انھوں نے وہ تمام لیاقتیں تجویز کی ہیں جو خود خلیفہ کے منصب کے لئے ضروری ہیں بشمول اجتہاد کی لیاقت ہونے کے، جو کہ کسی غیر مسلم میں نہیں ہو سکتیں اور کسی غیر مسلم سے مطلوب بھی نہیں ہیں کہ وہ اسلام میں ہی یقین نہیں رکھتا ہے، اور ایک غیر مسلم سے اس کی لیاقت کا تقاضا کرنا خود اس کے اپنے مذہبی حقوق کی خلاف ورزی کا موجب ہوگا۔

ابھی حال حال تک بھی مختلف ملکوں میں اداروں کی (اجتماعی) حکمرانی کے بجائے افراد کی حکمرانی تھی۔ اب جدید زمانے میں جس طرح لوگوں کو حکمراں افراد کے بجائے حکمراں اداروں کا وسیلہ حاصل ہے، تو جس طرح ''سیپریشن آف پاور'' اور ''چیکس اینڈ بیلنس'' جیسے اصول آج پائے جاتے ہیں اسی طرح جدید اسلامی فقہاء کو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے معاملہ میں انسانی حقوق اور مساوات کے اصولوں کو منطبق کرنے سے گریزاں نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ خاص منصبوں کے لئے جیسے مسلمانوں کے عائلی اور مذہبی معاملات کا فیصلہ کرنے والے جج کا منصب ہے جس کا مسلمان ہونا ضروری ہے، کچھ استثنائی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح کے استثنائی التزامات قانون میں کئے جا سکتے ہیں، یا روایت اور رواج کے اوپر انہیں چھوڑا جا سکتا ہے جن پر فطری طور سے انصاف اور شرافت کے قانونی و اخلاقی اصولوں لاگو ہوں گے۔

سول، کمرشیل، لیبر، ٹیکسیشن، ایڈمنسٹریشن اور اسی طرح کے دنیاوی معاملات جن کی اپنی ایک عام انسانی نوعیت ہے، اور انصاف کی اخلاقی بنیاد، دیانت داری، ایمان داری اور مہذب ہونے کی شرائط درکار ہیں جن پر تمام انسان متفق ہیں، مختلف مذہبوں سے وابستہ جج ان معاملات سے متعلق منصبوں پر مقرر ہو سکتے ہیں، اگر وہ اس کی اہلیت رکھتے ہوں اور ملک کے قانون کا علم نیز قانون کے احترام کا جذبہ رکھتے ہوں۔ حتیٰ کہ تعزیری قوانین کے میدان میں بھی، مختلف مذہبوں کے جج اس ضابطے کی پیروی کر سکتے ہیں جو جرم، اس کی سزا، شہادت اور طریقہ کی وضاحت پر مشتمل ہو۔ اس طرح کے معاملوں میں غیر مسلم منصب بردار شریعت کے قانون کو ملک کے قانون کی حیثیت سے تسلیم کریں گے، جب کہ مسلمانوں کا تو یہ ایمان بھی ہے کہ ان قوانین کا سرچشمہ ہدایت الٰہی ہے۔ اس طرح کے دنیاوی اعمال میں، آج کے زمانے کی کسی مسلم ریاست کو یہ دیکھنا چاہئے کہ شرعی قوانین کے عمومی اہداف اور مقاصد کیا ہیں، لیکن اس کے لئے معتبر اور مستند اہل علم کی اجتہادی آراء کے مطابق ہی عمل کیا جائے گا جس میں پورے سماج کے عمومی مفاد کو پیش نظر رکھا گیا ہو۔ قانون سازی اور ان کا نفاذ مسلمان اور غیر مسلموں دونوں کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ لازمی طور سے انصاف، مفاد عامہ اور عقل عام کے اصولوں پر ہی مبنی ہیں۔ فوج میں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے آغاز اسلام سے ہی مل کر کام کیا ہے، جیسا کہ فقہی مباحث سے معلوم ہوتا ہے [مثلاً طبری، اختلاف الفقہاء: دی بک آف اجتہاد اینڈ جزیہ اینڈ احکام الحاربین، ایڈ۔ جوزف اسکاٹ لیڈین: ۱۹۲۳، ص۔ ۲۱؛ الماوردی، الاحکام، ص۔ ۶۰ تا ۱۴۰]۔ مسلم ریاست جن مقاصد کے لئے قائم ہوتی ہے اس کے تئیں مسلمان اپنے مذہبی فریضے کو محسوس کریں اور دشمنوں سے اس کی حفاظت کرنے پر کمر بستہ رہیں، جب کہ دوسرے لوگ اپنے وطن کے تئیں اپنے مادی اور جذباتی تعلقات سے تحریک پائیں گے اور وطن کی حفاظت کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں گے، لیکن دونوں کو ہی ملک، باشندگان ملک اور ریاست کے تئیں اپنی مشترک ذمہ داریوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہوگا، بھلے ہی دونوں کی اخلاقی اور تصوراتی بنیادیں الگ الگ ہو سکتی ہیں۔ کسی بھی ملٹری رینک کے لئے مساوی حقوق اور ذمہ داریاں عام اصولوں کے مطابق اخلاقی اور مادی لحاظ سے طے کی جائیں گی۔

الماوردی نے دوسرے عوامی اداروں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے لئے غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) سے کام لیا جا سکتا ہے جیسے ملٹری فورسز، زکوٰۃ کی وصولیابی جب کہ وہ طے شدہ ہو، مسلمانوں اور غیر مسلموں سے ٹیکس وغیرہ کی وصولیابی اور مختلف شعبوں کے ملازمین کے نظم و ضبط کا ادارہ (ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ) وغیرہ [الاحکام السلطانیہ، قاہرہ: ۱۹۷۳، ص۔ ۲۷، ۶۰، ۱۱۶، ۱۳۰، ۱۵۲، ۲۰۹]۔ اگر اس طرح کے متعدد اور مختلف منصبوں کے لئے غیر مسلموں کو اُس وقت (ماوردی کے زمانے میں) مجاز مانا گیا تھا، تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انہیں اس گزرے زمانے میں بھی مسلم ریاست و حکومت کے معاملات سے الگ نہیں رکھا گیا تھا، اور اس زمانے میں اگر کچھ غلط ہوا ہے تو وہ کچھ خاص نفسیاتی اور ثقافتی وجوہات سے تھا نا کہ قرآن و سنت کے اصولوں کی رو سے تھا، جن میں مسلمانوں کو ہمیشہ یہی تعلیم دی گئی کہ دوسروں کے ساتھ انصاف اور احسان کا معاملہ کیا کریں۔ عملی طور سے بات کی جائے تو غیر مسلم افراد کو مسلم حکومتوں نے تاریخ کے ہر دور میں منصبوں اور ملازمتوں پر فائز کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کچھ غیر مسلموں کو کلرک اور اکاؤنٹنٹس کے طور پر مقرر کیا تھا۔ اموی خلیفہ معاویہؓ کا ایک نائب عیسائی تھا، اور بعد میں سلیمان بن عبدالملک نے فلسطین کے رملہ شہر میں تعمیرات کے کام کی نگرانی کے لئے ایک عیسائی فرد کو مقرر کیا تھا۔ عباسی حکومت میں اور اندلس کی حکومت میں ٹیکس کی وصولیابی کے لئے، میئر کے عہدے کے لئے اور وزارتی منصبوں پر بھی بعض منصب بردار غیر مسلم تھے [البلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۵۹، ص۔ ۴۷۲، ۴۷۹: نیز دیکھیں اے ایس ٹریٹن کی 'دی کیلف اینڈ دیئر نان مسلم سبجیکٹس، لندن: ۱۹۷۰؛ اندلس کے لئے دیکھیں لطفی عبدالباری، الاسلام فی الہسپانیہ، قاہرہ: ۱۹۶۹، ص۔ ۳۳ تا ۳۴]۔ سوئس تاریخ

نویس آدم میز نے حیرت انگیز طور سے مسلم ریاستوں میں غیر مسلم عہدے داروں اور نظم عامہ کے ملازموں کی ایک بڑی تعداد کا ذکر کیا ہے [الحضر الاسلامیہ فی القرآن، الربیع، البجری، عربی ترجمہ بقلم محمد عبدالہادی ابوردا، بیروت: ۱۹۶۷، جلد ۱، ص۔ ۱۰۵ تا ۱۹۹۷؛ اندلس کے لئے دیکھیں لطفی عبدالباری، بیروت، ص۔ ۳۳ تا ۳۴]۔

گواہوں کے طور پر بھی قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان برابری کا اشارہ دیا ہے: ''۔۔۔ وصیت کے وقت تم (مسلمانوں) میں سے دو مرد عادل (یعنی صاحبِ اعتبار) گواہ ہوں یا اگر (مسلمان نہ ملیں اور) تم سفر کر رہے ہو اور (اس وقت) تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو کسی دوسرے مذہب کے دو (شخصوں کو) گواہ (کر لو)۔۔۔۔'' [۵:۱۰۶] یہ اصول قرآن کی کسی اور آیت سے ٹکراتا نہیں ہے، اس لئے اسے ایک عام اصول کے طور پر لیا جا سکتا ہے، جس سے ایسے خاص معاملوں کو الگ رکھا جائے گا جو مذہب سے متعلق ہوں۔ ایک معاصر فقیہ محمد سلام مذکور نے بجا طور پر اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ بعض قرآنی آیتوں سے بالعموم گواہوں کے لئے، ان کے دین وعقیدے کی تاکید کے بغیر، مطلوبہ صفات کا اشارہ ملتا ہے، جیسے آیت ۲:۲۸۲ اور ۶۵:۲ جو عام لین دین سے متعلق ہیں، جبکہ آیت ۶۵:۲ گواہ کے مسلمان ہونے کی تاکید کے ساتھ ہے کیوں کہ یہ آیت طلاق سے متعلق ہے جو کہ مسلمانوں کا ایک خالص عائلی معاملہ ہے اور دین سے وابستہ ہے۔ ایک اور معاصر فقیہ عبدالکریم زیدان اس وسعت (یا میرے خیال میں عمومیت) کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایسے سول اور کمرشیل ٹرانزیکشن کی اجازت کا ایک منطقی نتیجہ دیکھتے ہیں جس میں مسلمانوں کا ہونا شرط نہیں ہے، گواہی کے لئے اجازت کی ضرورت ممکنہ طور سے ایسے معاملے میں پیش آئے جس میں صرف غیر مسلمان ہی حاضر ہوں۔ اگرچہ معروف فقیہ ابن القیم نے اس وسعت کی اصولی طور سے تائید نہیں کی ہے تاہم انھوں نے اپنی کتاب ''الطروق الحاکمیہ'' میں آیت ۵:۱۰۶ پر اپنے دلائل دیتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک عام اصول کی بنیاد بنتا ہے جب تک قرآن (یا سنت) میں اس کا رد نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ گواہی ایک کلمہ ہے جس سے صداقت کی پہچان ہوتی ہے اور حق واضح ہوتا ہے''، اور یہ کہ ''غیر مسلم کی گواہی میں صداقت کی علامتیں ہو سکتی ہے اور اس لئے اسے قبول کرنا چاہئے اور اسے عمل میں لانا چاہئے'' [عبدالکریم زیدان، احکام الذمیین والمستمنین، بیروت، ص۔ ۶۸ تا ۶۹]۔

شہری حقوق: سماجی واقتصادی حقوق اور ریاست کی ملازمتیں

مسلم ریاست میں غیر مسلموں کو مکمل شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں، اور حقوق وذمہ داریوں میں وہ مسلمانوں کے برابر ہی ہوتے ہیں، سوائے اس کے کہ انہیں خنزیر کا گوشت کھانے اور شراب پینے کی مخصوص طور پر اور محدود اجازت ہوتی ہے جو کہ مسلمانوں کے لئے ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ڈھال ایک یہودی کے پاس رہن رکھی تھی۔ مسلمان اور غیر مسلم صرف ان کاروباری سرگرمیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہو سکتے ہیں جن کی شریعت میں اجازت ہے، جبکہ غیر مسلم سور کے گوشت اور شراب جیسی چیزوں کی تجارت میں خود آپس میں ہی ایک دوسرے سے ساجھے داری کر سکتے ہیں کہ ان کے لئے اس کی اجازت ہے جبکہ مسلمانوں کے لئے یہ ممنوع ہے۔ اسلامی شریعت اور مسلم عدالتیں ان معاملات میں فیصلہ دیتی ہیں، لیکن غیر مسلموں کے مذہب سے متعلق معاملوں میں فیصلہ ان کے اپنے فرقے کا جج ہی کر سکتا ہے جس میں اس عہدہ کی ضروری لیاقت موجود ہو۔ امام حنیفہؒ نے جو کہ حنفی فقہ کے بانی ہیں غیر مسلم کے خصوصی حالات کا لحاظ یہاں تک رکھا ہے کہ کسی مسجد کی تعمیر ومرمت کے لئے یا حج کے سفر کے لئے اگر غیر مسلم نے کسی کے حق میں کوئی وصیت کی ہو یا عطیہ دیا ہو تو اسے

عمل میں نہیں لا یا جائے گا تا کہ اس کی مذہبی آزادی بنی رہے کیوں کہ اس کے مذہب میں نماز اور حج کو خیرات کا درجہ حاصل نہیں ہے جب کہ غیر مسلم کی وصیت یا عطیہ چرچ کے کاموں کے لئے یا اس کے مذہب میں تسلیم کئے گئے کسی کام کے لئے فقہاء کے نزدیک برحق ہے۔ بہرحال، اسلام میں اور زیادہ تر مذاہب میں جو کام ممنوع ہیں اور نامعقول ہیں ان کے لئے وصیت یا عطیہ کو عمل میں نہیں لا یا جائے گا۔ جیسے تجہیز گری اس کی ایک مثال ہے [زیدان، احکام، ص۔ ۳۹۵ تا ۴۰۹، ۴۴۳ تا ۴۵۲]۔

سرکاری خدمات جیسے سڑکوں کی تعمیر، سینچائی، معاشی اور سماجی ترقی کی اسکیموں، صحت عامہ، تعلیم، عوامی تحفظ وسلامتی اور دیگر ضروری خدمات مسلمان اور غیر مسلم سبھی انجام دے سکتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث میں ہے کہ ''پانی، گھاس اور آگ (جیسے عام قدرتی وسائل) میں سب شریک ہیں'' مسلمان افراد یا حکام کی طرف سے غیر مسلموں کو نقصان پہنچانے والی کسی حرکت سے غیر مسلموں کو اسلامی شریعت میں، عدالت میں اور حکومت میں تحفظ فراہم کیا گیا ہے [ابو یوسف، الخراج، قاہرہ: ۱۳۹۷ ہجری، ص۔ ۱۰۷]۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک غریب یہودی کنبہ کے لئے مستقل وظیفہ جاری کیا تھا [ابو عبید القاسم ابن سلام، الاموال، ص۔ ۲۷۳، ۲۸۷ تا ۲۹]۔ امام ابو حنیفہ کے ساتھی اور حنفی فقہ کی تشکیل میں حصہ لینے والے فقیہ محمد الحسن نے روایت کیا ہے کہ قیام مدینہ کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں قحط پڑنے پر وہاں کے غریبوں کے لئے امداد بھیجی تھی، جب کہ اہل مکہ رسول اللہ سے حالت جنگ میں تھے [جلد ۱: ۱۴۴]۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں کچھ عیسائیوں کو کوڑھ کے مرض میں مبتلا دیکھا تھا تو ان کے لئے پھر مستقل وظیفہ جاری کر دیا تھا۔ [البلاذری، فتوح، ص۔ ۱۳۵]، اور یہی معاملہ ایک بوڑھے یہودی کے حق میں بھی کیا تھا [ابو یوسف، الخراج، ص۔ ۱۳۶]۔ حضرت خالد بن ولید نے جب حیرہ کو فتح کیا تھا اور وہاں کے لوگوں سے امن کا معاہدہ کیا تھا، تو اس کی اطلاع انھوں نے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کو بھیجی: ''اور میں نے انہیں تاکید کی کہ جو آدمی کام کرنے سے معذور ہو جائے، یا شدید بیماری کی حالت میں ہو، یا پہلے امیر تھا اور پھر غریب ہو گیا ہو اور لوگوں کی خیرات پر اس کا انحصار ہوا سے ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے، اور اس کی نیز اس کے زیر کفالت افراد کی مدد مسلمانوں کے عوامی خزانے سے کی جائے گی جب تک وہ بلاد اسلام میں رہیں۔'' [ابو یوسف، الخراج، ص۔ ۱۵۶]۔

جس طرح ضرورت پڑنے پر غیر مسلموں کو حکومت کی طرف سے مدد دی جاتی تھی، اس طرح وہ ٹیکس کی ادائیگی کے ذریعے عوامی خزانے کے لئے وسائل فراہم کرنے میں بھی حصہ لیتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے بنی تغلیب کے عیسائیوں سے سماجی بہبود کی رقم (زکوٰۃ) وصول کرنے کا بھی کام کیا جو ایک تاریخی اور فقہی نظیر ہے [البلاذری، ماقبل مذکور کتاب، ص۔ ۱۴۲، ۱۸۵ تا ۸۶؛ ابو یوسف، الخراج، ص۔ ۱۲۹ تا ۱۳۰؛ الماوردی، الاحکام، ص۔ ۱۴۴؛ ابن القیم، احکام اہل الذمہ، بیروت ۱۹۸۱، تعارف مرتب صبح الصالح، جلد ۱، ص۔ ۹ تا ۱۰]۔

دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں قرآن نے مسلم معاشرے اور ریاست کو یہ تاکید کی ہے کہ عدل اور احسان کا رویہ اختیار کیا کریں [۶۰؛ ۸]۔ مشہور مالکی فقیہ شہاب الدین احمد القرافی نے اس مطلوب احسان ومروت کے عمل کے لئے مثالیں دی ہیں: کمزوروں، غریبوں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھنا؛ ان کے ساتھ اچھے انداز سے بات کرنا؛ ان کی مختلف ضرورتوں میں انہیں سنجیدگی سے صلاح دینا؛ ان کی غیر موجودگی میں ان کی عزت کی حفاظت کرنا؛ ان کی املاک، خاندانوں، عزت اور تمام حقوق ومفادات کی حفاظت کرنا؛ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو تو ان کی حمایت میں کھڑے ہونا، اور اپنے تمام حقوق حاصل کرنے میں ان کی مدد کرنا۔ یہ مثالیں یقینی طور سے عدل او راحسان ومروت کی مثالیں ہیں۔ ذمیوں کے ساتھ انصاف اور ان کے تئیں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کی تکمیل کے حوالے سے القرافی نے

لفظ 'ذمہ' کے مطلب کو واضح کیا ہے کہ مسلم ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ مسلمان اور مسلم ریاست لیتی ہے، اس لئے کسی مسلمان کی طرف سے کسی ذمی پر کوئی اخلاقی یا جسمانی حملہ اس وعدہ وعہد کے خلاف ورزی ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول اور دین اسلام نے ذمیوں سے کیا ہے، حد یہ ہے کہ کوئی تکلیف دہ لفظ بھی کسی ذمی کی غیر موجودگی میں یا موجودگی میں اس کے اوپر بولا جائے۔ القرافی اور ابن تیمیہ کے مطابق اگر ذمی پر کوئی دشمن حملہ کرے تو مسلمانوں کو اللہ و رسول اور دین اسلام کی طرف سے لی گئی اس کی ذمہ داری کے عہد کو پورا کرنا ہوگا، اگر ان میں سے کسی کو پکڑ لیا جائے تو مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ جس طرح بھی بس چلے اس کو آزاد کرا کر واپس لائیں [القرافی، الفروق، بیروت، جلد ۳، ص۔ ۱۴ تا ۱۵ ۳؛ نیز دیکھیں ابن تیمیہ کی الرسالہ القبرصیہ، ریاض، ص۔ ۲۶، ۳۱]۔

شافعی اور حنفی مسلک میں یہ عام رائے ہے کہ کوئی غیر مسلم یعنی ذمی اگر کوئی جرم کرتا ہے تو شریعت کے مطابق اس پر انفرادی طور سے مقدمہ چلایا جائے گا، لیکن ایسے قصور کے لئے ذمی کی قانونی حیثیت کسی بھی طرح متاثر نہیں ہوگی خواہ وہ کسی دشمن کے لئے جاسوسی کا ہی مرتکب کیوں نہ ہوا ہو [طبری، اختلاف، ص۔ ۲۴ تا ۲۵، ۵۹؛ الماوردی، الاحکام، ص۔ ۱۴۳، ۱۴۶]۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کوئی مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہو تو شریعت کی رو سے اس کی عام قانونی حیثیت ختم نہیں ہوجاتی، اور جدید سیکولر قوانین میں کوئی مرتکب جرم فرد اپنے انسانی حقوق سے محروم نہیں ہوجاتا، خاص طور سے سیاسی اور سول معاملوں میں۔ یہی پینل لاء اور پروسیجر مسلم ریاست میں تمام شہریوں پر لاگو ہوگا۔ انسانی جان کی حرمت اور مقتول کو مالی معاوضہ، یا قصوروار فریق کو کوئی جسمانی یا اخلاقی سزا کا التزام اس کے مذہب کی وجہ سے حنفی فقہ کی رو سے تو بالعموم متاثر نہیں ہوگا جب کہ دوسرے فقہی مکاتب کے مطابق کچھ مخصوص معاملوں میں نہ ہوگا [دیکھیں زیدان، احکام، ص۔ ۲۰۸ تا ۲۳۰]۔

گزشتہ زمانوں میں کسی فرد کی شہری حیثیت کے تعین میں اور فرد و ریاست کے درمیان تعلقات میں اس کا مذہب اور رہن سہن بنیاد بنتا تھا۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ الگ الگ مذاہب کے لوگوں کے معاملے میں فقہ کے اندر بعض اوقات فرق کیوں نظر آتا ہے۔ ایک بات تو یہ کہ یہ کچھ خاص اور محدود معاملوں میں ہی تھا، اور دوسری بات یہ کہ اس فرق و تفریق کے لئے کوئی متعین آسمانی شہادت نہیں ہے، وگرنہ تمام فقہا کے یہاں اس معاملہ پر اتفاق رائے ہوتا۔ چوں کہ یہ متن وحی کو اس کے مجموعی تناظر میں سمجھنے کی انسانی کوشش کا معاملہ ہے، اور ایک خاص سماجی و ثقافتی ماحول میں ہے، اس وجہ سے یہ فقہی اختلاف رونماء ہوا ہے، اور ان خیالات میں سے جو خیال اسلام میں انصاف کے اصولوں سے قریب ترین ہے ان تک بھی کچھ فقہاء پہنچے ہیں۔ البتہ کسی متن کو سمجھنے کا ہمارا اپنا ایک طریقہ ہوسکتا ہے اور ہم ایک الگ سماجی و سیاسی ثقافت کے زیر اثر ہیں تو ہمارا نتیجہ فکر بھی کچھ مختلف ہوسکتا ہے۔ قرآن و سنت کی تصریحات کو سمجھنے میں اور جن معاملوں میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہے ان کے لئے ضابطہ بنانے میں اجتہاد کی گنجائش اسلامی فقہ کو لگاتار ترقی دینے کا ایک مستقل وسیلہ رہی ہے۔

چوری کے جرم کے لئے قرآن کی متعین سزا [۵:۳۸] اور شادی شدہ افراد کے ذریعہ زنا کے ارتکاب کی سزا جو سنت سے ثابت ہے اس پر ہمیشہ سے اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ یہ بہت سنگین اور شدید ہیں۔ چوں کہ اس جرم کے ثبوت کے لئے اور اس کی سزا جو سنت سے ثابت ہے اور جس کی فقہی تفصیلات ہیں اس کے نفاذ کے لئے مکمل اور شک و شبہ سے بالاتر ثبوت کا فراہم ہونا عموماً مشکل اور بعض اوقات بالکل ناممکن ہے، اس لئے اس کے ثابت ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خطا کار افراد بغیر کسی جسمانی، مادی یا اخلاقی دباؤ کے از خود اس کا اقرار کریں۔ سنت کی رو سے اس طرح کے اعتراف جرم کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، کیوں کہ کسی جرم کی تلافی کی سب سے بہترین

صورت سچے دل سے توبہ کرنا اور آئندہ اس جرم سے باز رہنے کا عزم مصمم ہے، نہ کہ عوام کے سامنے اعتراف کر کے خود کو رسوا کرنا اور اس کی سزا بھگتنا ہے [دیکھیں ابن القیم کی علم الموقعین، قاہرہ، جلد ۴، ص۔ ۳۰۶ تا ۸]۔ چنانچہ، اس طرح کی سزا کا نفاذ بالعموم مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہے، چاہے ملزم مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اگر قرآن ''اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کرنے اور ملک میں فساد بر پا کرنے'' [۵:۳۳] جیسے سنگین جرم کے لئے، جو کہ فساد عام یا انارکی تک پہنچ سکتا ہے، مختلف قسم کی سزائیں تجویز کرتا ہے، سزائے موت سے لے کر جلاوطنی تک جسے بعض فقہاء نے قید میں رکھنے کے مترادف مانا ہے، تو کیا اس سے یہ اشارہ نہیں ملتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان سزاؤں پر پھر سے غور کرنے کی یہ ایک الٰہی رہنمائی ہے؟

آج کی مسلم حکومت میں پینل لاء کے لئے اصل میدان تعزیری قوانین ہوں گے، جن میں جرم اور اس کی سزا مقننہ اور (یا) عدالت کے فیصلے سے، بدلتے ہوئے حالات کے مطابق، طے اور تبدیل کی جاسکتی ہے۔ کسی زمانے میں حکام ایک فعال میکانزم پر عمل کرتے تھے اور ''سیاسہ'' کی اصطلاح کے تحت فقہاء سے مشورہ کیا کرتے تھے، جس کا مطلب تھا نظم عامہ کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق ریاست کی داخلی پالیسی کو لگاتار بنائے رکھنا، جس کے لئے شریعت کے عام اہداف و مقاصد سے رہنمائی لی جاتی تھی [ابن القیم، علم، جلد ۴، ص۔ ۳۰۹ تا ۳۱۳]۔ البتہ یہاں یہ بات نقل کرنا ضروری ہے کہ مالکی فقہاء نے یہ سمجھا ہے کہ زنا کی جو سزا سنت سے ثابت ہے وہ غیر مسلموں پر عائد نہیں ہوگی غالباً اس وجہ سے کہ اس معاملہ کی نوعیت مذہبی ہے۔ مالکیوں کا نظریہ یہ ہے کہ جس فرد پر زنا کا قصور ثابت ہوگا اسے اس کے فرقہ کے حوالے کیا جائے گا تا کہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق اسے سزا دیں۔ جب کہ ابوحنیفہ کا خیال یہ ہے، جس کی تائید دوسروں نے بھی کی ہے کہ اسے کوڑے مارنے کی سزا دی جائے گی [دیکھیں ابن رشد، بدایت المجتہد، بیروت، جلد ۲، ص۔ ۳۲۶؛ الشوکانی، نیل الاوطار، بیروت: ۱۹۷۳، جلد ۷، ص۔ ۲۵۷ تا ۲۵۸؛ زیدان، احکام، ص۔ ۲۵۱ تا ۵۲]۔ پینل لاء کو پبلک لاء اور ریاست کے اختیار و اقتدار کے متعلق سمجھنے کا تصور مسلم فقہاء نے اختیار کیا ہے ایسا نہیں لگتا، اور ان جرائم سے نمٹنے کے لئے بنیادیں مذہبی کردار نے فراہم کی ہیں۔

لباس، سواری اور مکانات وغیرہ سے متعلق بیانات

حضرت عمرؓ سے منسوب ایک تحریری حکم نامہ موجود ہے جس میں ذمیوں کے سلسلے میں کچھ خاص احکامات دئے گئے ہیں جو ان کے لباس، سواری اور مکانات سے متعلق ہیں اور جن کا مقصد انہیں ان پہلوؤں سے مسلمانوں سے الگ پہچان دینا ہے۔ اس طرح کے احکامات کے لئے قرآن و سنت سے کوئی بنیاد فراہم نہیں کی جاسکتی ہے؛ اس کے برعکس قرآن و سنت میں انصاف اور احسان کی جو تعلیمات ہیں وہ اس کے بالکل متضاد ہیں، اور ابن القیم نے ان کی تاویل ایک خاص زمانہ میں مسلمانوں کے مفاد (''المصلحہ'') کی بنیاد پر کی ہے۔ اپنی کتاب ''احکام اہل الذمہ'' میں ابن القیم اپنے زمانے [۷۵۱ ہجری بمطابق ۱۳۵۰ عیسوی] میں مذہبی منافرت و مخاصمت کے ماحول سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، جو کہ صلیبیوں کے لگاتار حملوں اور کچھ ذمیوں کی طرف سے ان کا ساتھ دئے جانے کا نتیجہ ہے۔ ابن القیم جیسے ایک معتبر اسکالر نے جب اس عجیب حکم نامہ کی علت پر بات کی ہے تو یہ اس حکم نامہ کی صداقت و سند کی دلیل بن سکتی ہے، لیکن اصل میں یہ چیز ہمیں مصنف کی نفسیات اور سوچ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے جب کہ خود حکم نامہ کی سند و صداقت کی تائید اس سے کسی بھی طرح نہیں ہوتی۔

مصنف اس بات کے قائل تھے کہ مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر مسلم حکمراں کو یہ حق حاصل ہے کہ صورت حال کے مطابق وہ کوئی قانون بنا سکتا ہے۔

''خلیفہ اور ان کی غیر مسلم رعایا'' (The Caliphs and their non Muslims subjects) نامی اپنی کتاب میں ٹیٹرون نے اس حکم نامہ کی معتربیت پر سوال اٹھایا ہے اور اسلام کے بالکل ابتدائی زمانے سے اس حکم نامے کے منسوب ہونے پر شبہات ظاہر کئے ہیں، اور لکھا ہے کہ البلاذری، الطبری، یعقوبی یا ابن الاثیر جیسے قدیم مورخین نے ایسی کوئی روایت بیان نہیں کی ہے۔ ان مورخین نے شام و عراق کے شہروں کی عوام کے ساتھ معاہدوں کے بارے میں جو مختصر باتیں بیان کی ہیں وہ تو رواداری کی عکاسی کرتی ہیں، اس کے برعکس جو کہ ہم اس مبینہ دستاویز میں پاتے ہیں۔ صبح الصالح نے بھی یہی نتیجہ فکر بیان کرتے ہوئے اس پر مزید تنقید کرتے ہوئے اس کے حضرت عمر سے منسوب ہونے کے ثبوت پر سوال اٹھایا ہے اور محدثین نے روایتوں کی چھان بین اور سند کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کے لحاظ سے یہ بحث کی ہے کہ اس حکم نامے سے متعلق جو مختلف روایات ہیں ان کے متن میں معقولیت اور درستگی کا فقدان ہے اور اس میں متضاد فرق و فاصلے ہیں۔ اس مبینہ دستاویز کا ذکر دوسری صدی ہجری کے آخری عرصہ سے پہلے کہیں نہیں ملتا اور یہ بعد کے زمانے کے حالات سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ مسلم ریاست کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے معروف و ممتاز تاریخ داں محمد حمید اللہ نے لباس سے متعلق ایسے احکام و قوانین کو وقتی سماجی اور سیاسی نوعیت کے معاملے قرار دیا ہے نا کہ قرآن و سنت پر مبنی شریعت کا حصہ [صبحی الصالح، انٹروڈکشن ٹو ابن القیم، احکام اہل الذمہ، جلد ۱، ص۔ ۱۳، ۱۵ تا ۱۶، ۲۹ تا ۳۵، ۴۱ تا ۴۶، ۷۱ تا ۷۲؛ محمد حمید اللہ الحید رآبادی، انٹروڈکشن ٹو ابن القیم، احکام اہل الذمہ، ص۔ ۹۴]۔

جزیہ کی ادائیگی

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

جو لوگ اہلِ کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روزِ آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔ (۲۹:۹)

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (۱۹۰:۲)

جزیہ کا ذکر قرآن میں صرف ایک مقام پر سورہ توبہ ۹ کی آیت ۲۹ میں آیا ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی آخری لمبی سورۃ ہے (۱۲۸ آیات والی) اور اس کے بعد ایک بہت ہی مختصر سی سورۃ النصر (۱۱۰) نازل ہوئی۔ سورۃ توبہ نویں ہجری میں غزوہ تبوک کے

آس پاس نازل ہوئی تھی یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات (۱۱ ہجری) سے دو سال پہلے۔

ایت ۹:۲۹ کو قرآن کے مجموعی تناظر میں سمجھا جانا چاہئے۔ کسی کے خلاف جنگ بلا وجہ نہیں چھیڑی جاسکتی، بلکہ یہ دوسروں کے جارحانہ حملوں کے جواب میں ہی ناگزیر ہوتی ہے تاکہ اہل ایمان اور ان کے حقوق کی حفاظت ہو اور عقیدے کی آزادی حاصل رہے [۲۲:۳۹ تا ۴۰؛ ۲:۱۹۰ تا ۱۹۴؛ ۴:۷۵؛ ۸:۶۱ تا ۶۲]۔ اس کے علاوہ یہ کہ جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہ رہے ہوں یا مسلمانوں کے تئیں امن کا رویہ رکھتے ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ ان کا مذہب اور عقیدہ الگ ہے ان کے خلاف جنگ نہیں چھیڑی جاسکتی؛ بلکہ جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ امن کا رویہ رکھتے ہوں ان کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے گا، اور جنگ صرف جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہی جائز ہے [۶۰:۸ تا ۹]۔ دوسروں پر اس بات کے لئے کسی بھی طرح سے کوئی دباؤ نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ جو عقیدہ رکھتے ہیں اسے چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں، کیوں کہ دین کے معاملے میں کسی جبر و اکراہ کی اجازت نہیں ہے [۲:۲۵۶؛ ۱۰:۹۹؛ ۱۱:۲۸؛ ۵۰:۴۵؛ ۸۸:۲۱ تا ۲۲]۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بندوں کو پیغام دینے کے لئے بھیجا نہ کہ اسے تھوپنے اور جبراً منوانے کے لئے، اور انسانوں کے عقیدے و اعمال کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کرے گا جو تمام انسانوں کے تمام حالات سے باخبر ہے اور سب کے ساتھ معاملہ ان کی استطاعت و لیاقت کے مطابق ہی کرے گا [۳:۲۰؛ ۵:۹۲، ۹۹؛ ۱۳:۴۰؛ ۱۴:۵۲؛ ۱۶:۳۵، ۸۲؛ ۲۴:۵۴؛ ۲۹:۱۸؛ ۳۶:۱۷؛ ۴۲:۴۸؛ ۶۴:۱۲]۔

کسی آیت کی تنسیخ کا دعویٰ تب تک نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کے متضاد کسی دوسری آیت کے ساتھ اس کی تطبیق کا کوئی راستہ اور قرینہ ہی نہ ہو، یا اس آیت کو کسی خاص واقعہ یا صورت حال سے متعلق نہ مانا جائے کہ جس سے ایک عام حکم پر زد نہ آتی ہو۔ قرآن کی شرح و تفسیر سے یہ بات ثابت ہے اور فقہ میں بھی اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں جزیرۃ العرب کے عرب باشندوں کے لئے خصوصی احکامات ہیں جنہیں عموم نہیں دیا جاسکتا۔ عرب میں بسنے والے اہل کتاب کو غالباً ریاست کے اقتدار کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر جزیہ دینے پر راضی ہونا تھا۔ اس معاملہ میں جو حکم ان پر نافذ کیا گیا جو کہ آیت ۹:۲۹ سے ظاہر ہے وہ عقیدے کی وجہ سے یا عقیدہ بدلنے کے لئے نہیں نافذ کیا گیا تھا بلکہ خراج کی ادائیگی کا حکم تھا، اور یہ محض ایک سیاسی مصلحت تھی، اور یہ جبر عقیدے کی وجہ سے قطعاً نہیں تھا۔ یہ آیت خراج ادا کرنے کا حکم دیتی ہے، مذہب بدلنے کا حکم نہیں دیتی، اور یہ بات صاف طور سے قابل فہم ہے کہ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی رہبری میں عرب میں ابھرنے والی مرکزی ریاست کے معاملہ سے متعلق اور محدود ہے، یہ کوئی عام اصول نہیں ہے۔ اس بات کی تائید صاغر (مطیع) ہوجانے کی بات سے ہوتی ہے جس کا تعلق جزیہ سے ہے اور آیت کی تشریح یہی کی گئی ہے کہ اسلام کے اقتدار اور اس کے قانون کو تسلیم کرنا [الماوردی، ایضاً، ص۔ ۱۴۳؛ ابن القیم، احکام اہل الذمہ، جلد ۱، ص۔ ۲۳ تا ۲۴]۔ ایک سیاسی اقتدار کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر خراج دینے کی پابندی اسلام سے پہلے بھی پوری تاریخ میں حکمرانوں کے یہاں رہی ہے۔، اور عرب کے لوگ جو کہ فارس اور روم کی بازنطینی شہنشاہیوں کے قریب میں رہتے اور بستے تھے ان سلطنتوں میں رائج اس رواج کو جانتے تھے، اگرچہ وہ خود کبھی جزیہ دینے پر مجبور نہیں ہوئے تھے۔ لیکن، اس عام خیال کے مطابق کہ قرآن میں کوئی تنسیخ نہیں ہوئی ہے، آیت ۹:۲۹ کو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے ساتھ رکھ کر سمجھنا چاہئے، اور اس بات کو سامنے رکھ کر کہ اہل کتاب کے ساتھ جنگ کا یہ حکم صرف ان لوگوں پر ہی عائد ہوگا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحیت اور جنگ کریں گے۔

علاوہ ازیں آیت ۹:۲۹ / اہل کتاب کے بارے میں اور ان لوگوں کے بارے میں جن سے مسلمانوں کو جنگ کرنے کو کہا گیا ہے

کچھ خاص شرائط کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ ''اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روزِ آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دینِ حق پر چلتے ہیں۔۔۔''۔اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان سے تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے ان کی طرف بھیجے نبیوں اور کتابوں کے ذریعہ جو کچھ ان کے لئے ممنوع قرار دے دیا اسے ممنوع سمجھیں، شریعت محمدی میں حرام کی گئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنا یہاں مراد نہیں ہے، کیوں کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر تو مسلم یعنی فرماں بردار ہی ٹھہریں گے۔لہذا، مسلمان اگر محض اس بنیاد پر کسی سے جنگ کریں تو یہ اللہ کے پیغام کو مسترد کرنے کے مترادف ہوگا اور اس طرح وہ خود اپنے مذہب کے خلاف ورزی کے قصوروار بنیں گے۔

اگرچہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جنہیں ''پہلے کتاب دی گئی تھی''، لیکن معروف مفسرین قرآن اور فقہاء کرام (مثلاً مالک اور الاوزاعی وغیرہ) نے اسے عام طور سے سبھی طرح کے غیر مسلموں کے لئے لیا ہے اس بنیاد پر کہ قرآن کی اصطلاحوں کو صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے استعمال اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ اس زمانے میں عرب کے لوگوں کا واسطہ ان سے ہی تھا۔مزید برآں، قرآن صابئین اور مجوسیوں کا بھی ذکر کرتا ہے [۲:۶۲؛ ۵:۶۹؛ ۲۲:۱۷] اور رسول اللہ ﷺ نے خود مجوسیوں سے معاملہ کیا ہے [القرطبی، تفسیر ۹:۲۹، جلد ۸، ص۔۱۱۰؛ تفسیر المنار، جلد ۱۰، ص۔۳۳۲، ۳۴۰، ۳۵۹ تا ۶۰ (بروایت ابن قدامہ، المغنی)۔

کچھ حنفی فقہاء نے جزیہ کو ذمیوں کے دفاع اور جہاد وغیرہ جیسی خدمات سے انہیں بری رکھنے کا بدل بھی مانا ہے [القرطبی، جلد ۸، ص۔۱۱۴؛ نیز تفسیر المنار، جلد ۱۰، ص۔۳۴۶ تا ۴۷]، کیوں کہ غیر مسلم اس طرح کی ذمہ داریوں کو اپنے عقیدے اور مذہب کے خلاف سمجھ سکتے ہیں۔محمد اسد نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''اسلامی ریاست میں، ہر صحت منداور اہل مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لے جب کبھی بھی اس کی مذہبی آزادی یا مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کو خطرہ درپیش ہو: بہ الفاظ دیگر، ہر صحت مند مسلمان لازمی فوجی خدمات انجام دینے کا ذمہ دار ہے۔چوں کہ یہ بنیادی طور پر ایک مذہبی ذمہ داری ہے، غیر مسلم شہری جو کہ نظریہ اسلام کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، ان سے اس ذمہ داری کو مناسب طریقے سے انجام دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔دوسری طرف، انہیں پورا تحفظ بھی دیا جانا ضروری ہے اور ان کے شہری حقوق اور دیگر مذہبی آزادیوں کی ضمانت بھی اسلام ریاست کو دینا ہے، اس لئے غیر مسلم شہریوں (''اہل الذمہ'' یعنی وہ لوگ جن کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے) پر ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا۔چنانچہ جزیہ فوجی خدمات سے مستثنیٰ کرنے کے عوض نیز ان کو حفاظت کی ضمانت دئے جانے کے عوض ایک ٹیکس ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔(یہ اصطلاح 'جزا' لفظ سے نکلی ہے جس کا مطلب عوض اور بدلہ ہی ہوتا ہے)۔جزیہ کی کوئی متعین شرح نہ قرآن نے طے کی ہے، نہ رسول اللہ ﷺ نے مقرر کی ہے، البتہ تمام روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زکوٰۃ کی شرح سے نسبتاً کم ہوگی جس کی ادائیگی مسلمانوں پر لازم ہے، اور زکوٰۃ چوں کہ مسلمانوں کے لئے ایک مذہبی فریضہ ہے اس لئے اسے غیر مسلموں پر عائد نہیں کیا جاسکتا۔۔۔اسی طرح ایسے تمام غیر مسلم شہری جو اپنے کیفیت کی بنا پر فوجی خدمات دینے سے معذور ہوں انہیں رسول اللہ ﷺ کے واضح احکامات کی بنیاد پر جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے جیسے: (۱) تمام خواتین، (۲) وہ مرد جو ابھی جوان نہیں ہوئے، (۳) عمر دراز لوگ، (۴) تمام بیمار یا معذور لوگ، (۵) پادری اور پجاری لوگ؛ نیز وہ تمام غیر مسلم بھی جو رضا کارانہ طور سے فوجی خدمات انجام دیں جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھے گئے ہیں'' [دی میسیج آف قرآن، آیت ۹:۲۹ پر حاشیہ نمبر ۴۳، ص ۲۶۲]۔

تاریخی نظیروں سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔مسلمانوں کی فتوحات کی تاریخ لکھنے والے معروف مورخ البلاذری نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں نے جب کبھی بھی اپنی زمین کی حفاظت میں حصہ لیا، تو ان سے جزیہ نہیں لیا گیا، جیسے فلسطین میں السامرہ اور لبنان میں الجراجمہ کی فتوحات کے

موقع پر ہوا[ایضاً،ص۔ ۱۶۲ تا ۱۶۴]۔ جب بلاد اسلام کے ایک حصہ پر بازنطینی حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے اپنی تمام افواج کو وہاں لگادیا اور حمص کا دفاع کرنے کی حالت میں وہ نہیں رہے تو انھوں نے جزیہ کے طور پر جو رقم وہاں کے لوگوں سے وصول کی تھی وہ انہیں واپس کردی[ایضاً،ص۔ ۱۴۳]۔اسی طرح کے واقعات مشرقی علاقوں (عراق، ایران، آرمینیا اور آذربائیجان وغیرہ) کی فتوحات کے سلسلہ میں الطبری نے بیان کئے ہیں[تاریخ،لیڈین،ص۔ ۲۶۵۸، ۲۶۶۵ تا ۶۶]۔

اس قرآنی آیت کی رو سے، جزیہ کی ادائیگی مالی حالت کی بنیاد پر ہی کی جائے گی[الماوردی، الاحکام،ص۔ ۱۴۳؛ تفسیر المنار، جلد ۱۰، ص۔ ۳۴۲]۔جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا، صاغرون (مطیع) ہونے کا لفظ جو اس آیت میں میں آیا ہے وہ اسلامی ریاست کے اقتدار اور قانون کے مطیع ہوجانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے[الماوردی، الاحکام،ص۔ ۱۴۳؛ ابن القیم، احکام اہل الذمہ، جلد ۱،ص۔ ۲۳ تا ۲۴]۔چوں کہ ذمیوں کو یہ عہد دیا گیا کہ ان کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے حقوق محفوظ رہیں گے اس لئے انہیں ملک کے اندر یا باہر سے کسی بھی خطرے یا حملے کی صورت میں پورا تحفظ دینے کی ذمہ داری بھی مسلم ریاست پر ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا گیا ہے۔خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ بات ثابت ہوئی کہ فوجی خدمات دینے کے صلہ میں جزیہ کی ادائیگی سے، یا اور کسی قسم کی ادائیگی، جیسے زکوٰۃ سے جو کہ بنی تغلیب نے ادا کی تھی، مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ایک نظیر ہیں۔ان تمام تفاصیل سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آج کی مسلم ریاست میں جس کے تمام شہریوں پر فوجی خدمات کی ذمہ داری ہو، جزیہ کی گنجائش نہیں ہوگی، اور انسانی حقوق کی حفاظت کرنے اور ذمہ لینے کا مقدس عہد اس بات سے بدل سکتا ہے کہ تمام شہریوں کو برابر کے انسانی حقوق بشمول سیاسی وشہری حقوق، دئے جائیں۔

دنیا میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات

دیکھیں باب آٹھ: شریعت ۲: ''عالم گیر تعلقات''

خاندان

کنبہ بنانے کا فطری انسانی میلان

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اوّل) اسی سے اس کا جوڑا بنایا پھر اُن دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو، جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو اور رشتہ ناطہ جوڑتے ہو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ (۱:۴)

بائبل میں حضرت آدم اور ان کی زوج کی تخلیق کا جو بیان ہے قرآن اس کی تائید نہیں کرتا ہے۔ یہ آیت تمام انسانوں، مردوں و عورتوں، کو خطاب کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ دونوں مجموعی طور سے ایک ذی حیات وجود 'نفس' سے پیدا کئے گئے جس سے دونوں صنفوں مذکر اور مونث کی اصل کا پتہ چلتا ہے۔ مرد اور عورت کا ایک دوسرے کا زوج بننا عین انسانی فطرت ہے، اور اس جبلی تعلق سے نسل انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے، نسل انسانی جاری رہتی ہے، اور دونوں صنفوں کی کثیر تعداد پوری دنیا میں پھیلتی چلی جاتی ہے۔ البتہ انسان کو اپنی ابتداء اور اپنے خالق یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے جس کی ہدایت و رہنمائی سے ہر فرد اپنے حقوق پہچانتا ہے اور دوسروں سے ان کا مطالبہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، جس طرح انسان کو اولین انسان بابائے انسانیت حضرت آدم اور ان کی تخلیق اور ان کے خالق سے باخبر ہونا چاہئے اسی طرح اسے اپنے قریبی رشتے داروں سے، اور پھر پوری انسانی برادری سے اپنے تعلق کو سمجھنا چاہئے، کیوں کہ تمام انسانیت کی ایک ہی ابتداء و ایک ہی اصل ہے اور تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اپنی تخلیق اور اپنے خالق کے بارے میں شعور رکھنے سے ہر انسان اپنے عمل کے بارے میں اتنا محتاط ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایمان داری اور راست بازی پر قائم رہنے کی کوشش کرے، اور انسانی تعلقات اور زیادہ ٹھوس، مضبوط اور ایک دوسرے کا معاون بننے والے ہوں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) ہم نے تم سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے تھے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی دی تھی اور کسی پیغمبر کے اختیار کی بات نہ تھی کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائے۔ (۱۳:۳۸)

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اُسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف (مائل ہو کر) آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی، جو لوگ غور کرتے ہیں اُن کے لئے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ (۳۰:۲۱)

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے یا ان کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عنایت کرتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے؛ وہ تو علم اور قدرت والا ہے۔ (۴۲:۴۹ تا ۵۰)

نوع انسانی اپنے وجود کی ابتداء سے ہی دو صنفوں مذکر اور مونث پر مشتمل ہے۔ اللہ کے پیغمبر بھی ایک انسان ہونے کے ناطے کنبے اور بیوی بچوں والے تھے۔ دونوں صنفوں کے درمیان ایک ایک دوسرے کے تئیں میلان، کشش اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی فطرت ودیعت کی گئی ہے، تاکہ ہر ایک اپنی تکمیل، تسکین اور سہارا دوسرے میں محسوس کرے۔ زوجین کے درمیان جذباتی تعلق کو قرآن سب سے زیادہ عام، مستقل اور بنیادی اصطلاح میں بیان کرتا ہے: ایک طرف جذبات اور دوسری طرف ایک دوسرے کے تئیں ایثار، دیکھ ریکھ اور فکرمندی، اگرچہ جذباتی وابستگی زیادہ خاص ہے۔ بچے پالنا اور ان سے محبت وشفقت کرنا بھی انسانی فطرت کی ایک اور تکمیل ہے۔

ان جذبات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا نہ انہیں غلط سمجھا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ اللہ کے تقویٰ اور ہدایت کے دائرے سے باہر نہ ہوں "لیکن جو لوگ ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں" [۲:۱۶۵، نیز دیکھیں ۹:۲۴]۔ جب یہ توازن بگڑتا ہے اور اخلاقی قدروں نیز اللہ کی ہدایت کے بجائے اہل وعیال ہی تمام معاملات میں فیصلہ لینے کا مرکزی عنوان بن جاتے ہیں تو اس سے انصاف اور صحیح طرز عمل سے انحراف پیدا ہوتا ہے، اور انسان کی خود پسندی اس کی کنبہ پروری وکنبہ نوازی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور اس کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے [۶۴:۱۴ تا ۱۶]

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

روزوں کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی پوشاک ہو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم (اُن کے پاس جانے سے) اپنے حق میں خیانت کرتے تھے پس اُس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمایا اب (تمہیں اختیار ہے کہ) اُن سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لئے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اُس کو (اللہ سے) طلب کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو اور جب مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو اُن سے مباشرت نہ کرو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔ (۲:۱۸۷)

روزے کی حالت میں ایک مسلمان کے لئے کھانا، پینا اور ازواج سے جنسی تعلق قائم کرنا ممنوع ہوتا ہے اور رمضان کے پورے مہینے ایک مسلمان کو صبح سے لے کر شام تک اس پابندی کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ چوں کہ جنسی شہوت اور جنسی تسکین کھانے پینے کی ہی طرح ایک فطری طبعی ضرورت ہے اس لئے اوپر کی آیت میں یہ واضح اجازت دی گئی ہے کہ یہ ضروری اور لازمی تقاضے رات سے صبح تک (افطار کے وقت سے سحری کے وقت تک) پورے کئے جاسکتے ہیں۔ جنسی تسکین فرد اور سماج دونوں کے لئے لازمی ہے اور اسے پورے مہینے تک نظر انداز کرنا یا ضبط کرنا مشکل ہے، اور جنسی تسکین کا جائز طریقہ روزے کی روح یعنی تقوی کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ روزہ جسم کو اذیت دینے کے لئے نہیں ہے، بلکہ ضبط نفس کی ایک تربیت کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لگائی پابندیوں کا مقصد شخصی اور سماجی توازن قائم کرنا ہے، اور اللہ کی تمام تعلیمات انسانی فطرت اور انسان کی حالت صحت سے ہم آہنگ ہیں [۳۰:۳۰]۔ اسی طرح جنسی تسکین ایک جبلی تقاضہ ہے جس سے خاندان وجود میں آتا ہے اور بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک تعمیری قوت ہے، اگر اسے فرد اور سماج کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے صحیح طریقے سے برتا جائے، جس طرح کھانا پینا بھی احتیاط اور حد کے اندر ہی رہ کر ہی مفید ہے۔ روزہ انسان کی قوت ارادی کو مضبوط کرتا ہے اور ضبط نفس کی صلاحیت کو پروان چڑھاتا ہے، انسان اور اس کی جائز جبلی خواہشات کو مارتا نہیں ہے۔ ازدواجی تعلقات اور بچے پیدا کرنا انسانی ضرورت ہیں اور انسانی زندگی کو بنائے رکھنے کے لئے لازمی ہیں۔ عبادت روحانی اور جسمانی ضرورتوں میں توازن برقرار رکھتی ہے، جسم اور جسمانی تقاضوں پر بندش نہیں لگاتی ہے۔ فرد اور سماج کے درمیان اس طرح کا توازن ''امت وسط'' (میانہ روی پر قائم لوگوں) [۲:۱۴۳] کو سامنے لاتا ہے جو اپنی جسمانی طاقتوں کو ترقی دینے کا خیال رکھیں اور انسانی عقل و روحانیت سے خود کو قابو میں رکھیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝۱۸۹

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں ایک شخص سے پیدا کیا اور اُس سے اُس کا جوڑا بنایا تا کہ اُس سے راحت حاصل کرے۔ سو جب وہ اُس کے پاس جاتا ہے تو اُسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور وہ اُس کیساتھ چلتی پھرتی ہے۔ پھر جب کچھ بوجھ معلوم کرتی ہے (یعنی بچہ پیٹ میں بڑا ہوتا ہے) تو دونوں (میاں بیوی) اپنے رب سے التجا کرتے ہیں کہ اگر تو ہمیں صحیح وسالم (بچہ) دے گا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ (۱۸۹:۷)

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِیْنَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ یَكْفُرُوْنَ ۝۷۲

اور اللہ ہی نے تم میں سے تمہارے لئے عورتیں پیدا کیں اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے، تمہیں پاکیزہ چیزیں دیں تو کیا یہ بے اصل چیزوں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں؟ (۷۲:۱۶)

مرد اور عورتیں دونوں کی اصل ایک ہی ہے اور ایک ہی زندہ وجود سے دونوں پیدا کئے گئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے وجود کی تکمیل کرتے ہیں، اور ازدواجی تعلقات کے ذریعہ یہ تکمیل انجام پاتی ہے اور دونوں زوج ایک دوسرے سے تسکین پاتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں اور دل و ماغ کی راحت حاصل کرتے ہیں۔ ازدواجی تعلق کا ذکر آیت ۱۸۹:۷ میں ایک دوسرے سے پوری طرح مل جانے یا ایک کا دوسرے پر چھا جانے (تغشاھا) کے استعارے میں آیا ہے، جو نہ صرف جسمانی وجنسی رابطہ تک محدود ہے بلکہ نفسیاتی وروحانی تعلق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

اس تکمیل اور جذب انجذاب سے ملنے والی مسرت وراحت ان کے مل جانے پر ہی ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ بچوں کی پیدائش و پرورش کے واسطے سے یہ بڑھتی جاتی ہے اور کنبہ بنتا ہے اور کنبہ کے ساتھ رہنا اور زندگی کی ضرورتیں پوری کرنا خود اپنے آپ میں ایک دل چسپ اور محبت سے بھرپور زندگی کا مشغلہ ہے، جو اللہ کے فضل اور اس کی ہدایت سے آسودگی کا باعث بنتا ہے۔ پھر اگر کسی جوڑے کو پوتے پوتیاں یا نواسے ونواسیاں بھی ملتی ہیں تو اس سے نہ صرف نسلی تسلسل جاری رہتا ہے بلکہ زندگی میں ایک نئی امنگ اور روانی آتی ہے۔ بچوں اور پوتوں پوتیوں ونواسوں نواسیوں کو پانے کی خوشی کے ساتھ ساتھ والدین دادادادی کے تعاون سے بچوں کو پالنے پوسنے اور ان کے اندر اللہ کی ہدایت سے ملنے والی اقدار کو فروغ دینے کا کام کرتے ہیں۔ یہ عمل باقاعدہ لیکچر دینے اور بتانے و پڑھانے سے ہی نہیں ہوتا بلکہ بچوں کے ساتھ کھیلنا، بولنا اور انہیں کہانیاں سنانا اس سیکھ کا ذریعہ بنتا ہے اور اس طرح خاندانی اور قومی اقدار بچوں میں پروان چڑھتی ہیں۔

جنسی تسکین اور اس کے بعد بچوں کی پیدائش سے جس کا سلسلہ آگے کی نسل میں بھی جاری رہتا ہے، ہونے والے اس طبعی، نفسیاتی وروحانی ارتقاء سے ہر سمجھ دار انسان کو اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے اور اس کی نعمتوں کا قدردان ہونا چاہئے۔ ایسے لوگ اور ان کے خوش وخرم

خاندان پورے سماج کے لئے نمونہ بنتے ہیں[۲۵:۷۴]۔لیکن ایسے بھی لوگ ہیں کہ ''جب وہ اُن کو صحیح وسالم (بچہ) دیتا ہے تو اُس (بچے) میں جو وہ اُن کو دیتا ہے اُس کا شریک مقرر کرتے ہیں۔ جو وہ شرک کرتے ہیں اللہ تعالیٰ (کا رتبہ) اُس سے بلند ہے۔کیا وہ ایسوں کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور خود پیدا کئے جاتے ہیں۔۱۹۱۔اور نہ ان کی مدد کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں ''[۷:۱۹۰ تا ۱۹۲]۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾

بے شک ایمان والے فلاح پا گئے: جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں، اور جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں؛ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں؛ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے یا (کنیزوں) کے جو اُن کی مِلک ہوتی ہیں کہ (ان کے ساتھ جنسی تسکین کرنے میں) ان پر ملامت نہیں۔اور جو اس کے سوا کچھ اور چاہیں تو وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکل جانے والے ہیں۔ (۲۳:۱ تا ۷)

شرم وحیا اور پاک دامنی ہر اہل ایمان پر لازم ہے، مرد ہو یا عورت۔زوجین ایک دوسرے سے جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں، لیکن شادی کے رشتے کے باہر ہر فرد کو چاہے وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ خود کو کسی بھی جنسی تعلق سے خود کو دور رکھنا لازم ہے۔اسلام ہر اس چیز اور بات پر قدغن لگاتا ہے جو جنسی تحریک پیدا کرنے والی ہو جیسے جسم کی نامناسب نمائش اور بے شرمی، گھورنا اور نامحرم مرد وعورت کا تنہائی میں ملنا وغیرہ۔

آغاز اسلام کے زمانے میں جب غلامی کا رواج عام تھا اور باندیوں کے مالکوں کو ان پر مکمل اختیار حاصل ہوتا تھا، اسلام نے غلامی کے اس رواج کو بتدریج ختم کرنے کی اپنی اسکیم کے تحت، یہ حکم دیا کہ باندی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا صرف شادی کے ذریعہ سے ہی جائز ہے: ''۔۔۔ان باندیوں کے ساتھ اُن کے مالکوں کی اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق اُن کا مہر بھی ادا کر دو بشرطیکہ عفیفہ ہوں۔نہ ایسی کہ کھلم کھلا بدکاری کریں اور نہ در پردہ دوستی کرنا چاہیں۔''[۴:۲۵؛ نیز ۴:۳؛ ۲۴:۳۲]۔اس عام خیال کے برعکس کہ باندی کے ساتھ نکاح اور نکاح کے قانونی لوازمات پورے کئے بغیر جنسی خواہش پوری کرنا مرد مالکوں کے لئے جائز ہے قرآن صاف بتاتا ہے کہ باندی سے نکاح کرنے کے لئے بھی نکاح کے قانونی لوازمات پورے کرنا ضروری ہیں۔

نکاح کے عقد کے ساتھ جنسی تعلق سے قطع نظر، کسی بھی دوسری قسم کا جنسی تعلق اسلام میں حرام ہے۔زنا اور حرام کاری دونوں ہی اسلام میں حرام ہیں اور اگر قانونی طور سے ثابت ہو جائے تو اس کی سزا بھی لازم ہے۔شادی ہونے تک اپنی عفت کی حفاظت کرنا اور پاک دامن رہنا ہر مسلمان پر لازم ہے، مرد ہو یا عورت، اور ماضی کے حوالے سے کہا جائے تو آزاد ہو یا غلام۔غلام کو برابر کے انسان کی طرح ہی برتنے کا حکم دیا گیا ہے، اور انفرادی وسرکاری اقدامات کے ذریعے انہیں آزاد کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، اور اس طرح غلامی کو بتدریج ختم کرنا مقصود تھا۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو نیک ہوں (نکاح کر دیا کرو) اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ اُن کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا اور اللہ (بہت) وسعت والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے۔ (۳۲:۲۴)

یہ آیت پورے سماج کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تمام مجرد افراد کے نکاح کے لئے لازمی وسائل فراہم کریں، چاہے وہ آزاد افراد ہوں یا غلام مرد یا عورتیں۔ اس بات سے پہلے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شادی ہر فرد کی لازمی ضرورت ہے جس کے لئے لازمی وسائل فراہم کرنے کی ذمہ داری پورے سماج پر ہے، چاہے یہ مدد مالی ہو یا اسے کامیاب بنانے کے لئے اخلاقی اور تعلیمی مدد ہو۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی غلام مرد یا عورت سے جنسی تعلق صرف نکاح کے ذریعہ ہی قائم کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی کئی جگہ یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

اور وہ جو (اللہ سے) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ (۲۵:۷۴)

خاندان سماج کی بنیادی اکائی اور مرکزی ادارہ ہے، یہ پہلا میدان ہے جس میں اسلام کا پیغام اور اس کا اصلاحی پروگرام نافذ ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ اچھے افراد اور آپس میں اچھے تعلقات رکھنے والے افراد پر مشتمل خاندان، جو تمام پہلوؤں سے انسانی ضروریات کی تکمیل کرنے والا ہو، پورے سماج کے لئے ایک موثر نمونہ ہوتا ہے۔ اور عقائد و بنیادی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے جس پر اس کے افراد کاربند ہوتے ہیں۔ درج بالا آیت افراد کے لئے خاندان کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے کیوں کہ یہ اس کے لئے قریب ترین کا انسانی سماج ہوتا ہے اور اس بات کا نمونہ ہوتا ہے کہ خاندانی تعلقات میں ظاہری، عقلی، نفسیاتی اور روحانی ہم آہنگی اس کے ہر فرد کے لئے ایک حقیقی لطف و اطمینان کا ذریعہ ہے۔ علاوہ ازیں، ایسا مضبوط اور مسرور و مطمئن خاندان قوت کا ایک لازمی اور ناگزیر ذریعہ ہے، کیوں کہ یہ افراد کو بھی تقویت پہنچاتا اور تحریک دیتا ہے اور پورے سماج کو بھی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

(یعنی) ہمیشہ رہنے کے باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور اُن کے باپ دادا اور بیویوں اور اولاد میں سے جو نیکوکار ہوں گے وہ بھی (جنت میں جائیں گے) اور فرشتے (جنت کے) ہر ایک دروازے سے اُن کے پاس آئیں گے اور (کہیں گے) تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلا ہے اور عاقبت کا گھر خوب (گھر) ہے۔
(۱۳:۲۳ تا ۲۴)

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

اے ہمارے پروردگار! ان کو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور جو ان کے باپ دادا اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے نیک ہوں ان کو بھی بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔ (۸:۴۰)

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ كُلُّ امْرِیٕۢ بِمَا كَسَبَ رَهِیْنٌ ۝

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہِ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی ہم ان کی اولاد کو بھی ان (کے درجے) تک پہنچا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے رہن ہے۔ (۲۱:۵۲)

یہ آیات یہ بتاتی ہیں کہ خاندان اور خاندانی رشتے کے جذبات و احساسات کس قدر فطری، قوی اور پائیدار ہوتے ہیں اور ان کی قوت آخرت میں بھی کارگر ہوتی ہے۔ فرشتے اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے اللہ کا راستہ اختیار کیا ہے انہیں ان کے صالح اجداد کے ساتھ، ان کے ازواج کے ساتھ اور ان کی اولادوں کے ساتھ وابستہ کر دیجئے؛ اور یہ اللہ نے طے فرمایا دیا ہے۔ حشر اور فیصلے کے دن یقینا ہر فرد ذاتی طور سے اپنی نجات کے لئے فکر مند ہوگا ''اس دن بھائی اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا جو اسے (مصروفیت کے لئے) بس کرے گا'' [۸۰: ۳۴ تا ۳۷؛ نیز دیکیں ۷۰: ۱۱ تا ۱۴]۔ لیکن جیسے ہی کسی کو نجات کا اور ہمیشہ کی شادمانی کا پروانہ ملے گا تو اس کے فطری اور ابدی خاندانی جذبات ابھر آئیں گے اور یہ بات ثابت ہوگی کہ یہ احساسات و جذبات زندہ و توانا ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و مہربانی کے ساتھ ان سے پیش آئے گا اور انصاف سے سرمو انحراف نہیں ہوگا؛ اور خاندان کے صالح افراد کو ہمیشہ کے لئے ایک جگہ جمع کر دیا جائے گا۔ یہ والدین کے لئے ایک انعام ہوگا جنھوں نے اپنے بچوں کو حق و صداقت اور اخلاقیات کی تعلیم و تربیت کے ساتھ پروان چڑھایا ہوگا، لیکن خود اولاد بھی اپنا پورا انعام پانے کی مستحق ہوگی، کہ انھوں نے اپنی آزاد مرضی سے صالحیت و نیکی کی ان عظیم قدروں کو اختیار کیا جو ان کے والدین نے انہیں سکھائی تھیں۔

دوسری طرف، والدین اور اولاد کی نافرمانی کی وجہ سے اور غلط راستہ اختیار کرنے کی پاداش میں اس وقت جب کہ خود انبیاء کرام اپنے نافرمان والدین یا نافرمان اولاد کو معاف کئے جانے کے متمنی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا انصاف اس طرح کی جذباتی کیفیت اور طرف داری کا خیال کرنے کی اجازت نہیں دے گا: ''اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا!، اللہ! میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے (تو اُسکو بھی نجات دے) تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بہتر حاکم ہے (تو) اللہ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے وہ تو غیر صالح عمل ہے، جس چیز کی تمہیں حقیقت معلوم نہیں اُس کے بارے میں مجھ سے سوال ہی نہ کرو اور میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادان نہ بنو۔ نوح نے کہا، میرے رب! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی مجھے حقیقت معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا'' [۱۱: ۴۵ تا ۴۷]؛ ''پیغمبر اور مسلمانوں کو شایاں نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہلِ دوزخ ہیں تو اُن کے لئے بخشش مانگیں گو وہ اُن کے قرابت دار ہی ہوں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے بخشش مانگنا تو ایک

وعدے کے سبب تھا جو وہ اُس سے کر چکے تھے لیکن جب اُن کو معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اُس سے بیزار ہو گئے، کچھ شک نہیں کہ ابراہیم بڑے نرم دل اور متحمل تھے''[۹: ۱۱۳ تا ۱۱۴؛ نیز دیکھیں ۱۹: ۴۷]۔ ازواج کے معاملے میں ''اللہ نے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے، دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی تو وہ اللہ کے مقابلے میں ان عورتوں کے کچھ بھی کام نہ آئے اور ان کو حکم دیا گیا کہ اور داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ''[۶۶: ۱۰]۔ قرآن کی ہدایت کے مطابق، کسی شخص کو اپنے ان فطری اور قوی جذبات کی وجہ سے اپنے گھر والوں کو پھر سے باہم مل جانے اور انہیں سیدھے رستے پر چلانے کے لئے اس وقت تک اصرار نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ یہ صاف نہ ہو جائے کہ اس کے عزیز والدین نے یا اولاد نے اپنی مرضی سے، نا کہ جہالت یا غفلت کی وجہ سے، حق کو جھٹلانے اور اس کے خلاف کھڑے ہونے کا راستہ چن لیا ہے اور اللہ کا دشمن بن گیا ہے [دیکھیں ۶: ۳۳؛ ۲۷: ۱۴]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞

مومنو! اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں جو ارشاد اللہ ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (۶۶: ۶)

خاندانی رشتے کے جذبات چوں کہ ہر انسان کی فطرت و جبلت میں موجود ہیں، اس لئے ان جذبات کا تقاضا ہے کہ ہر فرد اپنے گھر والوں کی فکر کرے اور اس دنیا کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کو درست کرے اور انہیں بتائے کہ اس کارخانہ قدرت کے پیچھے کس کی طاقت کارفرما ہے، اور انہیں بنیادی عقائد اور اخلاقی قدروں کی تعلیم دے۔ فرد کی پہلی سماجی ذمہ داری خاندان کے لئے ہے کہ وہ بھی ایک سماج ہے اور جس کے ارکان اس کے قریب ترین لوگ ہیں اور جو پورے سماج کی مرکزی اکائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا پیغام سب سے پہلے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کو پہنچایا، اور پھر اپنے چچازاد بھائی حضرت علی کو دیا جو آپؐ کے ساتھ ہی آپ کے گھر میں رہتے تھے۔ پھر اس کے کچھ عرصے بعد ہی آپؐ کو یہ حکم ہوا کہ اپنے خاندان والوں کو اس کی دعوت دیں: **وانذر عشيرتك الاقربين**، اپنے قریب ترین رشتے داروں کو ڈرایئے''[۲۶: ۲۱۴]۔

نکاح

رشتہ نکاح قائم کرنا: زوج کا انتخاب، معاہدہ، مہر

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا

اور (مومنو) مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں (اُن سے) نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تمہیں کیسی ہی بھلی لگے اُس سے مومن لونڈی بہتر ہے اور (اسی طرح) مشرک مرد جب تک ایمان

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚۖ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

نہ لائیں مومن عورتوں کو اُن کی زوجیت میں نہ دینا کیونکہ مشرک (مرد) خواہ وہ تمہیں کیسا ہی بھلا لگے (اُس سے) مومن غلام بہتر ہے یہ (مشرک، لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔

(۲۲۱:۲)

گھر میں ہم آہنگی کا ماحول بنائے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ زوجین کے درمیان عقلی، روحانی اور عملی لحاظ سے کچھ ٹھوس مشترک بنیادیں ہوں یعنی ان میں یکسانیت ہو۔ یہ چیز خود زوجین کے درمیان بھی اور پھر ان کے بچوں کے ساتھ بھی بہتر تعلقات کے لئے لازمی ہے۔ زوجین کے درمیان شدید قسم کے اختلافات پہلے تو محبت کی تپش سے ماند پڑ جاتے ہیں، لیکن پھر دھیرے دھیرے، جب دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ زندگی گزارنے لگتے ہیں یہ اختلافات ابھرنے لگتے ہیں۔ اور پھر جب بچے سمجھ دار ہونے لگتے ہیں اور وہ ماں باپ کے درمیان چپقلش اور اختلافات دیکھتے ہیں تو وہ بھی متاثر اور پریشان ہوتے ہیں، کیوں کہ ماں باپ اپنے بچوں کے لئے آئڈیل اور نمونہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک اللہ پر ایمان ایک طویل، خوش گوار اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے سب سے اہم قدر مشترک ہے اور یہ چیز خاندان کے اتحاد اور دیرپا ہم آہنگی کے لئے انتہائی اہم ہے، کیوں کہ ازواج اور ان سے بننے والے خاندان میں ہم آہنگی اور سکون ہی نہ ہو تو ایسا نکاح ناکام اور بے مطلب ہوگا۔ درج بالا آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ پائیدار نظریاتی بنیادوں اور مشترک قدروں کو وقتی جذبات اور باہمی کشش کی کیفیت پر فوقیت دینی چاہئے کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ وقتی جذبات اور ظاہری کشش و محبت کو سنگین اور گہرے اختلافات ختم کر دیں گے۔ لہٰذا، ایسا/ایسی زوج جو وہی عقائد رکھتا/رکھتی ہو جو خود اپنے ہیں وہی ایک بہتر شریک حیات بن سکتا/بن سکتی ہے چاہے وہ کم ظاہری کشش رکھتا/رکھتی ہو اور سماجی رتبہ کے لحاظ سے کم تر ہی ہو۔

معروف مفسر قرآن الزمخشری کے مطابق یہ آیت مشترک عقیدے کی بنیاد پر کسی بھی موزوں اللہ کے بندے یا بندی کو نکاح کے لئے ترجیح دیتی ہے، جب کہ دوسرے مفسرین نے اس آیت کی منشاء یہ سمجھی ہے کہ یہ ''مومن غلام (یا باندی)'' کو ترجیح دینے کے لئے ہے۔ تفسیر میں یہ فرق اس وجہ سے ہوا ہے کہ عربی کا لفظ جو غلام کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جو قرآن میں اللہ کے بندے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے وہ ایک ہی ہے۔ اگر بعد والی تفسیر کو مانا جائے تو اس سے آزاد اور غلام مردوں و عورتوں کے درمیان نکاح کا راستہ نکلے گا [نیز دیکھیں ۲۵:۴]، جس کے نتائج غلامی کی کیفیت کے مطابق ملے جلے ہو سکتے ہیں، اور اس کیفیت کو ان اصولوں کے لحاظ جانچا جائے گا جو غلامی کے سلسلے میں اسلام نے دئے ہیں اور غلامی کو ختم کرنے کے لئے اس نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے، جب کہ اسلام کے اصولوں اور حکمت عملی کے لحاظ سے غلامی کو اس وقت کی ایک عارضی اور لائق تبدیل صورت حال ہی سمجھنا ہوگا۔ علاوہ ازیں، یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح کے نکاح سے ہونے والے بچوں پر اس غیر عدم مطابقت کے ناخوش گوار اثرات مرتب ہو سکتے ہیں [۲۵:۴]۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا — آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل

الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵ ع

کتاب کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کو حلال ہے اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہلِ کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جب کہ اُن کا مہر دے دو اور اُن سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی۔ اور جو شخص ایمان سے منکر ہو اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔ (۵:۵)

یہ آیت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام اور ان کے ساتھ اتری اللہ کی کتاب قرآن پر ایمان رکھنے والے لوگوں اور ان لوگوں کے درمیان جن کے پاس پہلے نبی اور کتاب آ چکی تھی، مشترک بنیادوں کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ مشترک بنیادیں اتنی ٹھوس ہیں کہ دونوں طرح کے لوگ ایک دوسرے کا کھانا کھا سکتے ہیں، جب تک کہ دوسروں کے کھانے میں کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو جو اسلام میں صراحتاً حرام ہے، جیسے خنزیر کا گوشت یا شراب وغیرہ [۲:۱۷۳؛ ۵:۳]۔ مالکی مکتبہ فقہ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک اگر کوئی حلال جانور اہل کتاب نے ذبح کیا ہے تو مسلمان اسے کھا سکتے ہیں چاہے ان کے ذبح کا طریقہ جو کچھ بھی ہو [دیکھیں محمد عبدہٗ اور رشید رضا، تفسیر المنار، جلد ۶، ص۔ ۱۹۶ تا ۲۱۹]۔ مل کر خاندان بنانا اور بچے پالنا مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان مشترک بنیادوں کا ایک اور ثبوت ہے، کیوں کہ اہل کتاب کی عورت سے نکاح کرنا ایک مسلمان مرد کے لئے جائز ہے، اور ایک قانونی شادی کے لئے درکار تمام قانونی اور اخلاقی لوازم اہل کتاب عورت سے شادی کے لئے بھی پورے کئے جائیں گے ''جب کہ اُن کا مہر دے دو اور اُن سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی''۔ اہل کتاب لوگوں کی نوعیت ان لوگوں سے بالکل الگ ہے جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جن سے شادی کرنا مسلمانوں کے لئے ممنوع ہے، اور جو ''دوزخ کی طرف بلاتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے [۲:۲۲۱]۔ اگرچہ قرآن حضرت عیسیٰ کو خدائی کا مقام دینے یا خدا کا بیٹا قرار دینے یا تین خداؤں میں سے ایک ماننے کو پوری طرح مسترد کرتا ہے [۴:۱۷۱؛ ۵:۱۷، ۷۲ تا ۷۳؛ ۹:۳۰ تا ۳۱]، لیکن قرآن نے انہیں کہیں بھی مشرکین میں شمار نہیں کیا ہے، یا انہیں ان لوگوں کی طرح نہیں سمجھا ہے جو اللہ کی وحدانیت کا اور یوم آخرت کا انکار کرتے ہیں یعنی کفار۔ قرآن ہمیشہ صاف طور سے یہ اشارہ کرتا ہے کہ اہل کتاب خود اپنے آپ میں ایک الگ گروہ ہیں، اور ان کے ساتھ دینی و اخلاقی مشترک بنیادوں کو اجاگر کرتا ہے جو ان میں اور مسلمانوں میں مشترک ہیں اور جنہیں ان میں سے بہت سے لوگ اپناتے ہیں اور عملاً برتتے بھی ہیں [۳:۱۱۳ تا ۱۱۵]۔

[نوٹ: یہاں قارئین کتاب کو سورۃ النساء کی آیت ۱۵۰ تا ۱۵۱ کو پیش نظر رکھنا چاہئے جس میں اللہ نے واضح طور سے فرمایا ہے کہ ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں ہم بعض نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض نبیوں کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ درمیان کا ایک راستہ پکڑ لیں، وہ لوگ بالیقین کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے [۴:۱۵۰ تا ۱۵۱]۔ مترجم]

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تمہیں چھوڑ دیں تو اُسے ذوق وشوق سے کھالو۔ (۴:۴)

اسلام میں شوہر کے ذمہ ہے کہ وہ بیوی کو مہر ادا کرے، یعنی اس سے نکاح کرنے کی اپنی سچی خواہش کی علامت کے بطور کچھ پیش کرے، اور اس بات کی علامت کے طور پر کہ وہ بیوی کے اخلاقی اور مادی حقوق وہ ادا کرے گا۔ یہ مہر جو کہ شوہر کو اپنی خوشی سے پیش کرنا ہوتا ہے وہ ایک جائز شادی کے لئے اسلام میں قانونی طور سے لازم ہے اور یہ بیوی کی ملکیت ہوجاتا ہے جس پر اسے اپنی مرضی سے تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ مہر کی رقم کتنی ہو یہ دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا ہے اور قرآن نے اس کے لئے کوئی تخمینہ یا پیمانہ مقرر نہیں کیا ہے [۴:۲۰]۔ البتہ رسول اللہ صاحب کی احادیث یہ بتاتی ہیں کہ مہر ایک آہنی انگوٹھی بھی ہوسکتی ہے یا قرآن کی تعلیم دینا بھی ہوسکتی ہے اگر بیوی اسے مہر کے طور پر قبول کرے۔ بیوی اپنی مرضی اور خوشی سے مہر کا کچھ حصہ معاف بھی کرسکتی ہے، یا مہر کی علامت کے طور پر کوئی دوسری چیز بھی قبول کرسکتی ہے۔ پھر اگر وہ کسی موقع پر کسی وجہ سے طلاق لینا چاہے تو وہ مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر اپنی مرضی سے واپس بھی کرسکتی ہے، اور اس طلاق لینے (خلع) کی وجہ عورت کا اپنا موڈ اور مرضی ہی ہوسکتی ہے، شوہر کی طرف سے کسی بدسلوکی، ناانصافی یا اسے چھوڑ دینے جیسی حرکت سے عاجز آکر طلاق لینے پر مجبور ہونا نہ ہو [۴:۱۲۸]۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ۝۱۹ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝۲۰ وَ كَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ۝۲۱

مومنو! تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور (دیکھنا) اس نیت سے کہ جو کچھ تم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے کچھ لے لو انہیں (گھروں میں) مت روک رکھنا۔ ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں (تو روکنا نامناسب نہیں) اور اُن کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کردے۔ اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت کرنی چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اُس میں سے کچھ مت لینا۔ بھلا تم ناجائز طور پر اور صریح ظلم سے اپنا مال اُس سے واپس لوگے؟ اور تم دیا ہوا مال کیونکر واپس لے سکتے ہو جب کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے عہدِ واثق بھی لے چکی ہیں۔ (۴:۲۱)

خواتین کو اپنی مرضی کے خلاف وصیت لکھنے پر مجبور کرنا یا اپنے مہر میں سے کچھ واپس کرنا، یا انہیں بیوہ ہوجانے کے بعد کسی خاص آدمی سے شادی کرنے پر مجبور کرنا، اس طرح کی تمام نقصان دہ اور ناانصافی پر مبنی باتیں خانگی زندگی کے جوہر کے خلاف ہیں جو کہ زوجین

کے درمیان باہمی محبت اور باہمی مساوات سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ اگر بیوی کو شوہر سے ناانصافی کی شکایت ہو تو وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے شوہر کو عدالت کے روبرو بھی بلا سکتی ہے، لیکن قرآن میں شوہروں کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی ناانصافی نہ کریں تاکہ خاندان کے نجی معاملات لوگوں کے سامنے آ ہی نہ پائیں۔ شوہر سے ملنے والے مہر پر عورت کا پورا حق ہے اور یہ شادی کے وقت ہی شوہر پر واجب ہو جاتا ہے اور اسی وقت ہی دے دینا چاہئے، چاہے نکاح کا رشتہ کامیابی کے ساتھ مستقل قائم رہے یا درمیان میں کسی وجہ سے ختم ہو جائے۔ جو مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیں انہیں قرآن اپنی بیوی کے ساتھ اپنے تعلق کی یاد دلاتا ہے اور انہیں کسی بھی قسم کی ناانصافی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ نکاح کے تمام اخلاقی، جسمانی قانونی حوالوں سے تعلق نکاح کا بیان کرنا بہت اہم بھی ہے اور موثر بھی۔

کچھ مفسرین نے قبل از اسلام کے عرب میں اس چلن کا ذکر کیا ہے کہ کسی آدمی کے مرنے پر اس کے قریب ترین رشتے دار کو یہ حق تھا کہ وہ اس کی بیوہ کو بھی وراثت میں حاصل کر لیتا تھا۔ لیکن اسلام میں شوہر کو اس کی بھی اجازت نہیں ہے کہ اپنی بیوی کی جائیداد کو وراثت میں حاصل کرنے کے لئے اس پر کچھ پابندیاں لگائے اور دباؤ بنائے چہ جائے کہ شوہر کی موت کے بعد کسی شخص کو یہ اختیار ہو، چاہے وہ متوفی کا کتنا ہی قریبی رشتے دار ہو، کہ اس کے شخصی وجود کو مقید کرے۔ چنانچہ اس چلن کو بھی ممنوع کیا گیا۔ البتہ بیوہ عورت اپنی مرضی سے شوہر کے کسی رشتے دار سے شادی کر سکتی ہے اگر وہ اس کے لئے موزوں ہو، اور اس دوسرے شخص کا متوفی سے کوئی تعلق ہونا اس شادی کے لئے ممانعت کی وجہ نہیں بنتا ہے، جس طرح دوسری بیوی کے بیٹے معاملے میں یا متوفی شوہر کے والد کے معاملے میں منع ہے جس کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں ہے۔

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۪ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو اُن سے نکاح مت کرنا مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا) یہ نہایت بے حیائی اور (اللہ کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت بُرا دستور تھا۔ تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور رضاعی بہنیں اور ساسیں حرام کر دی گئی ہیں اور جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو اُن کی لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے ہو (وہ بھی تم پر حرام ہیں) ہاں اگر اُن کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور تمہارے صُلبی بیٹوں کی عورتیں بھی اور دو بہنوں کا اکٹھا کرنا بھی (حرام ہے) مگر جو ہو چکا (سو ہو چکا)، بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحیم ہی۔ اور شوہر والی عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) مگر وہ جو (اسیر ہو کر لونڈیوں کے طور پر) تمہارے قبضے میں آ جائیں (یہ حکم) اللہ نے تمہیں لکھ دیا ہے اور ان (محرمات) کے سوا اور عورتیں تم کو حلال ہیں۔ اس طرح سے کہ مال خرچ کر کے اُن سے نکاح کر لو بشرطیکہ

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۲۴

(نکاح سے) مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ شہوت رانی۔ تو جن عورتوں سے تم فائدہ حاصل کرو اُن کا مہر جو مقرر کیا ہو ادا کر دو اور اگر مقرر کرنے کے بعد آپس کی رضامندی سے مہر میں کمی بیشی کر لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ (۴:۲۲ تا ۲۴)

جن رشتے داروں کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے ان کے ساتھ شادی کی ممانعت انسانی فطرت اور عقل عامہ کے خلاف ہے، اور مختلف سماجی روایات میں یہ ممانعت کسی قدر فرق کے ساتھ رائج ہے۔ اگر شادی ان لوگوں کے درمیان ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے قریبی تعلق نہیں رکھتے ہیں تو یہ نفسیاتی اور ظاہری لحاظ سے عموماً ایک اچھی شادی ہوتی ہے۔ جو نکاح ممنوع ہیں وہ اس مفروضہ پر ممنوع ہیں کہ کہ نکاح کی تجویز عورت کی عزت و وقار کی خاطر عام طور سے مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عمل ہونا بھی دین میں منع نہیں ہے حالانکہ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے۔ جن عورتوں سے نکاح ممنوع ہے ان کی فہرست آیت ۴: ۲۳ میں دی گئی ہے۔ اگر معاملہ برعکس ہو اور عورت کی طرف سے نکاح کی تجویز دی جائے تو اس رشتہ داری میں نکاح کی ممانعت کا ضابطہ تب بھی نافذ ہوگا اور اسی حساب اس فرمان کی مخاطب عورتیں اس طرح ہوں گی کہ: تمھارے باپ، تمھارے بھائی، چچا، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے ۔۔۔۔ وغیرہ'' یا اس مرد پر یہ ضابطہ بغیر اس تبدیلی کے لاگو ہوگا جسے عورت نکاح کی تجویز دے۔

آیت میں ماں کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں دادی پردادی اور نامی پرنانی وغیرہ بھی شامل ہیں، اور لفظ بیٹی میں نواسی و پرنواسی اور پوتی و پرپوتی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ لفظ بہن میں حقیقی بہن اور سوتیلی بہن شامل ہیں۔ باپ کی بہن کا اطلاق دادا کی بہن پر بھی ہوتا ہے اور ماں کی بہن کا اطلاق نانی کی بہن پر بھی ہوتا ہے۔ دودھ شریک بھائی بہن، دودھ پلانے والی عورت (رضاعی ماں) کے ساتھ بھی شادی ممنوع ہے۔ دو حقیقی بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا بھی منع ہے اور یہ ممانعت پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنے پر عائد ہوتی ہے۔

محرم عورتوں سے شادی کی ممانعت والی یہ آیات اسلامی انصاف کے عام اصول پر زور دیتے ہوئے مکمل ہوتی ہیں کہ یہ ممانعتیں اس حکم کے نازل ہونے کے بعد ہی لاگو ہوں گی اور اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے جو شادیاں ہو چکی ہیں وہ اس حکم کے نفاذ سے مستثنیٰ ہیں، اور ان پر اس دنیا میں یا آخرت میں کوئی سزا نہیں ہے۔ ان آیات میں جو اصول پیش کئے گئے ہیں ان کے فوائد انسانی تجربات اور جدید سائنسی تحقیقات سے ثابت ہو چکے ہیں، تاہم یہ مانا جاتا رہا ہے کہ قریبی رشتے دار سے شادی کا فائدہ یہ ہے کہ وراثت خاندان کے اندر ہی رہے گی۔ حضرت عمرؓ سے منسوب ایک روایت میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، اور لوگوں کو صلاح دی گئی ہے کہ اپنے خاندان میں شادی نہ کریں۔

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ

اور جو شخص تم میں سے مومن آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) سے نکاح کرنے کا مقدور نہ رکھے تو مومن لونڈیوں میں ہی جو تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں (نکاح کر لے)، اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو اچھی

بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

طرح جانتا ہے تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ تو ان لونڈیوں کے ساتھ اُن کے مالکوں کی اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق اُن کا مہر بھی ادا کر دو بشرطیکہ عفیفہ ہوں۔ نہ ایسی کہ کھلم کھلا بدکاری کریں اور نہ در پردہ دوستی کرنا چاہیں۔ پھر اگر نکاح میں آ کر بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں کے لئے ہے اُس کی آدھی اُن کو (دی جائے) یہ (لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی) اجازت اس شخص کو ہے جسے گناہ کر بیٹھنے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر صبر کرو (اور اس بے جوڑ نکاح سے بچو) تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ (اپنی آیتیں) تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تمہیں اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ اور اللہ تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے اور جو لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے رستے سے بھٹک کر دُور جا پڑو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے۔ (۴:۲۵ تا ۲۸)

ان میں سے پہلی آیت میں خاندان کے معاملات کے سلسلے میں مخصوص ہدایات دئے جانے کے علاوہ اسلام کے کئی لازمی اصول بیان ہوئے ہیں۔ پہلا یہ کہ غلام بھی آزاد لوگوں کے مساوی ہیں، اور یہ وہ اصول ہے جو اسلام کے اس پورے موقف کی بنیاد ہے کہ وہ اصولی طور پر غلامی کے خلاف ہے اور اس کے خاتمے کے لئے ایک جامع حکمت عملی اپناتا ہے اور اس کے لئے بتدریج بنیادی تبدیلیوں کا ایک نظام بناتا ہے۔ دوسرا یہ واضح اصول اور قانون کہ غلام عورت کے ساتھ جنسی تعلق صرف معروف طریقے سے شادی کرنے بعد ہی جائز ہے: ''ان لونڈیوں کے ساتھ اُن کے مالکوں کی اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق اُن کا مہر بھی ادا کر دو بشرطیکہ عفیفہ ہوں۔ نہ ایسی کہ کھلم کھلا بدکاری کریں اور نہ در پردہ دوستی کرنا چاہیں۔'' ایسی غلام عورتوں سے شادی بھی بہ یک وقت زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی اجازت کے دائرے میں ہی ہے، جس کی گنجائش مخصوص حالات کے لئے رکھی گئی ہے اور بالعموم وہ تعدد ازدواج کو محدود کرنے کے لئے ہے۔ [دیکھیں ماقبل مذکور آیت ۴: ۳، اور اس کی تشریح]۔

لیکن، چوں کہ اسلام کے اصولوں اور اس کے جامع پروگرام کا مقصد غلامی کو بتدریج ختم کرنا تھا اس لئے مندرجہ بالا آیت تیسرا نکتہ یہ دیتی ہے کہ جو کوئی اپنے حیاتیاتی تقاضوں کے دباؤ سے راحت پانے کے لئے کسی غلام عورت سے شادی کرے تو اسے دوسرے مسائل کی بھی توقع رکھنی چاہئے، کیوں کہ اس صورت میں آدمی اس ماحول سے ناواقف اور ناموس ہو سکتا ہے جس ماحول میں اس غلام لڑکی کی پرورش ہوئی ہے۔ غلام عورتوں پر غلامی کے ناگوار نفسیاتی اور عملی اثرات مرتب ہوتے تھے، خاص طور سے اسلام کے ابتدائی زمانے

میں جب کہ غلامی کے خاتمے کے لئے اسلام کا جامع منصوبہ بروئے کار نہیں آیا تھا، اور اس وجہ سے انہیں پھسلانا اور بہکا دینا آسان تھا۔ اسلام کا نظام انصاف ان کی مشکلات کو سمجھتا تھا، چنانچہ یہ التزام کیا گیا کہ کسی فحش حرکت پر جو سزا کسی آزاد عورت کو دی جائے گی، غلام عورت کو اس کی آدھی سزا دی جائے گی۔ اس طرح کی اخلاقی کمزوریوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا، اور غلامی مجموعی طور سے اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے، چنانچہ ایسی عورت سے جس کے پس منظر سے متعلق پوری معلومات نہ ہوں، شادی کرنے کے بجائے ''یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم صبر کرو''۔ غلامی کے مکمل خاتمے سے پہلے اور تمام غلاموں کے لئے آزاد افراد کی طرح زندگی گزارنے کی موزوں صورت حال بننے سے پہلے کے عبوری دور میں غلام مرد اور غلام عورت آپس میں شادی کرنے کے لئے فطری طور سے زیادہ موزوں تھے۔

غلامی کو مکمل طریقے سے ختم کرنے کے جامع منصوبے کو بتدریج عمل میں لانے کے لئے ان عارضی (قلیل مدتی) اور دیرپا (طویل مدتی) التزامات کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت میں یہ بالکل واضح ہے۔ اس منصوبے کو افراد کی کیفیت اور سماجی حالات کی مطابقت کے ساتھ پورا کرنے کے لئے یہ اصول اور یہ لائحہ عمل ضروری تھے کہ ان میں جلد بازی سے کام نہیں لیا گیا، اس سے کوئی بے اطمینانی پیدا نہیں ہوئی، کوئی رسمی اعلان نہیں کیا گیا، بے رحمی اور کم نظری سے کام نہیں لیا گیا؛ ان سارے مسائل سے بچنے کے لئے یہ تدریجی لائحہ عمل نہیں کیا گیا ہوتا اور عبوری اقدامات نہ کئے گئے ہوتے تو اس سے مقصد فوت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ آخری ہدایت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ یہ انسانی فطرت سے کتنی ہم آہنگ ہے، کیوں کہ اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ان کی ہدایت کے لئے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں: ''۔ اللہ چاہتا ہے کہ (اپنی آیتیں) تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تمہیں اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے، اور اللہ تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے اور جو لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے رستے سے بھٹک کر دُور جا پڑو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے'' [۴:۲۶ تا ۲۸]؛ ''تو تم ایک طرف کے ہو کر دینِ (الٰہی کے رستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ (اور) اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اختیار کئے رہو) اللہ کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' [۳۰:۳۰]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۱۹

مومنو! تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور (دیکھنا) اس نیت سے کہ جو کچھ تم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے کچھ لے لو انہیں (گھروں میں) مت روک رکھنا۔ ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں (تو روکنا نامناسب نہیں) اور اُن کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔ (۴:۱۹)

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو نیک ہوں (نکاح کر دیا کرو) اگر وہ مفلس ہوں

وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۳۲ وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖۗ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۳

گے تو اللہ اُن کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا اور اللہ (بہت) وسعت والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے۔ اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو وہ پاکدامنی کو اختیار کئے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے اور جو غلام تم سے مکاتبت (معاوضہ دے کر آزادی حاصل کرنے کا معاہدہ) کرنا چاہیں تو اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو اور اللہ نے جو مال تمہیں بخشا ہے اس میں سے ان کو بھی دو، اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرنا کہ دنیاوی زندگی کے فوائد حاصل کرنا مقصود ہو، اور جو ان کو مجبور کرے گا تو (وہ جان لے کہ) ان (بیچاریوں) کو (بدکاری کے لئے) مجبور کئے جانے کے بعد اللہ (انہیں) بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۴:۳۲ تا ۳۳)

اوپر کی آیت میں غلام (مرد یا عورت) رکھنے والے افراد سے کہا گیا ہے کہ اگر غلام مکاتبت کی درخواست کرے (یعنی کسی معاوضہ کے بدلے آزادی کا مطالبہ کرے) تو اس کی اس درخواست کو منظور کریں اور اس کے ساتھ معاہدہ لکھ لیں، اور تمام ذرائع سے اس کی ہر ممکن مدد کریں تا کہ وہ آزاد ہو جائے، خاص طور سے اس صورت میں کہ جب مالک کو اپنے غلام کے اندر کوئی 'خیر' (خوبی) نظر آتی ہو۔ قرآن کے مطابق، اور پھر اس پر فقہی تدبر کے مطابق، غلام کو آزاد ہو جانے میں اس کی مدد کرنا انفرادی اور سماجی ذمہ داری ہے، اور غلام کو یہ موقع دیا جانا چاہئے کہ وہ آزاد ہو کر کوئی محنت مزدوری کرے اور آزادی کے لئے طے ہوئے معاوضہ کو ادا کرنے کے لائق بنے۔ علاوہ ازیں، نہ صرف وہ لوگ جو کسی غلام کے واقعی مالک ہوں، بلکہ پورا سماج جس کی نمائندگی ریاست کے حکمراں اور حکام ادارے وافراد کرتے ہیں ان کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاملے میں غلام کی مدد کریں، اور عوامی خزانہ بھی سماج کی ہی ملکیت ہوتا ہے، اور وہ فرد جو غلام کا آقا ہے اس معاملے میں کچھ ایثار سے بھی کام لے سکتا ہے۔ یہاں قرآن افراد اور سماج کو یہ ذہن نشیں کراتا ہے کہ ان کے پاس جو دولت ہے اس کا اصل مالک اللہ تعالیٰ خود ہے جس نے پوری کائنات کو اور اس میں موجود تمام وسائل کو پیدا کیا ہے، اور مال رکھنے والے افراد یا سماج کو اللہ نے مال کا صرف تحویل دار (متولی) بنایا ہے اور افراد و سماج کو یہ دولت سرمایہ کاری، تبادلہ اور اشیائے ضرور پر صرف کرنا چاہئے اللہ کی ہدایت کے مطابق۔ افراد اور سماج کو اللہ کی طرف سے بخشے گئے وسائل اور اثاثے ان پر ایک اجتماعی ذمہ داری ڈالتے ہیں، اور مال رکھنے والے افراد کو مال پر مطلق اور لامحدود حقوق نہیں دئے جانے چاہئیں۔

اگر دوسری آیت کا پہلا حصہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جو غلام مکاتبت کا خواہش مند ہو اس کی ہر ممکن مدد کی جائے، تو اس کا بعد والا حصہ کسی غلام لڑکی کو قحبہ گری کے لئے پھسلانے یا دباؤ میں لانے کے خلاف متنبہ کرتا ہے چاہے یہ قحبہ گری مالک کی آمدنی میں اضافے کے مقصد سے ہو یا خود غلام عورت آزاد ہونے کے لئے معاوضہ کی رقم جمع کرنے کے لئے کرے۔ یہ آیت صریحاً یہ بتاتی ہے کہ غلام لڑکی کا مالک ہونا مالک کو اس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا حق نہیں دیتا؛ نیز اس سے پہلے والی آیت [۲۴:۳۲] بھی صاف طور سے یہ بتاتی ہے کہ غلام

کے لئے بھی اور آزاد آدمی کے لئے بھی جنسی تعلق قائم کرنے کا ذریعہ صرف شادی ہی ہے۔ علاوہ ازیں، لڑکی کو اپنی عفت بیچ کر پیسہ کمانے کے لئے مجبور کرنے کے سے یہاں جو منع کیا گیا ہے تو یہ حکم ان آزاد لڑکیوں کے معاملے میں بھی صادق آتا ہے جن کی شادیاں آج لمبے چوڑے جہیز، شاندار گھر اور قیمتی فرنیچر وغیرہ کی خواہش نیز شادی کے دوسرے خرچوں کی وجہ سے مشکل ہوگئی ہیں اور جس کی وجہ سے کوئی لڑکی ''اس دنیا کے مال ومتاع کو حاصل کرنے کے لئے مجبور'' ہوجائے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝۳۴ وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵

مرد عورتوں پر قوام (نگراں وذمہ دار) ہیں اس لئے کہ اللہ نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں، تو نیک عورتیں اطاعت گزار (ہوتی ہیں اور) غائبانہ حفاظت کرنے والی (ہوتی ہیں ان چیزوں کی جن کی) حفاظت اللہ کی ہے (یعنی شوہر کے مال واسباب اور اپنی آبرو کی)۔ جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی (اور بدخوئی) کرنے لگی ہیں تو (پہلے) اُن کو (زبانی) سمجھاؤ (اگر نہ سمجھیں تو) پھر اُن کے ساتھ سونا ترک کر دو۔ اگر اس پر بھی باز نہ آئیں تو زدوکوب کرو اور اگر فرماں بردار ہو جائیں تو پھر اُن کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ (اور) جلیل القدر ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔ وہ اگر صلح کرا دینی چاہیں گے تو اللہ اُن میں موافقت پیدا کر دے گا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا اور سب باتوں سے خبردار ہے۔
(۴:۳۴ تا ۳۵)

ان میں سے پہلی آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ آدمی کا اپنی بیوی اور بچوں سے تعلق اس کے اوپر ایک ذمہ داری کا ہے، یہ ان پر فوقیت اور برتری نہیں ہے۔ اللہ نے عورتوں پر ۹ مہینے تک بچے کو اپنے وجود کے ساتھ لے کر چلنے کا بوجھ ڈالا ہے، پھر پیدائش کی زحمت اٹھانے کا مکلف بنایا ہے، پھر وہ بچے کو پالتی بھی ہے اور جب تک بچہ اپنی ضروریات خود پوری کرنے کا اہل نہیں ہوجاتا تب تک ماں ہی بچے کی ساری ضروریات پوری کرتی ہے'' ۔۔۔۔۔۔ اُس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے (پھر اُس کو دودھ پلاتی ہے) اور (آخرکار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔۔۔۔۔'' [۳۱:۱۴]، ''اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا'' [۴۶:۱۵]۔ مرد چوں کہ اس بوجھ سے آزاد ہے، اس لئے اس کی ذمہ داری عورت کی مدد کرنا اور اسے سہارا دینا ہے اور بیوی و بچوں کی پوری دیکھ بھال کرنا اور ان کی ضروریات پوری کرنا اس کے ذمہ ہے۔ چنانچہ یہ مرد کی قانونی ذمہ داری ہے، لیکن یہ صرف اس کی

جسمانی مضبوطی کی وجہ سے ہے، کسی صنفی امتیاز کی وجہ سے نہیں ہے۔ مرد جب تک اپنے بیوی بچوں کے تئیں اپنی یہ قانونی اور اخلاقی ذمہ داریاں پوری کرتا رہتا ہے تب تک وہ بیوی بچوں کی طرف سے محبت اور عزت کا مستحق ہوتا ہے، برتری قائم رکھنے اور ان کو اپنا محکوم سمجھنے کا حق دار نہیں ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ قرآن چوں کہ حقوق اور ذمہ داریاں تقسیم کرتا ہے اور ''اس نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں''، جب کہ بعض حالات میں بیوی کو شوہر سے بھی زیادہ رعایتیں حاصل ہیں۔ شوہر کے بیمار ہونے پر یا اور ایسی کسی مجبوری کی صورت میں گھر کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری عورت پر ہی آجاتی ہے اور وہ گھر کا خرچ چلانے کے ساتھ گھر کی دیکھ ریکھ اور تمام معاملات کو انجام دینے کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔ جب شوہر اور بیوی دونوں مل کر گھر کا خرچ اٹھا رہے ہوں تو گھر کی ضروریات پوری کرنے میں دونوں کی صورت حال ایک سی ہوتی ہے۔

قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ''عورتوں کا حق (مردوں) پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے'' [۲:۲۲۸]۔ ایک بار پھر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ فضیلت بمعنی برتری نہیں ہے بلکہ زیادہ ذمہ دار ہونے کی بنا پر ہے۔ کسی عورت کی طرف سے شوہر کے تئیں ذمہ داریاں پوری کرنے میں کوتاہی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شوہر کے اوپر بیوی کے تئیں جو ذمہ داریاں ہیں ان میں کوتاہی کرنے کا جواز اسے حاصل ہو جائے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فضیلت کا معنیٰ مرد پر مزید ذمہ داریاں ہونا بتایا ہے ''تاکہ وہ خود پر اور جبر کرے اور عورت کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرتے ہوئے اس کی مادی اور اخلاقی ضروریات اور بڑھ چڑھ کر پوری کرے''۔ ایک اور ممتاز مفسر قرآن ابن عطیہ کا قول قرطبی نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو شاندار اور زبردست قرار دیا ہے۔ بہر حال جیسا کہ پہلے کہا گیا اس افضلیت اور قوامیت سے کسی بھی طرح گھریلو زندگی میں جابر و حاکم بن جانے کا جواز نہیں نکلتا، کیوں کہ گھر شوہر اور بیوی دونوں کی باہمی رضامندی سے اور باہمی تعاون و مشاورت سے چلتا ہے'' [۲:۲۲۳]۔

اگرچہ ایسے مرد اور عورتیں بھی ہیں جو اپنے نجی اور خفیہ سلوک کی بھی حفاظت اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ کی ہدایت کے مطابق کرنا چاہئے، لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جن کا اکھڑ پن، سرکشی اور جارحانہ رویہ ظاہر و باہر ہوتا ہے اور ان کے رویے کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ آیت عورتوں کے اکھڑ پن، سرکشی اور جارحانہ رویے کی تین سطحوں کے تعلق سے نمٹنے کے لئے تین طریقے بتاتی ہے: انہیں سمجھانا، ان سے اپنا بستر الگ کر لینا اور ان کو مضروب کرنا (پٹائی لگانا)۔ یہ تین طرح کے اقدامات ہیں جو صورت حال کے مطابق اختیار کئے جا سکتے ہیں، یہ ایک تسلسل نہیں ہے کہ جسے جاری رکھا جائے۔ جہاں کام صرف سمجھانے بجھانے سے ہو جائے وہاں پھر مزید اگلا قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں اور جہاں صرف پہلے دو اقدامات کافی ہوں وہاں پھر پٹائی لگانے کا کوئی جواز نہیں۔ پٹائی لگانے کی نوبت تبھی آئے گی جب بیوی کی سرکشی اس حد تک بڑھ جائے کہ جب وہ خود کو، بچوں کو یا شوہر کو نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو۔ ایسی صورت حال جب اچانک پیدا ہو جائے تو پھر سمجھانا بجھانا اور بستر الگ کر دینا کام نہیں آتا، اور اس کے جارحانہ رویے کو روکنے کے لئے جسمانی طور سے مضروب کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں عورت کے اس عمل کو فحش حرکت سے تعبیر کیا ہے جس کی وجہ سے اسے مارلگانے کی اجازت دی ہے، اور اس حدیث کے شارحین نے اور فقہاء نے سزا کی اس شکل کو بہت ہی ہلکی پھلکی مار اور علامتی پٹائی تک محدود سمجھا اور سمجھایا ہے، ایسی معمولی مار کہ مسواک سے مارا جائے۔ یہاں جو فحش حرکت کا ذکر ہے وہ فطری طور سے زنا کاری یا ایسی کوئی بدکاری سے بالکل مختلف ہے جس کے لئے تحقیق، مقدمہ اور سزا دینے کی ذمہ داری حکام کے اوپر عائد کی گئی ہے۔

چوں کہ قرآن نے اور خود نبی کریم ﷺ نے زندگی بھر مردوں کو بار بار اس کی تاکید کی وہ عورتوں سے منصفانہ اور رحم دلی کا

سلوک کریں اور ان کے خلاف کوئی بھی اخلاقی اور جسمانی تشدد نہ کرنے کے لئے خبردار کیا ہے، حتیٰ کہ جنگ کے معاملے میں بھی، چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں مرد کو جو سختی کرنے اور سزا دینے کی اجازت دی گئی ہے اسے محض ایک قانونی نقطہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ایسے سنگین حالات سے نمٹنے کے لئے ہے جو پورے خاندان کو محفوظ اور سلامت رکھنے کے لئے خطرہ بن جائیں۔ اگر بیوی کی طرف سے شوہر کے خلاف اس سختی یا تشدد کی شکایت متعلقہ حکام سے کی جائے یا عدالت میں مقدمہ پیش ہو تو ایسی صورت میں اگر شوہر صورت حال کی اس سنگینی کو ثابت کرنے میں ناکام رہا جس کی وجہ سے اسے بیوی کو جسمانی سزا دینے کی اجازت ہے تو وہ اس کے لئے معاوضہ کا مطالبہ کر سکتی ہے، اور طلاق کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔

بیوی کی ایسی سرکشی سے یا گھریلو تعلقات میں خرابی سے نمٹنے کے لئے قرآن سب سے پہلے مرحلے پر یہ تعلیم دیتا ہے کہ شوہر و بیوی دونوں کے گھر والوں کی طرف سے ایک ایک ثالث کو بلایا جائے جو تعلقات کی بحالی اور شکایت کے ازالے کی کوشش کریں، ان مصالحت کاروں کی کوشش کو اللہ کی مدد حاصل ہوگی کیوں کہ وہ علیم و خبیر ہے اور سنجیدہ و مخلصانہ کاوشوں میں مدد کرتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اسلامی انصاف کے عام اصول کسی فرد کو کسی تنازعہ میں قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتے الا یہ کہ اپنے میں دفاع میں کچھ کرنا واقعتاً ضروری ہو جائے۔ قانون نافذ کرنے کی ذمہ داری ریاست کے حکام کی ہے نہ کہ تنازعہ میں شامل کسی فریق کی چاہے وہ مظلوم ہی ہو [دیکھیں چوری و زنا کی کی سزا سے متعلق آیات ۵:۳۸؛ ۲۴:۲]۔

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ﴿۳﴾

اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اُن کے سوا جو عورتیں تمہیں پسند ہیں دو دو یا تین تین یا چار چار اُن سے نکاح کر لو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا وہ جو بجا طور پر تمھارے اختیار میں ہے (یعنی غلام عورت جس کے تم مالک ہو)، اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔ (۴:۳)

''(سب کے ساتھ) یکساں سلوک نہ کر پانے کے اندیشہ'' اور ''جو عورتیں تمھیں پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کرو'' کے درمیان منطقی تعلق کو سمجھنے میں اولین زمانے کے اور پھر ان کے بعد کے مفسرین نے بہت کوششیں کی ہیں۔ الطبری نے سعید بن جبیر اور قتادہ جیسے تابعین کے نظریہ سے اتفاق کیا ہے جو محمد اسد کے الفاظ میں یہ ہے کہ'' جس طرح تمھیں بجا طور پر یتیموں کے مفادات کے سلسلے میں ناانصافی کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح کی احتیاط ان عورتوں کے مفادات اور حقوق کا خیال کرنے میں بھی کرو جن سے تم شادی کا قصد کرتے ہو''۔

ایک اور تفسیر جو زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ سے منسوب ہے اس میں اس آیت کو ایسی یتیم بچی کے سرپرست سے متعلق سمجھا گیا ہے جس سے وہ شخص شادی کرنے کا خواہاں ہو، لیکن جسے اندیشہ ہو کہ اسے بیوی کی طرح برتنے میں اس کے ساتھ انصاف اور ایمان داری کا معاملہ نہ کر سکے گا یا اس کی املاک کے معاملہ میں ایمان داری نہیں برت سکے گا اس وجہ سے کہ وہ تو پہلے سے ہی سرپرست تھا، ایسے

آدمی کو صلاح دی گئی ہے کہ اس یتیم بچی سے نکاح کرنے کے بجائے جو دوسری عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لے [نیز دیکھیں آیت ۴:۱۲۷]۔ یہاں اس بات کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ آیت کا حوالہ جنگ یا اس جیسے کسی اور سبب سے یتیم بچیوں یا بے سہارا عورتوں کی کثرت ہو جانے کی استثنائی صورت کے لئے بھی ہو سکتا ہے، خاص طور سے جب ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اس صورت میں ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا پیدا شدہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے ایک عارضی بندوبست رہا ہوگا، اس طرح یہ ایک مشروط اجازت ہے نہ کہ ایک عام اصول۔ آیت میں صریحاً کہا گیا ہے کہ ''اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو، اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔'' اسی سورۃ کی ایک اور آیت مکمل اور مطلق انصاف کے ناممکن ہونے پر زور دیتی ہے ''اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی کی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو (ایسی حالت میں) چھوڑ دو کہ گویا ادھڑ میں لٹک رہی ہے اور اگر آپس میں موافقت کر لو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے'' [۴:۱۲۹]۔ اگرچہ یہ آیت ایک طرف ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ ''ممکن اور قابل عمل'' مساوی سلوک کے امکان کا دروازہ کھولتی ہے اور اسی بنا پر تعدد ازدواج کی اجازت دیتی ہے، تاہم دوسری طرف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہی آیت انسانی فطرت کی نفسیاتی بنیاد کو اجاگر کرتی ہے یعنی مساوی سلوک نہ کر پانے کی کمزوری، اور اس بات کو اکثر معاملوں میں ایک طرف نہیں ڈالا جا سکتا۔ چنانچہ، ایسا غیر محفوظ جوکھم اٹھانے سے بچنے میں ہی سمجھ داری ہے جب تک کہ یہ سماجی طور سے ضروری نہ ہو جائے اور ایک زیادہ سنگین ناانصافی کو دور کرنا ایک تقاضا نہ ہو جائے اس صورت میں شادی کے لائق غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد شادی کی اہلیت رکھنے والے مردوں کی تعداد سے بہت زیادہ نہ ہو جائے۔ کسی صحت مند اور اچھے سماج میں کوئی عورت عملاً اس وقت تک دوسری بیوی بننا منظور نہیں کرے گی جب تک کہ اس کے لئے اکلوتی بیوی بننے کا موقع ہی نہ رہ جائے۔

مندرجہ بالا نکات کے علاوہ، آیت میں ''جو تمھاری ملکیت میں ہیں (یعنی غلام عورت)'' کو بھی قانونی اور جائز شادی کے درجہ میں رکھا گیا ہے جس کی کچھ شرائط اور یقینی نتائج ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے آغاز میں اور غلامی کے مکمل خاتمے سے پہلے کے عبوری دور میں ان کے وجود کو تسلیم کیا گیا تھا اور ان کے حقوق کی تاکید کی گئی تھی۔ اس پالیسی کا مقصد مسلم سماج میں مکمل آزادی اور مکمل مساوات کے حدف کو حاصل کرنا تھا جو کہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ اس بات کی تائید اسی سورۃ کی آیت ۲۵ سے بھی ہوتی ہے جو غلام عورتوں کا نکاح کر دینے سے متعلق ہے اور یہ تعلیم دیتی ہے کہ ''ان لونڈیوں کیساتھ اُن کے مالکوں کی اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق اُن کا مہر بھی ادا کرو بشرط یہ کہ نکاح کر کے مقدس رشتہ بنانا مقصود ہو، چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔'' [۴:۲۵]۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ غلام عورت (باندی) کے ساتھ جنسی تعلق صرف جائز طریقے سے یعنی شریعت کے ضابطوں کے مطابق شادی کرنے کے بعد ہی جائز ہے۔ اس بات کی تائید محمد عبدہٗ نے بھی اپنے منطقی استدلال میں کی ہے جسے رشید رضا نے نقل کیا ہے: ''مرد کو چار غلام عورتوں سے زائد شادیاں نہیں کرنی چاہئیں'' [تفسیر المنار: جلد ۶، ص۔ ۳۵۰]۔ البتہ، لاتعداد غلام عورتوں سے صرف ان کے باندی ہونے کی بنا پر بغیر شادی کے جنسی تعلق کو قرآن وسنت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ محمد اسد نے میسج آف دی قرآن میں آیت ۴: ۳ اور ۲۵ پر اپنے تفسیری حاشیوں میں لکھا ہے کہ۔۔۔ داشتہ رکھنا اسلام میں منع ہے ۔۔۔۔ اس عام خیال کے برعکس جو گزشتہ صدیوں میں پایا جاتا تھا اور جس پر کچھ مسلمانوں نے عمل بھی کیا ہے''۔

طلاق

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲۶ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۷

جولوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے سے قسم کھالیں اُن کو چار مہینے تک انتظار کرنا چاہئے اگر (اس عرصے میں قسم سے) رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر طلاق کا ارادہ کرلیں تو بھی اللہ سنتا اور جانتا ہے۔ (۲:۲۲۶ تا ۲۲۷)

اسلام سے پہلے عربوں میں بیویوں کے ساتھ کئی طرح کے ذلت آمیز اور تکلیف دہ سلوک رائج تھے جیسے یہ کہ ان سے الگ رہنے کی قسم کھالینا، یا ان سے یہ کہنا کہ ''تمھاری پیٹھ میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح (حرام) ہے'' یعنی ''ظہار'' کرنا [۲:۵۸]، اور اس طرح بیوی بے یارومددگار بن کر رہ جاتی اور سماج میں معلق ہوجاتی کیوں کہ نہ تو وہ بیوی ہی رہتی اور نہ طلاق یافتہ ہوتی کہ کوئی دوسرا اس سے نکاح کرلے۔ قرآن نے ایسی قسمیں کھانے سے منع کیا اور ان پر دو طرح سے پابندی لگائی۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے نام پر بار بار قسمیں کھانے سے منع کیا اور اس بات سے کہ ''قسمیں کھا کھا کر حسن سلوک اور تقویٰ کے عمل سے نیز لوگوں میں صلح وسازگاری کرانے سے رک جائیں''، یہ کہتے ہوئے کہ ''اللہ تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں تم قصدِ دلی سے کھاؤ گے اُن پر مواخذہ کرے گا'' [۲:۲۲۴ تا ۲۲۵]، نیز ۵:۸۹]، اور دوسرے اس طرح کہ بیوی سے دور رہنے کی قسم کھانے والے مرد کے لئے چار مہینے کی مدت طے کردی کہ اس کے پورے ہونے کے بعد یا تو اسے بیوی سے مراجعت کرنی ہوگی یا پھر اسے معروف طریقے سے طلاق دے کر آزاد کرنا ہوگا۔ ظہار جیسے سنگین معاملے میں سزا طے کی گئی اور ایسے ذلت آمیز اور تکلیف دہ عمل کو باطل قرار دیا گیا: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں پھر اپنے قول سے رجوع کرلیں تو (ان کو) ہم بستر ہونے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا (ضروری) ہے، (مومنو!) تمہیں یہ نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جس کو غلام نہ ملے وہ مجامعت سے پہلے متواتر دو مہینے کے روزے رکھے جس کو اس کا بھی مقدور نہ ہو (اسے) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا (چاہئے)، یہ (حکم) اس لئے (ہے) کہ تم اللہ اور اس کے رسول کے فرماں بردار ہوجاؤ، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور نہ ماننے والوں کے لئے دردد ینے والا عذاب ہے'' [۵۸:۳ تا ۴]۔ قرآن نے اس عمل کی ان الفاظ میں مذمت کی کہ ''جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں کو ماں کہہ دیتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں (ہوجاتیں) ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے بے شک وہ نامعقول اور جھوٹی بات کہتے ہیں'' [۵۸:۲، نیز ۳۳:۴]۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَ

اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں اور اگر وہ اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کو جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ اُن کے شکم میں پیدا کیا ہے اُس کو چھپائیں اور اُن کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور عورتوں کا حق (مردوں) پر

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ
عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۲۲۸ اَلطَّلَاقُ
مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ
وَ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا
اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا
افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ
یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۲۲۹ فَاِنْ
طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا
غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ
اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ
یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۲۳۰ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ
سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا
لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ
لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ
وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ یَعِظُكُمْ
بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۲۳۱
وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا
تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا
بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ
یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰی لَكُمْ وَ

ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ غالب (اور) صاحبِ حکمت ہے۔ طلاق (صرف) دو بار ہے (یعنی جب دو دفعہ طلاق دے دی جائے تو) پھر (عورت کو) یا تو شائستہ طریقے سے (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا شرافت کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ جو مہر تم اُن کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ واپس لے لو۔ ہاں اگر زن و شوہر کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت (خاوند کے ہاتھ سے) رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے تو (دونوں پر) کچھ گناہ نہیں، یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے باہر نکل جائیں گے وہ گنہگار ہوں گے۔ پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دیدے تو اُس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اُس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی۔ ہاں اگر دوسرا خاوند بھی طلاق دیدے اور عورت اور پہلا خاوند پھر ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ دونوں یقین کریں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں وہ اُن لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔

اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور اُن کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں یا تو حسنِ سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا شائستہ سے رخصت کر دو اور اس نیت سے اُن کو نکاح میں نہ روکے رکھو کہ اُنہیں تکلیف دینا اور اُن پر زیادتی کرنا ہو، اور جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور اللہ کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ اور اللہ نے تمہیں جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے اُن کو یاد کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اُن کو دوسرے شوہروں کے ساتھ جب وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہو

اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۲

جائیں نکاح کرنے سے مت روکو۔ اس (حکم) سے اُس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ یہ تمہارے لئے نہایت خوب اور پاکیزگی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۲:۲۲۸ تا ۲۳۲)

بعض اوقات جب شوہر و بیوی میں مطابقت نہیں ہو پاتی تو طلاق ناگزیر ہو جاتی ہے چاہے شوہر و بیوی دونوں اپنے آپ میں اچھی شخصیت کے مالک ہی ہوں۔ اس حقیقت کو اسلام اصولی طور پر تسلیم کرتا ہے اور ایک ایسے نکاح کو بنائے رکھنے پر اصرار نہیں کرتا جس میں شوہر و بیوی ایک دوسرے کے ساتھ خوش گوار زندگی نہیں گزار پا رہے ہوں۔ لیکن وہ اس معاملے میں جلد بازی سے روکتا ہے اور طلاق کے فیصلے میں جلد بازی سے کام لینے کو منع کرتا ہے۔ لیکن جب طلاق ناگزیر ہی ہو جائے تو اسلام اس کے لئے مناسب، موزوں اور سہل طریقہ سکھاتا ہے۔

نکاح کو برقرار رکھنے کے لئے کئی اقدامات تجویز کئے گئے ہیں جن میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ فریقین کو اس کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تھوڑی سی نا اتفاقی کی وجہ سے یا کسی وقتی ناگوار صورت حال کی وجہ سے طلاق جیسا سنگین فیصلہ لینے سے بچیں: ''اُن کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے'' [۴:۱۹]، ''اور اگر فرماں بردار ہو جائیں تو پھر اُن کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو'' [۴:۳۴]۔ رسول کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ نے جن کاموں کو جائز رکھا ہے ان میں سب کراہیت والی چیز طلاق ہے [ابوداؤد، ابن ماجہ اور الحاکم]۔ طلاق کے بارے میں سوچنے سے پہلے مصالحت کی تمام تر کوششیں ہونی چاہئیں اور اس کے لئے زوجین کے مابین موافقت قائم کرنے کی کوشش دونوں کے رشتے داروں، قریبی دوستوں اور مقامی انتظامیہ کے خصوصی محکمہ اور افسران کے ذریعہ کی جانی چاہئے [۴:۳۵]، اور بعض فقہاء کے نزدیک یہ طلاق کے لئے طلاق سے پہلے پوری کی جانے والی لازمی شرائط ہیں۔

جب مصالحت کی تمام تر کوششیں ناکام ہو جانے کے بعد طلاق کو ناگزیر سمجھا جانے لگے تو رسول کریم ﷺ کی حدیث کے مطابق طلاق کا فیصلہ تب کرنا چاہئے جب عورت حالت طہر میں ہو اور حیض سے فارغ ہو کر اس کے تمام جسمانی اور نفسیاتی اثرات سے وہ آزاد ہو گئی ہو (بہ روایت ابن حنبل)۔ رسول کریم ﷺ کی ایک اور حدیث بتاتی ہے کہ طلاق غصہ اور طیش کی حالت میں اور بے سوچے سمجھے نہیں دینا چاہئے۔ [بہ روایت ابن حنبل، ابوداؤد، الحاکم)، اور آیت ۲:۶۵ کی رو سے بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ صحیح طرح سے طلاق دینے کے لئے طلاق دیتے وقت دو گواہوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔

جب برحق طور سے طلاق کا فیصلہ کر لیا جائے اور اس کا اظہار کر دیا جائے تو پھر عورت کو دوسری شادی کرنے سے پہلے ایک مدت تک انتظار کرنا ہوتا ہے تاکہ طلاق دینے والے شوہر سے مصالحت کا ایک موقع اور پھر سے نکاح کر لینے کا ایک امکان بھی باقی رہے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر طلاق دیتے وقت یا عدت کے دوران یہ ظاہر ہو کہ عورت حاملہ ہے تو حمل سے فارغ ہو جانے تک وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ جو عورت حاملہ نہ ہو تو اس کے لئے انتظار کی یہ مدت قرآن کی رو سے بعض فقہاء کے نزدیک تین حیض سے فارغ ہونے تک ہے، اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک حیض کے درمیان کی تین مدتیں (طہر کی حالتیں) ہیں، کیوں کہ آیت میں جو لفظ

استعمال ہوا ہے اس کے دونوں ہی مطلب نکلتے ہیں۔ اگر مطلقہ عورت کو پیٹ میں حمل ہونے کا ابتدائی احساس ہوتا ہے تو یہ مدت انتظار یعنی عدت بڑھ جائے گی اور عورت کو بچے کی پیدائش تک انتظار کرنا ہوگا، اس لئے طلاق پانے والی عورت سے کہا گیا ہے کہ وہ حمل کی حقیقت کو چھپائے نہیں، کیوں کہ حمل کا احساس سب سے پہلے خود اسی کو ہوگا: ''ان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اسے وہ چھپائیں، اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں''۔ بچہ کی پیدائش کے بعد خود اس بچے کی موجودگی بھی شادی کو برقرار رکھنے کا ایک سبب بن سکتی ہے۔

بہرحال، ایک دوسرے سے الگ ہو چکے شوہر و بیوی دونوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ طلاق کے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور اس عبوری مدت میں اپنے نکاح کو بحال کرنے کے لئے سنجیدگی سے سوچیں۔ سابق شوہروں کو تلقین کی گئی ہے کہ نکاح کے رشتے کو بحال کرنے اور کنبہ کو بنائے رکھنے کے لئے وہ پیش قدمی کریں: ''اس مدت عدت کے دوران ان کے شوہر اس بات کے مجاز ہیں کہ وہ پھر نکاح کر لیں'' کیوں کہ عام طور سے مرد ہی پہلے پہل عورت کو نکاح کی تجویز دیتے ہیں۔ تاہم مطلقہ عورت یہ فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہے کہ وہ اس الگ ہو جانے والے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر کے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے یا نہیں، چاہے شوہر کی طرف سے یہ پیش کش مدت عدت کے دوران ہو یا عدت کے بعد تب تک جب تک کہ عورت نے دوسری شادی نہیں کی ہے۔

اگر کوئی شادی طلاق کے بعد دوبارہ ہوتی ہے، اور پھر کوئی لاینحل مسئلہ پیش آجاتا ہے تو طلاق دینے کی گنجائش اور کم ہو جاتی ہے یعنی طلاق دینے اور پھر نکاح کر لینے کا یہ سلسلہ زیادہ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ طلاق پر مزید پابندی یہ ہے کہ ایک ہی جوڑے کے لئے طلاق کی یہ گنجائش زیادہ سے زیادہ تین بار کے لئے ہے۔ دو طلاقوں کے بعد یا تو زوجین کے باہمی تعلقات اور ساتھ ساتھ رہنے کی کیفیت میں بہتری ثابت ہوگی یا پھر تیسری طلاق واقع ہوگی جس کی تلافی کا کوئی موقع آگے نہیں رہے گا۔ سابق شوہر و بیوی کے درمیان اب پھر سے نکاح صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ مطلقہ عورت نے عدت کی مدت گزرنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے شادی کی ہو اور پھر اس شوہر سے بھی اس کو طلاق ہوگئی ہو یا شوہر کی وفات ہو جانے سے وہ پھر سے بیوہ ہوگئی ہو۔ ان تینوں طلاقوں میں قانونی شرائط پوری کرنا الگ الگ ضروری ہے اور تینوں کے درمیان ایک معقول وقت گزرنا بھی ضروری ہے، ایک ہی بار میں تین طلاقیں نہیں دی جاسکتیں، کیوں کہ ایک ہی وقت میں تینوں مواقع کو استعمال کر بیٹھنا ان تمام احتیاطی لوازمات کے خلاف ہے جو جلد بازی سے بچنے کے لئے بتائی گئی ہیں اور ایک کے بعد دوسری طلاق کی گنجائش رکھنے کا جو مقصد ہے کہ زوجین کا جوڑا بنا رہے اور خاندان نہ ٹوٹے اس کے خلاف ہے۔ مزید برآں، پہلے شوہر سے تین بار اور ناقابل تلافی طلاق (طلاق مغلظہ) ہو جانے کے بعد کسی دوسرے شوہر سے نکاح ایک واقعی اور سنجیدگی سے کیا گیا نکاح ہو نہ کہ ایک رسمی خانہ پری کہ جس کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کر لینے کا جواز بن جائے۔ پہلی شادی کی آزمائش چوں کہ دو بار ہو چکی ہوگی اور دونوں کے ساتھ ساتھ رہ پانے کی امید ختم ہو چکی ہوگی اس لئے عورت کے لئے بھی اور مرد کے لئے بھی پھر یہی بہتر ہوگا کہ وہ نئے زوج کے ساتھ نئی زندگی شروع کریں۔

چوں کہ شوہر کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے منھ سے طلاق دے کر شادی کو ختم کر سکتا ہے، اس لئے عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ طلاق کی ضرورت محسوس ہونے پر طلاق کا مطالبہ کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔ یہ اس لئے کہ شوہر کے ذریعہ طلاق دئے جانے کی صورت میں یہ ذمہ داری اس پر آتی ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی اور بچوں کی مدد کرے اور یہ اس کا اعتراف ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے تیار ہے۔ دوسری طرف جب خود عورت طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو علیحدگی کے قانونی اور مالی نتائج، بچوں کی تحویل اور سابق شوہر کی دوسری

ذمہ داریوں کو پورا کرانے کا فیصلہ عدالت کرے گی، چوں کہ طلاق دینے کا فیصلہ شوہر نے نہیں کیا تو اس کے اوپر یہ ذمہ داریاں بھی نہیں آتیں۔ اسے فطری طور سے یہ حق ملتا ہے اور وہ کہنے کا مجاز ہے کہ قصور اس کی بیوی کا ہے وہ خود ہی طلاق چاہتی ہے اس لئے اسے خود ہی کچھ نقصان برداشت کرنا چاہئے یا بچوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کا حق اسے نہیں ملنا چاہئے۔ ایسے حالات میں، جو کہ غیر متوقع نہیں ہیں جب عورت خود ہی طلاق کا مطالبہ کرے تو، تنازعہ کے تصفیہ کے لئے اور طلاق کے بعد کے معاملات سلجھانے کے لئے عدالتی فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاہم، یہ اسلامی شریعت کے اصولوں خلاف نہیں ہوگا اگر آج کی کسی مسلم ریاست میں طریقہ کار سے متعلق ضابطوں میں یہ لکھا جائے کہ اگر عدالت کے ذریعہ تصفیہ ہوگا یا توثیق کی جائے گی تو طلاق اور اس کے قانونی نتائج کی ذمہ داری سبھی فریقوں پر سرکاری طور سے ہی لازم ہوگی تاہم دونوں فریق تمام تفصیلات عدالت کے باہر ہی باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں، اور اس راضی نامہ پر عدالت کی مہر توثیق محض ایک رسمی خانہ پری ہی ہوگی۔ اگر کوئی عورت شوہر کی طرف سے کسی بدسلوکی کی شکایت نہ کرے اور محض اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے شوہر کے ساتھ موافقت قائم نہ کر پانے کی بنا پر طلاق کا مطالبہ کرے تو وہ شوہر پر عائد واجبات کی ادائیگی سے شوہر کو پوری طرح یا جزوی طور پر راحت دے سکتی ہے: ''ہاں اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ (زن وشوہر) اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت (خاوند کے ہاتھ سے) رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے تو (دونوں پر) کچھ گناہ نہیں''، رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کا فیصلہ ایک معاملہ میں کیا تھا جب ایک عورت نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اسے شوہر سے کوئی اخلاقی یا قانونی شکایت نہیں ہے لیکن میری طبیعت اس کی طرف مائل نہیں ہے۔ وہ اس معاملہ میں ہمیشہ خود کو قصوروار سمجھتی رہی کیوں کہ اس نے اس طرح کے احساسات کو خود ہی نامناسب سمجھا اور وہ اس جذباتی دباؤ کی وجہ سے خاندگی زندگی کا مستقل لطف نہیں اٹھا سکی۔

اگرچہ کسی جلد بازی اور عجلت سے بچنے کے لئے طلاق پر اخلاقی، قانونی اور ضابطہ بند کارروائی کے تحت قدغن لگایا گیا ہے تاہم اگر یہ ناگزیر ہی ہو جائے تو پھر بغیر کسی ناانصافی کے اسے مناسب اور سہل طریقے سے عمل میں لایا جانا چاہئے۔ طلاق مانگنے پر طلاق نہ دینا یا طلاق دینے کے بعد، بعد عدت کے دوسرا نکاح کرنے سے عورت کو روکنا ایک جبر ہے اور نقصان دہ ہے' کیوں کہ ''جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور اللہ کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ ۔۔۔۔۔ اُن کو دوسرے شوہروں کے ساتھ جب وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہو جائیں نکاح کرنے سے مت روکو''۔ مردوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ مطلقہ عورت کے حقوق ادا کریں اور ان کے حقوق کی حفاظت کریں'' اور اللہ نے تمھیں جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمھیں نصیحت فرماتا ہے اُن کو یاد کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۔۔۔۔۔ اس (حکم) سے اُس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ یہ تمہارے لئے نہایت خوب اور پاکیزگی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ (حکم) اُس شخص کے لئے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہو گا۔ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی (تو یاد

اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۘ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

رکھو کہ) نہ تو ماں کو اُس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اُس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے۔ اور اسی طرح (نان نفقہ) بچے کے وارث کے ذمے ہے اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں بشرط یہ تم دونوں پلانے والیوں کو دستور کے مطابق اُن کا حق جو تم نے دینا طے کیا تھا دیدو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس کو دیکھ رہا ہے۔ (۲:۲۳۳)

جس طرح قرآن مطلقہ عورتوں کا خیال رکھتا ہے اور طلاق دینے والے مرد کے حقوق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ہے اسی طرح وہ نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ناتواں اولاد کا بھی خیال رکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے الگ ہو جانے والے شوہر و بیوی جب اپنے ناکام ماضی کو پس پشت ڈال کر ایک کامیاب اور پر مسرت مستقبل کی جستجو میں لگتے ہیں تو ان کے بچوں کے مستقبل کا سوال کھڑا ہوتا ہے کیوں کہ بچے یا تو دونوں کی بے توجہی کا شکار ہو سکتے ہیں یا ان میں سے کسی ایک کی ممتا و شفقت سے دور ہو سکتے ہیں۔ ان آیات میں یہ یہ تاکید کی گئی ہے کہ بچے کی دیکھ بھال اس وقت تک کرنا ضروری ہے جب تک اس کو سرپرستی اور دیکھ ریکھ کی ضرورت ہے تاکہ بچے کے مفادات بھی محفوظ رہ سکیں اور والدین کے مفادات بھی کیوں کہ بچے کے مفادات والدین کے مفادات سے الگ ہو سکتے ہیں اور خاص طور سے طلاق کی صورت میں اس معاملہ میں تنازعہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ ماں بچے کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کا دودھ چھڑانے میں جلد بازی کر سکتی ہے یا بچے کو دودھ پلانے کے عوض والد سے زیادہ پیسے حاصل کرنے کا مطالبہ کر سکتی ہے یا والد کی یہ کوشش ہو سکتی ہے کہ ماں بچے کو زیادہ دنوں تک دودھ پلائے تاکہ بچے کی غذا کا خرچہ اٹھانے سے وہ بچا رہے۔ یہاں قرآن بچے کے مفادات اور حقوق کا تحفظ کرتا ہے جو کہ خود اپنے لئے ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ماں پر بچے کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری نہیں ہے، جب تک وہ دودھ پلائے گی تو بچے کے باپ سے اپنے اور اپنے بچے کے لئے نفقہ پاتی رہے گی۔ نکاحی بیوی کی صورت میں تو یہ ہے ہی لیکن طلاق ہو جانے کی صورت میں بھی اسے یہ حق ہے [نیز دیکھیں ۶۵:۵ تا ۶]۔

درج بالا آیت اگرچہ نفقہ کے تخمینے اور مطلقہ عورت و بچے کی ضروریات سے متعلق ہے تاہم یہ انصاف کے اصولوں کو بھی اجاگر کرتی ہے اس طرح کہ مختلف فریقوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو واضح کرتی ہے: ''ماں پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے: نہ تو ماں کو اُس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اُس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے''۔ اگر سابقہ شوہر مر جاتا ہے تو مطلقہ اور اس کے بچے کا نفقہ اس کے وارثین کے ذمہ ہوگا۔

ایک اور اصول بچے کی پرورش سے متعلق یہ بیان کیا گیا جو کہ پورے کنبہ کی زندگی پر لاگو ہوتا ہے کہ'' اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں''۔ آپسی صلاح و مشورہ اور باہمی رضامندی گھر کے معاملات کو چلانے کی بنیاد ہے۔ تبادلہ خیال اور مشورہ کئے بغیر یہ مان لینا کہ رضامندی ہے یا اس بارے میں بات چیت کرنا لیکن کسی

رضامندی پر پہنچے بغیر یک طرفہ طور سے فیصلہ لے لینا دونوں ہی طریقے نامناسب ہیں اور ایک مستحکم اور خوش گوار گھریلو زندگی گزارنے کے لئے معاون نہیں ہیں۔ اس زمانے میں بچے کی رضاعت کے تعلق سے بچوں کے معالج کی صلاح سے اس معاملہ میں فیصلہ لیا جاسکتا ہے۔ چوں کہ بچے کی دیکھ ریکھ قانونی لحاظ سے ماں کی ذمہ داری نہیں ہے اس لئے کوئی دوسری عورت بھی بچے کو دودھ پلاسکتی ہے اور اس کے لئے بچے کے باپ کی طرف سے اسے مناسب معاوضہ دیا جائے گا، یہی رضاعی ماں بچے کی حفاظت کی ذمہ دار ہوگی اور دودھ پلانے کی ذمہ داری سے فارغ ہونے کے بعد بچے کو صحیح وسلامت اس کی ماں کو واپس کرے گی۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اور اگر تم عورتوں کو اُن کے پاس جانے یا اُن کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دیدو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ ہاں اُن کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔ نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے۔ اور اگر تم عورتوں کو اُن کے پاس جانے سے پہلے طلاق دیدو لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا۔ ہاں اگر عورتیں بخش دیں یا مرد جن کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں (اور پورا مہر دیدیں تو اُن کو اختیار ہے) اور اگر تم مرد لوگ ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔ اور آپس میں بھلائی کرنے کو فراموش نہ کرنا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔
(۲:۲۳۶ تا ۲۳۷)

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نکاح قانونی طور سے منعقد ہوجائے یعنی نکاح کی لازمی رسم پوری کرلی جائے لیکن شوہر و بیوی کے درمیان وصال (مباشرت) نہ ہو اور اس سے پہلے ہی کسی وجہ سے طلاق کا فیصلہ ہوجائے۔ ایسی طلاق کو قرآن جائز رکھتا ہے، کیوں کہ کشیدگی اور مستقل ناگواری کی زندگی سے بہتر یہ ہے کہ الگ ہوجائیں۔ ''غیر مدخولہ'' مطلقہ بیوی کو یہ حق ہے کہ اگر اس کا مہر پہل طے ہو چکا ہو تو اس میں سے آدھا وہ وصول کرلے کہ طلاق کی وجہ سے اسے جو ذہنی اور نفسیاتی صدمہ پہنچا اس کی تلافی ہو۔ البتہ طلاق دینے والے شوہر کو یہ قرآن یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے مہر کا باقی نصف حصہ بھی خاتون کو ہی دیدے۔ اسی طرح ایسی عورت کو بھی یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ بھی احسان کے طور پر اپنے حق سے دست بردار ہوسکتی ہے، اور اگر طلاق کی خواہش خود اسی نے کی ہو تو یہ اس کے لئے خاص طور سے ایک مناسب بات ہوگی۔ یہاں بھی قرآن اسی بات پر زور دیتا ہے جو قرآن میں جگہ جگہ کہی گئی ہے کہ اخلاقیات اور خدا ترسی قانون سے بالاتر چیز ہے، اور احسان کا عمل نہ صرف بہتر ہے بلکہ انسانی تعلقات کو بنائے رکھنے کے لئے ضروری بھی ہے ''اور اگر تم اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔ اور آپس میں بھلائی کرنے کو فراموش نہ کرنا'' اگر نکاح کے وقت مہر کا تعین نہ ہوا ہو تو غیر مدخولہ عورت کو اس کی صوابدید کے مطابق نفقہ دینا ہوگا: مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔ نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے''۔

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۴۱
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲۴۲

اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہئے پرہیزگاروں پر (یہ بھی) حق ہے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (۲:۲۴۱ تا ۲۴۲)

مطلقہ عورت کو اس کی عدت کی مدت میں ایک مناسب نفقہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بچے یا بچوں کی ضروریات کے لئے جب تک بھی وہ ماں کی زیر کفالت ہوں مطلقہ کو مناسب رقم فراہم کرتے رہنا بھی اس آیت میں مطلقہ کا عام حق بتایا گیا ہے۔ اس حق کے لئے نہ تو کسی مدت کا تعین کیا گیا ہے اور نہ متعین رقم کا؛ ''متمول آدمی اپنے وسائل کے حساب سے اور سیدھا سادا آدمی اپنے حالات کے لحاظ سے''۔ کچھ فقہا (جیسے شافعی، ابوطحاور اور الطبری وغیرہ) نے اس آیت کو تمام مطلقہ عورتوں کے لئے طلاق دینے والے شوہر کی اضافی ذمہ داری کی نظر سے دیکھا ہے چاہے وہ مدخولہ ہوں یا غیر مدخولہ، چاہے ان کا مہر مقرر ہو یا نہیں، اور چاہے وہ غلام عورت ہوں یا آزاد عورت۔ ملک کے حکام یا عدالتیں اس اضافی حق کے لئے زیادہ سے زیادہ مدت کا تعین کرسکتی ہیں کہ یہ عورت کے دوسری شادی کرنے تک جاری رہے گا یا جب ضرورت نہ رہے۔

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝۱۳۰

اور اگر میاں بیوی (میں موافقت نہ ہو سکے اور) ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی دولت سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور حکمت والا ہے۔ (۴:۱۳۰)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۴۹

مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے اُن کو ہاتھ لگانے (یعنی اُن کے پاس جانے) سے پہلے طلاق دیدو تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ اُن سے عدت پوری کراؤ اُن کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے رخصت کر دو۔ (۳۳:۴۹)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝۱ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

اے پیغمبر! (مسلمانوں سے کہہ دو) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور اللہ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرو (نہ تو تم ہی) ان کو (ایام عدت میں) ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ (خود ہی) نکلیں الا یہ کہ وہ صریح بے حیائی کریں، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا (اے طلاق دینے والے!) تجھے کیا معلوم کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کر دے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۙ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾ وَ الّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴿۵﴾

پھر جب وہ اپنی عدت کی مدت پر پہنچ جائیں تو یا تو ان کو معروف طریقے سے روک لو یا اچھی طرح سے علیحدہ کر دو اور اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ کر لو اور (گواہو!) اللہ کے لئے درست گواہی دینا ان باتوں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لئے نکلنے (کے حالات) بنا دے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو، اور جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کے لئے کافی ہے؛ اللہ اپنے کام کو پورا کر دیتا ہے اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ اور تمہاری (مطلقہ) عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور جن کو ابھی حیض نہیں آتا (ان کی عدت بھی یہی ہے) اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے؛ اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا۔ یہ اللہ کے حکم ہیں جو اللہ نے تم پر نازل کئے ہیں، اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس سے اس کے گناہ دُور کر دے گا اور اسے اجرِ عظیم بخشے گا۔

(۶۵:۱ تا ۵)

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَ اْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ﴿۶﴾ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴿۷﴾

(مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو اور اگر حمل سے ہوں تو بچہ جننے تک ان کا خرچ دیتے رہو پھر اگر وہ بچے کو تمہارے کہنے سے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو اور (بچے کے بارے میں) پسندیدہ طریق سے موافقت رکھو اور اگر باہم ضد (اور نااتفاقی) کرو گے تو بچے کو اس کے (باپ کے) کہنے سے کوئی اور عورت دودھ پلائے گی، (اس کے لئے) صاحبِ وسعت کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے اور جس کے رزق میں تنگی ہو وہ جتنا اللہ نے اس کو دیا ہے اس کے موافق خرچ کرے، اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس کو دیا ہے، اور اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا۔ (۶۵:۶ تا ۷)

یہ آیات طلاق کے عمل کے لئے مزید قانونی اور عملی سیف گارڈس (حفاظتی تدابیر) بتاتی ہیں۔ اس سے پہلے کی آیات (۲:۲۲۹ تا ۲۳۰) میں کہا گیا کہ ایک جوڑے کے درمیان تین بار سے زیادہ طلاق کا فیصلہ نہیں لیا جاسکتا اور پہلی دوطلاقوں کے بعد مراجعت کی گنجائش ہے لیکن تیسری بار طلاق دینے پر مستقل علیحدگی لازم ہوجاتی ہے اور اب نکاح نہیں ہوسکتا ہے۔ بہت سے ممتاز فقہاء نے کہا ہے کہ ہر ایک طلاق ایک طہر میں ایک بار دینی چاہئے اور اس حالت طہر میں دونوں نے مجامعت نہ کی ہو۔ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ طلاق حالت حیض میں نہیں دی جاسکتی کیوں کہ اس حالت میں عورت و مرد دونوں طبعی اور نفسیاتی دباؤ میں ہوتے ہیں، نہ ایسی طہر کی مدت میں دی جاسکتی ہے جس میں دونوں مجامعت کر چکے ہوں کیوں کہ اس تعلق سے زوجین کے درمیان قربت پیدا ہوتی ہے اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نکاح برقرار رہ سکتا ہے اور زوجین کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے مزید وقت دیا جانا چاہئے۔ زوجین کو پہلی یا دوسری طلاق کے لئے مقررہ وقت کا لحاظ کرنا ہوگا، اور عدت کے دن گنتے رہنا چاہئیں تا کہ ان دونوں طلاقوں سے مراجعت اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے بغیر نکاح کے کی جاسکے۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جاچکا ہے، یہ عدت کی مدت تین حیض یا تین طہر کے حساب سے طے کی جائے گی (الگ الگ فقہی رائے کے حساب سے کیوں کہ قرآن (۲:۲۲۸) میں جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے دونوں مطلب لئے جاسکتے ہیں)۔

ان آیات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مطلقہ عورت کو گھر سے نہیں نکالنا چاہئے اور قرآن میں اس کے لئے ''ان کے گھروں'' کی ترکیب استعمال کی گئی ہے، نہ انہیں اس وقت تک گھر سے نکلنے کے لئے کسی بھی طرح مجبور کیا جائے جب تک کہ وہ کھلے طور سے کسی بے حیائی کے کام میں ملوث نہ پائی جائیں۔ اوپر کی آیتوں میں سے دوسری آیت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جیسا کہ اس سے پہلے آیت ۲:۲۲۹ میں تاکید کی گئی تھی کہ علیحدگی مناسب طریقے سے عمل میں آنا چاہئے، اور اگر عدت کے دوران مراجعت کر لی جائے تو یہ بھی مناسب طریقے سے ہی ہوتا کہ گھر کی زندگی کا سکون اور وقار بنا رہے۔ یہ آیات اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ نکاح کو برقرار رکھنے کا فیصلہ بھی اور طلاق کو عمل میں لانے کا فیصلہ بھی، بعض فقہاء کی رائے کے مطابق، ''اپنے میں سے دو منصف گواہوں'' کی موجودگی میں ہونا چاہئے۔ یہ طریقہ کار جیسا کہ آج ہمارے زمانے میں بھی متعلقہ افسر کے یہاں رجسٹرڈ ہونا ضروری ہے، فیصلہ کو مستحکم اور سنجیدہ بناتا ہے۔ گزشتہ آیات یہ اشارہ کرتی ہیں کہ عدت کے دن کی گنتی مطلقہ عورت کے ایام حیض سے شروع کرنا چاہئے۔ جو عورتیں حیض آنے کی عمر سے نکل چکی ہوں یا انہیں اور کسی سبب سے حیض آنا رک گیا ہو تو عدت کے دن کلینڈر کے تین مہینوں کے حساب سے شمار کئے جائیں گے۔ حاملہ عورت کے سلسلے میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ان کی عدت کی مدت چار مہینے اور دس دن ہے جو کہ قرآن میں ہر بیوہ کے لئے ایک عام اصول کے طور پر طے کی گئی ہو [۲:۲۳۴]، جب کہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حاملہ عورت کے لئے عدت کی مدت بچے کی پیدائش تک ہے جیسا کہ قرآن میں حاملہ مطلقہ کے لئے ایک عام اصول کے طور پر بتائی گئی ہے۔ یہ دوسرا طبقہ اپنی رائے کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث پیش کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پیدائش کے ساتھ ہی حاملہ عورت کی مدت ختم ہوجانی چاہئے اگر چہ اس وقت تک چار مہینے اور دس دن کا عرصہ پورا نہ ہوا ہو [دیکھیں تفسیر ابن کثیر میں آیت ۲:۲۳۵ کی تشریح]۔

اوپر درج آخر کی دو آیتوں میں مطلقہ عورت کے نفقہ کی کچھ تفصیل دی گئی ہے [۲:۲۴۱]، اور یہ کہ اس نفقہ میں کیا کیا چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ یہ آیت یہ کہتی ہے کہ مطلقہ عورت اگر اپنا گھر چھوڑتی ہے تو اس کی رہائش کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ رہائش ویسی ہی ہونا چاہئے جیسے شوہر کی ہے البتہ شوہر کی استطاعت کے مطابق ہی ہوگی اور رہائش گاہ فراہم کرنے میں نیز دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی میں یا اور کسی

بہانے سے مطلقہ عورت کو کوئی نقصان یا تکلیف نہیں دینی چاہئے۔ نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کی پرورش ماں کی ذمہ داری نہیں ہے؛ اسے اس کے لئے خرچہ دیا جائے گا، اور اگر وہ بچے کو دودھ پلانے یا اس کی پرورش کرنے پر راضی نہیں ہے تو کسی دوسری عورت سے یہ خدمت لی جائے گی اور اسے اس کا معاوضہ دیا جائے گا۔ ہر شوہر کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی پر اس حد تک خرچ کرے اور اس حد تک اس کے آرام کا خیال رکھے جتنا اس کے بس میں ہے، اور نفقہ کے معاملے میں اسلام کا یہ عام اصول انصاف اپنایا جائے گا کہ ''اللہ کسی متنفس پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا'' [نیز دیکھیں ۲:۲۳۳، ۲۸۶؛ ۶:۱۵۲؛ ۷:۴۲؛ ۲۳:۶۲]۔

ان تمام آیات سے اور قانونی معاملات سے متعلق دیگر قرآنی آیتوں سے بھی، یہ پتہ چلتا ہے کہ قانون اللہ کے تقوے پر مبنی ہے اور تقوے و اخلاق و ضمیر سے اس کا مستقل تعلق ہے ''اس طرح ہر اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لئے (رنج و محن سے) مخلصی (کی صورت) پیدا کر دے گا۔۔۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو۔۔۔ اور جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔۔۔ اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا''۔ شریعت اسلامی کا بنیادی وصف یہ ہے کہ قانونی لوازم بغیر ایمان و اخلاق کے کارآمد نہیں ہو سکتے اور یہ تینوں چیزیں فرد اور سماج کے رویہ میں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہونا چاہئیں۔ آج کی دنیا میں بہت سے بنے بنائے قانون خود قانون نافذ کرنے والوں کی بدعنوانی سے ہی ناکام ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات خود وہ لوگ جن کے مفاد میں قانون بنائے جاتے ہیں وہ بھی اپنی بدعنوانی سے قانون کو بے فائدہ بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ آدمی کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا چاہئے جو اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا اور جو اسے اپنی قانونی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے متحرک کرے چاہے راہ میں کتنی ہی مشکلات اور رکاوٹیں ہوں۔ حب الوطنی کا فلسفہ تمام لوگوں کو قائل نہیں کر سکتا اور ہمیشہ موثر نہیں رہ سکتا۔ قانون کا موثر اور کارگر نفاذ ٹھوس اخلاقی بنیادوں کا متقاضی ہے جو انفرادی تربیت اور عام تعلیم سے پیدا ہو سکتی ہیں تاکہ افراد اور سماج تمام طرح کے دباؤ اور دشواریوں کے باوجود اپنی قانونی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لائق بن سکیں۔ اس لحاظ سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی کیوں ایمان کی گہرائی اور گیرائی تک کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی۔

نکاح کو برقرار رکھنے یا ختم کر دینے کے لئے تصفیہ

وَ اِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِہَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَہُمَا صُلۡحًا ؕ وَ الصُّلۡحُ خَیۡرٌ ؕ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۲۸﴾

اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح خوب (چیز) ہے، اور طبیعتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اگر تم نیکوکاری اور پرہیزگاری کرو گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (۴:۱۲۸)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَ مَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

طلاق (صرف) دو بار ہے (یعنی جب دو دفعہ طلاق دیدی جائے تو) پھر (عورت کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ جو مہر تم اُن کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ واپس لے لو۔ ہاں اگر زن و شوہر کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت (خاوند کے ہاتھ سے) رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے ڈالے تو (دونوں پر) کچھ گناہ نہیں یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے باہر نکل جائیں گے وہ گنہگار ہوں گے۔ (۲۲۹:۲)

کوئی عورت جب شوہر کی طرف سے کسی بدسلوکی یا ناانصافی کی شکایت کے بغیر صرف اپنی جذباتی کیفیت کی وجہ سے طلاق کا مطالبہ کرے تو جس طرح طلاق حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے کچھ حقوق سے دست بردار ہوسکتی ہے یا شوہر کو کوئی پیش کش کرسکتی ہے [۲۲۹:۲]، اسی طرح وہ نکاح کو برقرار رکھنے کے لئے بھی کچھ حقوق سے دست بردار ہوسکتی ہے [۱۲۸:۴]۔ جب شوہر کی طرف سے موافقت نہ ہو تو بیوی گھر کو بنائے رکھنے کے لئے شوہر کو کچھ رعایت دے سکتی ہے جیسے جسمانی قربت نہ ہونے پر راضی ہوجانا یا شوہر کو دوسرے نکاح کا موقع دینا اگر وہ تمام قانونی تقاضے پورے کرکے ایسا کر رہا ہو اور بظاہر یہ ممکن ہو، یا دوسری بیوی کو زیادہ وقت دینے پر راضی ہوجانا۔ جس طرح سے بھی تصفیہ ہو، تو قرآن کے مطابق تصفیہ بہرحال طلاق سے بہتر ہے، خاص طور سے تب جب بیوی کسی سبب سے خود اپنے دم پر زندگی نہ گزار سکتی ہو، یا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایک طویل وقت گزار چکے ہوں، یا چھوٹے بچے ہوں جن کو ابھی والدین کے سہارے کی ضرورت ہو اور شوہر و بیوی کی علیحدگی کی صورت میں ان کے لئے دشواریاں کھڑی ہوسکتی ہوں، وغیرہ۔

وَ الَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَ يَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّ عَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِهٖ مِنۡ خِطۡبَةِ النِّسَآءِ اَوۡ اَكۡنَنۡتُمۡ فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُوۡنَهُنَّ وَ لٰكِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۬ۙ

اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں تو عورتیں چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں اور جب (یہ) عدت پوری کر چکیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ اگر تم (اشارے) کنائے کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُن سے (نکاح کا) ذکر کرو گے مگر (ایام عدت میں) اس کے سوا کہ دستور کے مطابق کوئی بات کہہ دو۔ پوشیدہ طور پر اُن سے قول و اقرار نہ کرنا اور جب تک عدت پوری نہ ہو لے نکاح کا

وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

پختہ ارادہ نہ کرنا۔ اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور حلم والا ہے۔ (۲:۲۳۴ تا ۲۳۵)

جب عورت کا شوہر جو کہ اس کا سہارا ہوتا ہے اس کے پاس نہ رہے تو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں دوسرے لوگ اس کا حق نہ ماریں، یا وہ خود اپنے شوہر کے ترکے میں سے دوسروں کی لاعلمی میں دوسروں کا حق نہ لے لے، یا شوہر کے اوپر کچھ واجبات ہوں اور وہ صرف بیوی کو ہی معلوم ہوں تو ہوسکتا ہے وہ اسے چھپالے۔ اس لئے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین ضروری ہے تاکہ سبھی فریقوں کے ساتھ انصاف ہوسکے۔ بیوہ عورت کو دوسری شادی کرنے سے پہلے چار مہینے اور دس دن کی عدت پوری کرنی ہوتی ہے؛ یہ عدت مطلقہ عورت کی عدت سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ ہے دونوں معاملوں کی کیفیت الگ الگ ہونا۔ طلاق سے عورت کو جذباتی اور نفسیاتی صدمہ پہنچتا ہے، ایسی کیفیت میں عدت کی مدت مطلقہ عورت کی رعایت میں ممکن حد تک کم ہی ہونا چاہئے، جب کہ شوہر کی موت سے بیوہ ہونے والی عورت کو شوہر اپنی مرضی سے چھوڑ کر نہیں جاتا بلکہ قضائے الٰہی اسے دنیا سے لے جاتی ہے، ایسی صورت میں متوفی شوہر کے تئیں اپنی وفاداری ومحبت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری شادی کرنے سے پہلے بیوہ عورت کو مطلقہ عورت کی بہ نسبت زیادہ لمبے عرصے تک انتظار کرنا چاہئے۔ تاہم اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لئے جو بھی جائز اور شریفانہ فیصلہ کرے عدت پوری ہوتے ہی اس پر عمل کرسکتی ہے۔ اگر بیوہ عورت حاملہ ہے، تو اس کی عدت کی مدت بچے کی پیدائش تک ہے چاہے اس میں چار مہینے دس دن سے زیادہ کا ہی عرصہ لگے، ایک فقہی رائے کے مطابق؛ اور ایک دوسری فقہی رائے کے مطابق جو کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث پر مبنی ہے، یہ مدت بچہ پیدا ہوتے ہی ختم ہوجاتی ہے [دیکھیں تفسیر ابن کثیر آیت ۲:۲۳۵]۔

کوئی مرد جو کسی بیوہ عورت سے شادی کا خواہش مند ہو وہ اس عورت کی عدت ختم ہونے سے پہلے واضح طور سے اسے نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا۔ البتہ وہ اشارے، کنائے میں اپنے ارادے کو ظاہر کرسکتا ہے تاکہ عورت کو اس سلسلے میں سوچنے کا کچھ موقع مل جائے یا یہ کہ عورت کے پاس کوئی اور تجویز آنے سے پہلے وہ اپنے ارادے سے عورت کو واقف کرادینا چاہے۔ بہرحال، بیوہ عورت جس نے اپنے شوہر کو کھودیا ہو اس کے حالات کا لحاظ ہمیشہ رکھنا چاہئے، کسی مرد کی طرف سے کوئی اشارہ کنایہ یا عورت کی طرف سے کوئی مثبت اشارہ اخلاق وشرافت کے دائرے میں ہی ہونا چاہئے'' اور جب تک عدت پوری نہ ہو لے نکاح کا پختہ ارادہ نہ کیا جائے ۔۔۔ اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے تو اس سے ڈرتے رہو۔۔۔''۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۗ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ اُن کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ ہاں اگر وہ خود گھر سے نکل جائیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کرلیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔ (۲:۲۴۰)

شوہر کے لئے یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بعد اپنی بیوہ عورت کے آرام وسکون کو یقینی بنانے کے لئے ایک سال تک اس کے رہنے بسنے کا انتظام کرے اور اگر وہ اپنی خوشی ومرضی سے بغیر کسی دباؤ کے شوہر کے خاندانی گھر سے جانا چاہے تو جاسکتی ہے ورنہ اسے اس کے لئے ایک سال تک مجبور نہیں کیا جائے گا۔ یہ انتظام شوہر کے ترکے میں بیوی کے ورثے سے اور شوہر کی طرف سے اس کے حق میں کی گئی کسی خاص وصیت سے الگ ہے، کیوں کہ اس آیت (۲:۲۴۰) میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اور بیوہ عورت کی وراثت کے بارے میں آیت ۴:۱۲ میں جو تعلیم دی گئی ہے اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بچوں کے ساتھ والدین کا تعلق

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق و) زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے رب کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔ (۱۸:۴۶)

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

لوگوں کو اُن کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور اللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے۔ (۳:۱۴)

دوسرے حیوانات کی طرح انسان بھی یہ جبلت رکھتا ہے کہ اولاد پیدا کرے اور نسل انسانی کا سلسلہ جاری رکھے۔ اسی طرح انسان کی جبلت یہ بھی ہے کہ وہ مال ودولت کو بھی پسند کرتا ہے، اسے اپنی ملکیت بنانا اور اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ قرآن چوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کہ تمام انسانوں کا خالق ہے، ایک رہنمائی ہے، اس لئے وہ اس انسانی جبلت کی اصولی طور پر مخالفت نہیں کرتا [دیکھیں کہ اللہ نے اولاد اور مال کو اپنا فضل قرار دیا ہے اور رسول اللہ کی حدیثوں میں بھی اس میں برکت کی دعائیں دی گئی ہیں؛ نیز دیکھیں اللہ کی طرف سے رزق اور مال ومتاع اور اولاد کی تمنا کے لئے آیات قرآنی ۲:۱۲۶، ۲۰۱، ۲۸۰؛ ۳:۷ ۳ تا ۳۸؛ ۵:۱۱۴؛ ۷:۳۲؛ ۱۱:۷۱ تا ۷۳؛ ۱۳:۳۸؛ ۱۴:۳۷؛ ۱۵:۲ تا ۱۹؛ ۲۱:۸۹؛ ۲۹:۱۷؛ ۵۱:۲۸ تا ۳۰؛ ۶۵:۷؛ ۶۷:۱۵]، البتہ قران انسان کی یہ رہنمائی کرتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں متوازن رویہ اختیار کرے اور خود پسندی و مادہ پرستی کی مختلف قسموں جیسے شاؤنزم (یعنی اپنے خاندان، قبیلے یا قوم کی بالادستی قائم کرنے کے جذبے) یا لالچ سے بچے۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان اس توازن کو قائم رکھنے کے لئے تصوراتی بنیاد فراہم کرتا ہے، کیوں کہ اس ایمان سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا سفر اس دنیا اور اس کی راحتوں ومسرتوں تک ہی محدود نہیں ہے اور ہر ایک کو جواب دہ ہونا ہے اور اس دنیا میں کئے گئے اپنے کاموں کی جزا پانا ہے اور ایک ابدی زندگی آگے آنے والی ہے۔ اسلام کے پیغام میں موجود اخلاقی قدریں اور قانونی ضابطے اس توازن کو بنائے رکھنے کے لئے عملی طریقہ دیتے ہیں۔

والدین پر بچوں کو پالنے پوسنے اور مختلف پہلوؤں سے ان کی نشوونماء کرنے قانونی ذمہ داری ہے یعنی انہیں جسمانی، عقلی، نفسیاتی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے پروان چڑھانا، اور یہ کام اسی وقت سے شروع ہوجاتا ہے جب بچہ اپنی ماں کے رحم میں موجود ہوتا ہے [۲:۲۲۳]۔ قرآن اس بات کو سختی سے منع کرتا ہے کہ بچے کو قتل کیا جائے، چاہے یہ قتل براہ راست ہو یا جسمانی و اخلاقی لحاظ سے اس کی پرواہ نہ کرکے بالواسطہ ہو۔ [۶:۱۳۷، ۱۴۰، ۱۵۱؛ ۱۶:۵۸ تا ۵۹؛ ۱۷:۳۱؛ ۶۰:۱۲؛ ۸۱:۸ تا ۹]۔ بچوں کے حقوق میں یہ بھی شامل ہے کہ والدین بچہ کا اچھا سا نام رکھیں اور برا نام رکھنے سے پرہیز کریں [حدیث رسول بروایت ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی اور دارمی]۔ بچے کا نام اس کے والد کے نام کے ساتھ جوڑا جانا چاہئے: ''انہیں ان کے باپ کی نسبت سے پکارو؛ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ عدل کی بات ہے'' [۳۳:۴ تا ۵] اور جب والدین میں سے کسی کی موت ہوجائے تو بچوں کا وراثت میں سب سے زیادہ حصہ ہے [۴:۷، ۱۰]۔

وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا کہ) بیٹا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہی دین پسند فرمایا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔ (۲:۱۳۲ تا ۱۳۳)

یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تجربات بچوں کو بتائیں اور ان کی رہنمائی کریں، انہیں تاکید کریں اور ان کی نگرانی کریں بغیر اس کے کہ ان پر جبر کریں: ''اپنے آپ کو اپنے اہل وعیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں'' [۶۶:۶] یہ بات انبیاءکرام کے اسوہ سے بھی ظاہر ہے جنھوں نے اپنے قریب ترین لوگوں کو یعنی اپنے گھر کے افرد کو، اپنے اہل وعیال کو اللہ کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کی۔ قرآن میں حضرت نوح کا قصہ کئی جگہ بیان ہوا ہو جنھوں نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ وہ ایمان لانے والوں میں سے ہوجائے اور ایمان والوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوجائے تاکہ سیلاب میں ڈوبنے سے بچ جائے، اور پھر جب طوفان نمٹ گیا تو حضرت نوح نے عاجزی وانکساری سے اللہ سے جو دعا کی اس کو بھی قرآن میں نقل کیا گیا ہے: ''اور وہ اُن کو لے کر (طوفان کی) لہروں میں چلنے لگی (لہریں کیا تھیں) گویا پہاڑ (تھے) اس وقت نوح نے اپنے بیٹے کو کہ (کشتی سے) الگ تھا پکارا کہ بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور کافروں میں شامل نہ ہو۔ اُس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جالگوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔ اُنہوں نے کہا کہ آج اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے (اور نہ کوئی بچ سکتا ہے) مگر جس پر اللہ رحم کرے اتنے میں دونوں کے درمیان لہر حائل ہوئی اور وہ ڈوب کر رہ گیا۔۔۔۔۔۔

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا! ، اللہ! میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے (تو اُسکو بھی نجات دے) تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے

بہتر حاکم ہے۔اللہ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے وہ تو غیر صالح عمل ہے تو جس چیز کی تمہیں حقیقت معلوم نہیں اُس کے بارے میں مجھ سے سوال ہی نہ کرو اور میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادان نہ بنو۔نوح نے کہا، میرے رب! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی مجھے حقیقت معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔حکم ہوا کہ نوح ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ (جو) تم پر اور تمہارے ساتھ کی جماعتوں پر (نازل کی گئی ہیں) اتر آؤ اور کچھ اور جماعتیں ہوں گی جن کو ہم (دنیا کے فوائد سے) محظوظ کریں گے پھر ان کو ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا (۱۱:۴۲ تا ۴۳، ۴۵ تا ۴۸؛ نیز دیکھیں ۴۶:۱۷)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آخری دم تک اپنے بچوں کو یہ تلقین کی کہ اللہ پر ایمان رکھیں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کی ہدایت پر چلیں، ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی یہی نصیحت اپنے بچوں کو کی تھی۔حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) نے جب اللہ کی عبادت کے گھر خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی تو انھوں نے اللہ سے دعا کی ''۔اے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بناتے رہنا اور (اللہ) ہمیں ہمارے طریقِ عبادت بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما بے شک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے'' [۲:۱۲۸]۔لیکن جب حضرت ابراہیم نے اللہ سے یہ دعا کی کہ ان کی اولاد کو بھی لوگوں کا امام بنایا جائے تو اللہ کی طرف سے یہ دوٹوک جواب ملا کہ امامت وسیادت فرد کی لیاقت کی بنیاد پر دی جاتی ہے آبائی نسبت کی بنیاد پر نہیں: ''اللہ نے جواب دیا، میرا وعدہ ظالموں (گنہگاروں) کے لئے نہیں ہے'' [۲:۱۲۴]

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾

اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی کہ اللہ کا شکر کرو اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بھی بے پرواہ اور سزاوارِ حمد (وثنا) ہے۔اور (اس وقت کو یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا شرک تو بڑا (بھاری) ظلم ہے۔(۳۱:۱۲ تا ۱۳)

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَ

(لقمان نے یہ بھی کہا کہ) بیٹا! اگر کوئی عمل (بالفرض) رائی کے دانے کے برابر بھی (چھوٹا) ہو اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں میں (مخفی ہو) یا زمین میں، اللہ اس کو قیامت کے دن لا موجود کرے گا کچھ شک نہیں کہ اللہ باریک بین (اور) خبردار ہے۔بیٹا! نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کاموں کے کرنے کی تاکید اور بُری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اُس پر صبر کرنا بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔اور (ازراہِ غرور) لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا کہ اللہ کسی اِترانے والے خود

اقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾

پسند کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا کیونکہ (اونچی آواز گدھوں کی ہے اور کچھ شک نہیں کہ) سب آوازوں سے بُری آواز گدھوں کی ہے۔

(۳۱:۱۶ تا ۱۹)

والدین کو اپنی اپنے بچوں کی تعلیم اور انہیں عقلی، نفسیاتی اور روحانی واخلاقی ہر لحاظ سے ترقی دینے پر توجہ دینا چاہئے، جس طرح وہ ان کی جسمانی نشوونماء کا اور ان کی مادی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ حضرت لقمان قدیم عرب میں ایک حکیم ودانا کے طور پر معروف تھے۔ درج بالا آیات میں اپنی اولاد کو ان کی جو نصیحتیں نقل کی گئی ہیں وہ بچوں کو اخلاق سکھانے اور تعلیم دینے کا ایک مستقل نمونہ ہیں کہ اس طرح نصیحت کے لہجے میں سمجھایا جانا چاہئے نہ کہ بچوں پر بات کو تھوپا جائے اور ان پر حکم چلایا جائے۔ ایک اللہ پر ایمان اور اس کی عبادت سے اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے کہ یہ دونوں چیزیں انسان کے اندرون میں فروغ پاتی ہیں، اور ایک اللہ پر ایمان رکھنے والا اور اس کی عبادت کرنے والا انسان ہمیشہ راست بازی کے حق میں اور غلط کاری کے خلاف کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً مسائل کھڑے ہوتے ہیں لیکن اس کی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک نہیں کرنا چاہئے؛ جو شخص نیکی کی طرف بلاتا ہے اسے لوگوں کی بدسلوکی کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہئے اور صبر سے کام لینا چاہئے اور جس مقصد پر وہ کاربند ہے اس پر جمے رہنا چاہئے۔ لیکن جو شخص اسے اپنی ذات اور انا کا مسئلہ بنائے گا وہ انا کے کبر میں اس اخلاقی فضیلت سے گر سکتا ہے کیوں کہ وہ خود کو اچھائیوں کا محافظ اور برائیوں کا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ یہ آیات دعوت واصلاح کے ایسے فعال کارکن کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ انانیت اور رعونت بھی بے عملی اور گناہوں کی طرف رغبت سے کم بری چیز نہیں ہے۔ قرآن میں حضرت لقمان کے ذریعہ بیٹے کو کی گئی نصیحت نقل کی گئی ہے اس سے یہ تاکید ہوتی ہے کہ خود اعتمادی اور صحت مند انفرادیت بچے کے اندر بچپن میں ہی گھر کی تربیت سے آجانی چاہئے، تاکہ وہ سماج کا ایک تعمیری اور فعال عنصر بن سکے۔

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

اور وہ جو (اللہ سے) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔

(۲۵:۷۴؛ نیز دیکھیں ۴۶:۱۵)

والدین اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کا پورا خیال رکھتے ہیں اور انہیں جسمانی، نفسیاتی عقلی اور اخلاقی پختگی کے لحاظ سے لوگوں کے لئے ایک نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے دعا بھی کرتے ہیں [نیز دیکھیں ۱۴:۴۰؛ ۴۶:۱۵]۔ آخرت میں بھی والدین اپنے خاندان والوں کو، خاص طور سے اپنے بچوں کو، اللہ کے نزدیک مقبول اور انعام یافتہ لوگوں میں دیکھنا چاہیں گے اور جنت میں ان کو اپنے ساتھ دیکھنے کی آرزو رکھیں گے [۱۳:۲۳؛ ۴۰:۸؛ ۵۲:۲۱]۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝

جو مال ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ کر مریں، تھوڑا ہو یا بہت، اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی، یہ حصے (اللہ کے) مقرر کئے ہوئے ہیں۔ (۴:۷)

بچوں کو مادی طور سے آسودہ رکھنے اور دیکھنے کی والدین کی ذمہ داریاں ان کی زندگی کے بعد بھی جاری رہتی ہیں، اور اسی لئے قرآن نے والدین کی وراثت میں بچوں کا حصہ مقرر کیا ہے۔ بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کے لئے متناسب حصہ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ وراثت کے باب میں قرآن کے اصولوں کا بیان آگے آ رہا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

مومنو! تمہارا مال اور اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرے گا تو وہ لوگ خسارا اٹھانے والے ہیں۔ (۹:۶۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

مومنو! تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو اور اگر معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہے اور اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔ سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو اور (اس کے احکام کو) سنو اور (اس کے) فرماں بردار رہو اور (اس کی راہ میں) خرچ کرتے رہو (یہ) تمہارے حق میں بہتر ہے؛ اور جو شخص طبیعت کے بخل سے بچایا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔ (۶۴:۱۴ تا ۱۶)

انسان میں اپنے خاندان اور رشتے داروں کے ساتھ تعلقات اور ان کے تئیں جذبات رکھنے کا سلسلہ اگرچہ حضرت آدم اور ان کی زوجہ کی تخلیق کے وقت سے چلا آ رہا ہے، لیکن ان جذبات اور تعلقات کے زیر اثر آدمی کو بے جا اقرباء نوازی اور خاندانی برتری کے خبط میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ آدمی (مرد یا عورت) کو اس بات سے محتاط رہنا چاہئے کہ اس کے قریب ترین لوگ، اس کے اہل وعیال میں کوئی ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اس کے مفادات یا اقدار کے خلاف ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی آزاد مرضی اور پسند کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ والدین یا کوئی زوج اپنے بچوں یا اپنے زوج کو اپنی مرضی پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ آدمی بس اپنی پسند اور اپنے یقین و

عقیدے کو اپنے بچوں کے سامنے یا اپنے زوج کے سامنے پیش کرسکتا یا کرسکتی ہے، اور انہیں اسے اپنانے کے لئے قائل اور آمادہ کرسکتا یا کرسکتی ہے ان پر اپنے نظریہ اور عقیدے کو تھوپ نہیں سکتا یا نہیں سکتی۔

ہر آدمی کے پسند یا ناپسند اور فیصلہ کی بنیاد خود اس کا اپنا آزادانہ غور وفکر ہونا چاہئے۔ کسی معاملہ میں فیصلہ کرتے ہوئے کسی فرد کے لئے اس کے اہل وعیال اس کی ایک کمزوری بن جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ فرد برحق فیصلہ کرنے، انصاف کرنے اور راست بازی پر قائم رہنے سے منحرف ہوجائے اور اس طرح بیوی بچے نادانستہ طور سے اس کے اور اس کی اخلاقیات کے لئے دشمن ثابت ہوں۔ اس کے علاوہ وہ دانستہ طور پر بھی فرد کی اخلاقی قدروں اور مفادات کی مخالفت میں کھڑے ہوسکتے ہیں۔ قرآن جہاں خاندان کے اتحاد واتفاق پر زور دیتا ہے وہیں یہ انسان کو خبردار بھی کرتا ہے کہ یہ فطری اور جبلی تعلقات انسان کی اخلاقی اور عملی قدروں سے ٹکرانا نہیں چاہئیں [نیز دیکھیں ۸:۲۸]۔ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ کسی معاملے میں فیصلہ کرتے ہوئے انسان کی نگاہ اللہ کی ہدایت پر مرکوز ہونی چاہئے اور کسی بھی وقتی خود غرضانہ جذبے اور میلان کو نظر انداز کرکے اللہ کی ہدایت کو ہی بالاتر رکھنا چاہئے۔ ''کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اُس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا'' [۹:۲۴]۔

قرآن مومنوں کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ مال دولت اور اولادوں کی کثرت سے جو فخر وغرور انسان کے اندر پیدا ہونے لگتا ہے اس سے بچیں: ''جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (وآرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال واولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (وخواہش) ہے (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اگتی اور) کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر (اے دیکھنے والے) تو اس کو دیکھتا ہے کہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لئے) عذاب شدید اور (مومنوں کے لئے) اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاعِ فریب ہے'' [۲۰:۵۷]۔ عرب کے قبائلی سماج میں چوں کہ اولاد کی کثرت پر فخر کرنے کا جذبہ فرد کے اندر بہت گہرائی سے پیوست ہوتا تھا اس لئے قرآن میں اس پر بار بار متنبہ کیا گیا اور انسان کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلائی گئی کہ اولاد اور مال دولت دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے [۱۰:۳؛ ۹:۵۵، ۸۵؛ ۲۳:۵۵ تا ۵۶؛ ۲۶:۱۳۲ تا ۱۳۴؛ ۳۴:۳۵ تا ۳۷؛ ۵۸:۱۷؛ ۶۸:۱۰ تا ۱۴؛ ۷۱:۱۰ تا ۱۲؛ ۷۴:۱۱ تا ۱۶]۔

والدین کے ساتھ بچوں کا تعلق

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ

اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو، اگر ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اُف تک نہ کہنا اور نہ اُنہیں جھڑکنا، اور ان سے بات ادب سے کرنا اور عجز و نیاز سے اُن کے آگے جھکے رہنا، اور اُن کے حق میں دعا کیا کرو کہ اے اللہ! جیسا

الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿٢٤﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿٢٥﴾

انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پرورش کیا ہے تو بھی اُن (کے حال) پر رحمت فرما۔ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تمہارا رب اس سے بخوبی واقف ہے اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخش دینے والا ہے۔ (۱۷: ۲۳ تا ۲۵)

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿١٤﴾ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾

اور ہم نے انسان کو جسے اُس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے (پھر اُس کو دودھ پلاتی ہے) اور (آخرکار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے (اپنے نیز) اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی (کہ تم کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ علم نہیں تو اُن کا کہا نہ ماننا، ہاں دنیا (کے کاموں) میں اُن کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اُس کے رستے پر چلنا۔ پھر تم کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے تو جو کام تم کرتے رہے ہو میں سب سے تم کو آگاہ کروں گا۔ (۳۱: ۱۴ تا ۱۵)

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٥﴾

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا؛ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا، اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھڑانا ڈھائی برس میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جب خوب جوان ہو جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے ہیں ان کا شکر گزار ہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لئے میری اولاد میں صلاح (وتقویٰ) دے کہ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرماں بردار ہوں۔ (۴۶: ۱۵)

بچے جب بڑے ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو والدین کے تئیں ان کی مادی اور اخلاقی ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں، خاص طور سے تب جب وہ بوڑھے ہو جائیں اور انہیں مدد و سہارے کی ضرورت ہو۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں اللہ کی بندگی کے ساتھ ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے [دیکھیں ۲: ۸۳؛ ۴: ۳۶؛ ۶: ۱۵۱؛ ۳۱: ۱۳ تا ۱۴]۔ قرآن میں اور رسول اللہ

ﷺ کی حدیثوں میں ماں کی دیکھ بھال اوران کے ساتھ سلوک کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے، جیسے یہ کہ ''ماں تکلیف پر تکلیف سہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے (پھر اُس کو دودھ پلاتی ہے) اور (آخرکار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے''۔ حتیٰ کہ اگر والدین اللہ واحد پر خود ایمان نہ رکھتے ہوں اور اپنے ان بچوں سے جو اللہ واحد پر ایمان رکھیں یہ تقاضا کریں کہ بچے ان کے عقیدے کو اپنائیں تو انہیں والدین کی یہ بات تو نہیں ماننا چاہئے، لیکن اس کے باوجود ''دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح رہیں'' [۳۱:۱۵]۔ والدین اگر صاحب ایمان ہوں اور مومن اولاد کی نیکی اور صالحیت پر مطمئن ہوں اور اس پر انہیں خوشی حاصل ہو تو بچوں کو والدین کی بات ماننا چاہئے اور ان کی عملی اتباع کرنی چاہئے [۲:۱۳۳]؛ ۱۲:۳۸]۔ اللہ کے نبیوں نے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ حضرت نوح کا اپنے بیٹے سے لگاؤ اور اس کی اصلاح کے لئے فکرمند رہنا، حضرت ابراہیم کا اپنے والد کو مستقل ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے رہنا، ان دونوں ہی نبیوں نے اللہ سے ان کی معافی کے لئے دعا کی لیکن جب انہیں یہ احساس ہو گیا کہ ان کی یہ طرف داری اللہ کے انصاف کے مطابق نہیں ہے تو انھوں نے اس دعا سے بھی برائت کر لی: ''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں۔ ابا مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جایئے میں آپ کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا۔ ابا شیطان کی پرستش نہ کیجئے بے شک شیطان اللہ کا نافرمان ہے۔ ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو اللہ کا عذاب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔ اس نے کہا کہ ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہے اگر تو باز نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے دُور ہو جا۔ ابراہیم نے سلام علیک کہا (اور کہا کہ) میں آپ کے لئے اپنے رب سے بخشش مانگوں گا بے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔ اور میں آپ لوگوں سے اور جن کو آپ اللہ کے سوا پکارتے ہیں اُن سے کنارہ کرتا ہوں اور اپنے رب ہی کو پکاروں گا امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا'' [۱۹:۴۱ تا ۴۸]۔ نیز دیکھیں ۶:۷۴ تا ۸۳؛ ۲۶:۶۹ تا ۸۹]؛ ''ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا جو وہ اُس سے کر چکے تھے لیکن جب اُن کو معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اُس سے بیزار ہو گئے، کچھ شک نہیں کہ ابراہیم بڑے نرم دل اور متحمل تھے'' [۹:۱۱۴، نیز دیکھیں ۶۰:۴]۔ حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ دونوں نے اپنے متبعین کو اپنے والدین کا خیال رکھنے کی تعلیم دی: [۱۹:۱۴، ۳۲]۔

والدین اوران کی اولاد کے درمیان خصوصی تعلق کو بنائے رکھنے کے لئے اور کسی بھی قسم کی جذباتی ٹھیس سے اسے محفوظ رکھنے کے لئے دونوں پر یہ لازم کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے سابق ازواج سے شادی نہیں کر سکتے۔ [۴:۲۲ تا ۲۳]۔ والدین کو ان کی اولاد کی وراثت میں حصہ دیا گیا ہے: ''تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ دادوں اور بیٹوں پوتوں میں سے فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے'' [۴:۱۱]۔ والدین کے لئے بچوں کو دعا کرنی چاہئے کہ اس دنیا میں انہیں اچھی زندگی ملے اور آخرت میں بھی اچھی زندگی ملے [۴:۴۱؛ ۲۷:۱۹؛ ۴۶:۱۵؛ ۷۱:۲۸]، دونوں کی خوش نصیبی اور مسرت کی بات یہ بھی ہے کہ انہیں جنت میں ایک دوسرے کا ساتھ ملے [۱۳:۱۳؛ ۴۰:۸]۔ لیکن جس طرح والدین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کی اولاد ان کے لئے حق اور راست بازی سے ہٹنے کی وجہ بن سکتی ہے اسی طرح اولاد کو بھی والدین کی وجہ سے راہ حق سے نہ ہٹنے کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے: ''کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اُس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا'' [۹:۲۳ تا ۲۴؛ نیز دیکھیں ۵۸:۲۲]۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو حق کو جانتے بوجھتے جھٹلاتے ہیں اور یہ کہہ کر اپنے موقف

پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنے آباواجداد کے عقائد پر چلتے ہیں اور پھر اپنی کثرت اولاد اور کثرت مال پر فخر جتاتے ہیں۔ آباؤاجداد کی ایسی اندھی پیروی اور ایک قبیلائی ذہنیت انسان کے لئے کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے جس کے پاس عقل ہے اور اسے استعمال کرنے کی آزادی اسے حاصل ہے۔ اس اندھی پیروی کی قرآن میں جگہ جگہ مذمت کی گئی ہے، کیوں کہ یہ رویہ عرب کے قبائلی سماج میں عام طور سے چھایا ہوا تھا [۲:۱۷۰؛ ۵:۱۰۴؛ ۷:۲۸، ۷۰؛ ۱۰:۷۸؛ ۱۱:۸۷، ۱۰۹؛ ۱۴:۱۰؛ ۲۱:۵۳ تا ۵۴؛ ۲۶:۷۴؛ ۳۱:۲۱؛ ۳۴:۴۳؛ ۳۷:۶۹؛ ۴۳:۲۲ تا ۲۳]۔

بھائی بہنیں

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے حالات (جو بالکل) سچے (ہیں) پڑھ کر سنا دو کہ جب ان دونوں نے (اللہ کی جناب میں) کچھ نیازیں چڑھائیں تو ایک کی نیاز تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی (تب قابیل ہابیل سے) کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا، اُس نے کہا کہ اللہ پرہیزگاروں ہی کی (نیاز) قبول فرمایا کرتا ہے۔ اور اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے مجھ پر ہاتھ چلائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے تجھ پر ہاتھ نہیں چلاؤں گا مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے اور اپنے گناہ سمیٹ لے پھر اہلِ دوزخ میں ہو جا اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔ مگر اُس کے نفس نے اُس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اُس نے اُسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گیا۔ اب اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تاکہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپا سکتا ہے۔ کہنے لگا کہ افسوس! مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے کے برابر ہوتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا پھر وہ پشیمان ہوا۔ اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اُس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا اور ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں پھر اس کے بعد بھی ان میں بہت سے لوگ ملک میں حد اعتدال سے نکل جاتے ہیں۔ (۵:۲۷ تا ۳۲)

بھائی بہنوں میں آپس میں حسد اور جلن کا جذبہ بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے، ان آیات میں حضرت آدم کے دو بیٹوں کے درمیان حسد کا ذکر ہوا ہے جن کے پاس وافر وسائل اور جگہ موجود تھی لیکن آپسی بغض وحسد نے ان دونوں کو لڑوایا اور نتیجے کے طور پر انسانی تاریخ میں انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل کا پہلا سانحہ رونما ہوا۔ ایک کی خودغرضی اور انا نے اسے اس جرم عظیم پر اکسایا کیوں کہ اسے کچھ علامتوں کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ کے نام پر اس کی قربانی اللہ کے یہاں قبول نہیں ہوئی جب کہ اس کے بھائی کی قربانی قبول ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بھائی کو دھمکایا، لیکن دوسرے بھائی نے انسانی فطرت کے اچھے پہلو کو اپنایا اور اسی پر قائم رہا[۹۰:۱۰؛۹۱:۷ تا ۱۰]، اور تشدد کا جواب تشدد سے دینے سے خود کو روکا، اور اس طرح بے نفسی کا اور خون خرابے سے بچنے کے عزم کا ایک نمونہ پیش کیا۔ قتل کا مرتکب ہونے والا متکبر بھائی اتنا متوحش ہوا کہ اسے یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے مقتول بھائی کی لاش کو کس طرح ٹھکانے لگائے، اس نے ایک کوے کو دیکھا کہ پانی یا کھانے کی تلاش میں زمین کرید رہا تھا تو اسے زمین کھودنے اور اس میں دبا دینے کا خیال آیا۔

اس قصے میں جو نفسیاتی اور سماجیاتی حقائق اجاگر کئے گئے ہیں ان کے علاوہ اس میں ایک اخلاقی پیغام بھی ہے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی فرد ایسا ہوتا ہے جو صحیح راستہ منتخب کرتا ہے اور انسانی فطرت کے اچھے پہلو کو پکڑتا اور اسے ترقی دیتا ہے، جب کہ اس کے برعکس ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے جو ظلم وتشدد کی راہ اپناتا ہے۔ قرآن ان دونوں طرح کے انسانوں سے خطاب کرتا ہے: ''کہ جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اُس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا''۔ اس کے بعد والی آیت (۵:۳۳) میں زمین پر فساد برپا کرنے والوں اور قتل وخوں ریزی کرنے والوں کے لئے دنیا میں سزا کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے قرآنی قصے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھائیوں کے درمیان حسد کسی کو بغیر سوچے سمجھے جرم پر اکسانے کا سبب بن سکتا ہے ''ہاں یوسف اور ان کے بھائیوں (کے قصے) میں پوچھنے والوں کے لئے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ جب انہوں نے (آپس میں) تذکرہ کیا کہ یوسف اور اُس کا بھائی ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم جماعت (کی جماعت) ہیں کچھ شک نہیں کہ ابا صریح غلطی پر ہیں۔ تو یوسف کو (یا تو جان سے) مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو پھر ابا کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے گی اور اُس کے بعد تم اچھی حالت میں ہو جاؤ گے۔ اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو جان سے نہ مارو، کسی گہرے کنوئیں میں ڈال دو کہ کوئی راہ گیر نکال (کر دوسرے ملک میں) لے جائے گا اگر تم کو کرنا ہے (تو یوں کرو)''[۱۲:۷ تا ۱۰]۔ لیکن حضرت یوسف کا قصہ مختلف اتار چڑھاؤ کے بعد ایک مثبت انجام کو پہنچتا ہے: ''(بھائیوں نے) کہا کہ اللہ کی قسم! اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم خطا کار تھے۔ (یوسف نے) کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (وملامت) نہیں ہے اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ بہت رحم کرنے والا ہے[۱۲:۹۱ تا ۹۲]۔

حضرت موسیٰ سے متعلق قرآن کا یہ قصہ بھی بہت دل چسپ ہے کہ ان کی ماں نے فرعون کے ڈر سے جب اپنے بچے کو ایک تابوت میں بند کر کے اللہ کا نام لے کر دریا میں بہا دیا تو حضرت موسیٰ کی بہن اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے دوڑتی رہیں اور تب تک ان پر نگاہ رکھی جب تک کہ ان کا تابوت فرعون کے محل پر جا کر نہ رک گیا اور فرعون کی بیوی نے انہیں نکال کر اپنے بچے کی طرح انہیں گود میں نہ لے لیا: ''اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا تو وہ اُسے دُور سے دیکھتی رہی اور اُن (لوگوں) کو کچھ خبر نہ تھی۔ ۱۱۔ اور ہم نے پہلے ہی اس پر (دائیوں کے) دُودھ حرام کر دیئے تھے تو موسیٰ کی بہن نے کہا کہ میں تمہیں اس کے گھر والے بتاؤں کہ تمہارے لئے اس (بچے) کو پالیں

اوراس کی خیرخواہی (سے) پرورش کریں؟ تو ہم نے (اس طریق سے) ان کو ان کی ماں کے پاس واپس پہنچا دیا تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائیں اور معلوم کریں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن یہ اکثر نہیں جانتے'' [۲۸:۱۱ تا ۱۳]۔

حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کے قصے میں بھی باہمی تعاون کی اور اللہ کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری میں شریک ہونے کی مثال پیش کی گئی ہے [۷:۱۴۲؛ ۱۹:۵۳؛ ۲۰:۲۹ تا ۳۶؛ ۲۱:۴۸؛ ۲۵:۳۵ تا ۳۶؛ ۲۶:۱۰ تا ۱۷، ۴۶ تا ۴۸؛ ۲۸:۳۴ تا ۳۵]۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کے لئے کوہ طور پر جانے سے پہلے صحرائے سینا میں جب اپنے بھائی کو بنی اسرائیل کا ذمہ دار بنا کر اپنے پیچھے چھوڑا تھا اور واپس آ کر یہ دیکھا کہ قوم تو اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کو پوجنے میں لگی ہوئی ہے تو وہ اپنے بھائی پر بہت غضب ناک ہوئے تھے۔ حضرت ہارون نے اپنے بھائی موسیٰ کو یقین دلایا کہ انھوں نے بنی اسرائیل کو اس بگاڑ سے روکنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن یہ لوگ مانے نہیں، تب موسیٰ نے یہ سمجھ لیا کہ اپنے بھائی کو الزام دینا صحیح نہیں ہے اور پھر انھوں نے اپنے اور اپنے بھائی کی مغفرت کے لئے اللہ سے دعا کی [۷:۱۴۸ تا ۱۵۱؛ ۲۰:۸۳ تا ۹۸]۔ اس قصے سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس طرح کسی شخص کے والدین اس کے عقائد، قدروں اور مفادات کے مخالف ہو سکتے ہیں اسی طرح اسے اپنے بھائی بہنوں سے بھی یہ خطرہ ہو سکتا ہے اور اس لئے ہر شخص کو اس لحاظ سے بھی پوری طرح محتاط اور باخبر رہنا چاہئے [۹:۲۳ تا ۲۴]۔

بھائی اور بہنیں چاہے حقیقی ہوں یا سوتیلے ایک ہی ماں یا ایک ہی باپ کی وراثت میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں [۴:۱۲، ۱۷۶]۔ قرآن میں دودھ شریک بھائی بہنوں کا بھی ذکر ہے۔ یہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی نہیں کر سکتے۔

یتیم بچے

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

(یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے اور اگر تم اُن سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں تکلیف میں ڈال دیتا بے شک اللہ تعالیٰ غالب (اور) حکمت والا ہے۔ (۲:۲۲۰)

قرآن میں یتیموں کی دیکھ بھال، مدد اور ان سے ہمدردی کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری پر بار بار زور دیا گیا ہے، خاص طور سے ان یتیموں کے بارے میں جو کسی کی سرپرستی میں ہوں، اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تعلیم اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں لازمی طور سے دی جاتی رہی ہے [۲:۸۳، ۱۷۷، ۲۱۵؛ ۴:۳۶؛ ۶:۱۵۲؛ ۱۷:۳۴؛ ۱۸:۸۲؛ ۷۶:۸؛ ۸۹:۱۷؛ ۹۰:۱۴ تا ۱۵؛ ۹۳:۶، ۹؛ ۱۰۷:۲]۔ درج بالا آیت میں قرآن یتیم کے سرپرست کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کے مال کو کسی کاروبار یا سرمایہ کاری میں لگا کر اس میں اپنی شرکت کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ یتیم کے مفاد میں ہو، کیوں کہ بعض سرپرست یہ سوچتے ہیں کہ امانت کا حق یہ ہے کہ یتیم کی جائیداد اور کاروبار کو

اپنے کاروبار سے پوری طرح الگ رکھا جائے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ یتیم کے لئے جو جائز طریقہ بھی مفید ہو اسے عمل میں لایا جاسکتا ہے، چاہے یہ یتیم کے کاروباری معاملات کو الگ رکھنے میں ہو یا ان کے کاروباری معاملات میں شریک ہو کر ہو؛ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں تکلیف میں ڈال دیتا بے شک اللہ تعالیٰ غالب (اور) حکمت والا ہے''۔

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) اُن کے حوالے کر دو اور اُن کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو (اپنے ناقص اور) بُرے مال سے نہ بدلو اور نہ اُن کا مال اپنے مال میں ملا کر کھاؤ کہ یہ بڑا سخت گناہ ہے۔ اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اُن کے سوا جو عورتیں تمہیں پسند ہیں دو دو یا تین تین یا چار چار اُن سے نکاح کر لو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو، اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔
(۴:۲ تا ۳)

ان آیات میں سے پہلی آیت ان لوگوں سے خطاب کرتی ہے جو کسی یتیم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں، اور مجموعی طور سے پورے سماج کو مخاطب کرتی ہے کہ یتیم کے مال کی پوری طرح حفاظت کریں اور اس کا استحصال نہ کریں۔ یہ آیت بالعموم اس بات پر زور دیتی ہے کہ حلال وطیب کمائی کے بجائے غلط اور ناجائز طریقے سے کچھ حاصل نہ کیا جائے، اور خاص طور سے یتیم کے سرپرست کو یہ تاکید کرتی ہے کہ یتیم کے اچھے مال سے اپنے برے مال کو نہ بدلیں۔

یتیم کی اچھی طرح دیکھ بھال کے لئے، ایسے حالات میں جیسے جنگ کے بعد پیش آتے ہیں، جب یتیم بچیوں کی (یا بے سہارا خواتین کی) کثرت ہو جائے اور شادی کی اہلیت رکھنے والے مرد کم ہوں، ایک مرد ایک سے زائد شادیاں کر سکتا ہے، لیکن چار سے زیادہ نہیں، اس شرط کے ساتھ کہ سب کے ساتھ عادلانہ سلوک کیا جائے گا۔ اگر محض اس بات کا اندیشہ ہی ہو کہ ایک بیوی کے ساتھ زیادہ اچھا سلوک ہوگا بہ نسبت دوسروں کے، تو ایک مرد کو ایک ہی بیوی رکھنا چاہئے کیوں کہ اس طرح وہ ایک سے زیادہ بیوی اور کئی کئی بچوں کی اضافی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے، اور دوسروں کو رنج دینے سے بچ جائے گا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یتیموں کے تئیں ناانصافی کے اندیشے کا ذکر ایک مجبوری کی حالت کے طور پر کرنا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے درمیان ایک حادثاتی تعلق ہے، اور یہ کہ یہ اجازت استثنائی طور پر یتیموں کے فائدے کے لئے دی گئی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ان سے بیویوں کی طرح عادلانہ سلوک کیا جائے۔

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝٦

اور یتیموں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں مصروف رکھو پھر (بالغ ہونے پر) اگر اُن میں عقل کی پختگی دیکھو تو اُن کا مال اُن کے حوالے کر دو اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑے ہو کر تم سے اپنا مال واپس لے لیں گے) اس کو فضول خرچی میں اور جلدی میں نہ اڑا دینا، جو شخص آسودہ حال ہو اُس کو (ایسے مال سے قطعی طور پر) پرہیز کرنا چاہئے اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر (یعنی بقدرِ خدمت) کچھ لے لے، اور جب اُن کا مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو گواہ کر لیا کرو اور حقیقت میں تو اللہ ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔ (۶:۴)

ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک یتیم کو اس کے بالغ و عاقل ہونے کے بعد جب اس کی جائیداد اور ملکیت حوالے کی جائے تو اس سے پہلے اسے اس ذمہ داری کے لئے تیار بھی کیا جائے اور اس کی جانچ بھی کی جائے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ واقعی اب لائق ہے کہ اسے اس کی املاک سونپ دی جائیں۔ یہ ایک بہت قیمتی اصول ہے جس کو بڑے پیمانے پر کام میں لایا جا سکتا ہے، جیسے کسی عوامی منصب کی ذمہ داری سونپنے کے لئے کسی شخص کی لیاقت کا امتحان لینا اور اس کے لئے مطلوبہ لیاقت کی رسمی دستاویزات طلب کرنا۔ البتہ جو لوگ کسی یتیم کی املاک کے ذمہ دار ہوں انہیں یہ خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مقام و اختیار کا غلط استعمال نہ کریں اور اس کے مال کو خود اپنے فائدے کے لئے اور یتیم کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے استعمال نہ کریں۔

یتیم کو اس کا مال سپرد کرنے سے پہلے اس کی بالغ نظری کو یقینی بنانا ریاست کے عہدیداروں کے ذریعہ ضروری لائحہ عمل اور نگرانی کے واسطے سے ضروری ہے تاکہ کسی بھی قسم کے غلط استعمال کو پہلے ہی قدم پر روکا جا سکے اور اگر قانونی و نگرانی حفاظتی تدابیر کے باوجود ایسا ہو تو فوری سامنے آ جائے۔ سرپرست سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ غنی و مال دار ہے تو یتیم کے معاملات کی دیکھ بھال رضا کارانہ طریقے سے کرے، اور اگر غریب ہے تو یتیم کے مال کی حفاظت اور اس کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اس کے مال میں سے بقدر ضرورت جائز طریقے سے معاوضہ لے۔ یتیم کے حقوق کی حفاظت کے لئے جو اپنی ملکیت کو اپنے ہاتھ میں لینے کا مجاز ہو جاتا ہے، اور سرپرست کے حقوق کی حفاظت کے لئے جو اس کا نگراں تھا، اس سپردگی کی گواہی ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے لکھنا ضروری ہے۔ قرآن حسب معمول یہاں بھی ایک قانونی ذمہ داری کو اخلاق اور تقویٰ پر زور دئے بغیر پیش نہیں کرتا ''اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے''۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝٨ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا

اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج آ جائیں تو اُن کو بھی اُس میں کچھ دے دیا کرو اور شیریں کلامی سے پیش آیا کرو۔ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے جو (ایسی حالت میں ہوں کہ) اپنے بعد ننھے ننھے بچے چھوڑ جائیں اور اُن کو اُن کی نسبت

خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۪ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

خوف ہو (کہ اُن کے مرنے کے بعد اُن بیچاروں کا کیا حال ہوگا) پس چاہئے کہ یہ لوگ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کہیں۔ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ (۴:۸ تا ۱۰)

وفات پانے والے کسی شخص کے قانونی ورثاء کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ ان یتیموں کا اس میراث میں خیال رکھیں جن کا اس وراثت میں کوئی قانونی حق تو نہیں ہے لیکن وہ اس میں سے کچھ ملنے کی امید رکھتے ہیں، اور ان کو اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔ ایک اور تنبیہ یہاں ان لوگوں کو کی گئی ہے جو یتیموں کے معاملات کے نگراں ہیں۔ انہیں جس طرح مستقل میں اپنی بے سہارا اولاد کے ساتھ حسن سلوک کی فکر ہوتی ہے اسی طرح وہ اپنے زیر کفالت یتیم بچوں کا خیال کریں۔ جو کوئی یتیم کے مال میں خیانت کرے گا سے آخرت میں یقینا بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھنا ہوگا۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝۱۲۷

(اے پیغمبر!) لوگ تم سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ تم کو اُن کے (ساتھ نکاح کرنے کے) معاملے میں اجازت دیتا ہے اور جو حکم اس کتاب میں پہلے دیا گیا ہے وہ اُن یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جن کو تم اُن کا حق تو دیتے نہیں اور خواہش رکھتے ہو کہ اُن کے ساتھ نکاح کر لو اور (نیز) بیچارے بیکس بچوں کے بارے میں اور یہ (بھی حکم دیتا ہے) کہ یتیموں کے بارے میں انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ اُس کو جانتا ہے۔ (۴:۱۲۷)

اس آیت میں تمام یتیموں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کے عام اصول کو اجاگر کیا گیا ہے، اور خاص طور سے یتیم عورتوں کا تذکرہ ہے جن کے حقوق، املاک یا مہر سے وہ لوگ انہیں محروم کر دیتے ہیں جو ان کے معاملوں کے نگراں ہوتے ہیں اور ان سے شادی کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں یا جن لوگوں سے ان کی شادی کرنا چاہتے ہیں ان سے اس کے بدلے میں کچھ چاہتے ہیں۔ یہ پورے سماج کی ایک عام ذمہ داری ہے کہ ان کمزور یتیموں کے مفادات کی حفاظت کریں، اور ان کے عدالتی تحفظ کے لئے حکومت کے ذریعہ کوئی ادارہ قائم کیا جانا چاہئے یا یتیموں کے حقوق کے لئے اسپیشل پبلک پراسیکوٹر کی تقرری کرنی چاہئے۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ

اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لُوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہلِ قرابت کا اور یتیموں کا

السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے، اگر تم اللہ پر اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن (یعنی جنگ بدر میں)، جس دن دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہو گئی، اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمائی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۸:۴۱)

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ﴿۷﴾

جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو بستی والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجتمندوں کے اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔ سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۵۹:۷)

ان آیات میں مال غنیمت کی تقسیم کے اصول بتائے گئے ہیں۔ مفسرین اور فقہاء کے مطابق پہلی آیت (۸:۴۱) اس مال سے متعلق ہے جو مجاہدین کو جنگ میں ہاتھ لگتا ہے، اور دوسری آیت (۵۹:۷) اس مال سے متعلق ہے جو جنگ کے بغیر ہی ہاتھ آتا ہے ''اس کے لئے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ'' (۵۹:۶)۔ دونوں ہی معاملوں میں، اور ایک عام اصول کے طور پر، عوامی وسائل کو سماجی انصاف کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے اور محروموں کی مدد کی جاتی ہے خاص طور سے ان لوگوں کی مدد جو اپنی جسمانی یا سماجی کمزوری کی وجہ سے اپنی روزی کمانے کے اہل نہیں ہوتے۔ لہٰذا، دونوں صورتوں میں، ایک حصہ یتیموں اور دوسرے ضرورت مندوں کے لئے رکھا گیا ہے۔ آخری آیت میں اسلام کی اقتصادی پالیسی کے مقاصد میں سے ایک مقصد کو واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ ''مال کی گردش صرف مال داروں میں ہی نہ ہوتی رہے''۔

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

اور بے عقلوں کو اُن کا مال جسے اللہ نے تم لوگوں کے لئے سبب معیشت بنایا ہے مت دو (ہاں) اس میں سے اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور اُن سے معقول باتیں کہتے رہو۔ (۴:۵)

یہ آیت اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ جو لوگ ''نادان'' (فیصلہ کرنے میں کمزور) ہوتے ہیں وہ نہ صرف اپنے ذاتی مفادات کو نقصان میں ڈالتے ہیں، بلکہ پورے سماج کے مفاد کو خطرے میں ڈالتے ہیں کہ ہر فرد اور اس کی ملکیت سماج سے ہی وابستہ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ آیت پورے سماج اور متعلقہ افراد کو مخاطب کرتی ہے کہ نادانوں کی ملکیت کی دیکھ ریکھ اس طرح کیا کریں جیسے کہ وہ گویا ان کا ہی مال ہے، ''اپنے اموال''۔ البتہ اپنے مال پر نادانوں کے قانونی حقوق ناقابل تنسیخ ہیں، اور ان کے مال سے ان کے لئے ایک آرام دہ زندگی کو یقینی

بنایا جانا ضروری ہے۔ مزید برآں، ان کے ساتھ مشفقانہ اور مناسب سلوک کیا جانا چاہئے، اور وہ جیسے ہی اس لائق ہوجائیں کہ اپنے معاملات کو ٹھیک سے انجام دے سکیں تو ان کی ساری ملکیت ان کے حوالے کردینی چاہئے۔ یہی اصول قرآن نے یتیموں کو ان کا مال سپرد کرنے سے پہلے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے دیا ہے کہ وہ ذہنی طور سے پختہ ہوگئے ہوں اور اپنے معاملات ٹھیک سے انجام دینے کی لیاقت ان میں پیدا ہوگئی ہو [۶:۴]۔

میراث کی لازمی تقسیم اور وصیت کی تکمیل

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے، (اللہ سے) ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے۔ جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے تو اس (کے بدلنے) کا گناہ انہیں لوگوں پر ہے جو اُس کو بدلیں اور بے شک اللہ تعالیٰ سنتا (اور) جانتا ہی۔ اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ وارثوں میں صلح کرادے تو اُس پر کچھ گناہ نہیں ہے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم والا ہے۔ (۲:۱۸۰ تا ۱۸۲)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

مومنو! جب تم میں سے کسی کی موت آ موجود ہو تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ وصیت کے وقت تم (مسلمانوں) میں سے دو مرد عادل (یعنی صاحبِ اعتبار) گواہ ہوں یا اگر (مسلمان نہ ملیں اور) تم سفر کر رہے ہو اور (اس وقت) تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو کسی دوسرے مذہب کے دو (شخصوں کو) گواہ (کر لو)؛ اگر تم اُن گواہوں کی نسبت کچھ شک کرو تو اُن کو نماز کے بعد کھڑا کرو اور دونوں اللہ کی قسمیں کھائیں کہ ہم شہادت کا کچھ عوض نہیں لیں گے گو ہمارا رشتہ دار ہی ہو اور نہ ہم اللہ کی شہادت کو چھپائیں گے، اگر ایسا کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ حاصل کیا ہے تو جن لوگوں کا انہوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ کھڑے ہوں جو (میت سے) قرابتِ قریبہ رکھتے ہوں پھر وہ اللہ کی قسمیں کھائیں کہ ہماری شہادت

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ان کی شہادت سے بہت سچی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی، ایسا کیا ہو تو ہم بے انصاف ہیں۔ اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح شہادت دیں یا اس بات سے خوف کریں کہ (ہماری) قسمیں ان کی قسموں کے بعد رد کر دی جائیں گی اور اللہ سے ڈرو اور (اس کے حکموں کو توجہ سے) سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔
(۵:۱۰۶ تا ۱۰۸)

ہر وہ مسلمان جس کے پاس کچھ دولت و جائیداد ہو جو اس کی موت کے بعد اس کا ترکہ بنے گی اس سے کہا گیا ہے کہ اپنی موت سے پہلے ایک وصیت لکھے جس میں یہ نشان دہی ہو کہ وہ اپنے ترکے کو کس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ یہ تقاضا جس کا ذکر درج بالا آیات ۲:۱۸۰ تا ۱۸۲ اور ۵:۱۰۶ تا ۱۰۸ میں کیا گیا ہے، آیت ۲:۱۸۰ میں شدت سے کیا گیا ہے اور اس کے لئے ''کتب علیکم'' (تم پر لازم کر دیا گیا ہے) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ آیات ۵:۱۰۶ تا ۱۰۸ اس ضرورت کی اہمیت پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ یہ کام کس طرح کیا جائے، وصیت لکھنے سے پہلے ''جب تمھیں موت آ پکڑے''، حتی یہ کہ جب تم سفر میں ہو اور موت کا بلاوا آ پہنچے''۔ مزید برآں، یہ آیات سورۃ مائدہ میں شامل ہیں جو ان دیگر دو سورتوں سے پہلے نازل ہوئی تھی جن پر وحی کا نزول مکمل ہوا اور یہ نزول رسول اللہ ﷺ کے حج الوداع کے دوران ۱۰ ہجری میں ہوا جس کے فوراً بعد آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔

یہ تمام ارشادات وصیت اور اس پر عمل درآمد کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ دوسری طرف، آیات ۴:۱۱ تا ۱۲، ۷۶ (جن پر تشریح آگے آ رہی ہے) میں میراث کی لازمی تقسیم کے جو ضابطے دئے گئے ہیں ان کا نزول پہلے ہو چکا تھا کیوں کہ جس سورۃ (النساء) میں یہ آیات ہیں وہ مختلف روایات کے مطابق یا تو تیسری سورۃ آل عمران کے بعد نازل ہوئی جس میں سن ۳ ہجری میں ہونے والی جنگ احد سے متعلق آیات ہیں یا ۳۳ نمبر کی سورۃ الاحزاب کے بعد نازل ہوئی جس میں جنگ احزاب سے متعلق آیات ہیں جو کہ پانچ ہجری میں ہوئی تھی۔ جو بھی ہو بہر حال سورۃ ۵ کئی سال بعد ۱۰ ہجری میں نزول قرآن کے اختتام اور وفات نبیؐ سے معاً قبل نازل ہوئی۔ مزید برآں، سورۃ ۴ میں بیان کردہ میراث کے ضابطے انفرادی وصیت کی مستقل اہمیت کو صاف طور سے ظاہر کرتے ہیں جو کہ پہلے آیت ۲:۱۸۰ تا ۱۸۲ میں لازم کی گئی تھی، اور آیات ۴:۱۱ تا ۱۲ میں بیان کئے گئے لازمی تقسیم کے احکامات میں بھی وصیت کی ترجیح کو واضح کرتے ہیں جو چار مقامات پر لگاتار بیان ہوئے: ''۔۔۔ وصیت (کی تعمیل) کے بعد جو اُس نے کی ہو، ۔۔۔۔۔ وصیت (کی تعمیل کے) بعد جو اُنہوں نے کی ہو، ۔۔۔ تمہاری وصیت (کی تعمیل) کے بعد جو تم نے کی ہو اور ادائے قرض کے جو تم نے لے رکھے ہوں)، ۔۔۔ بعد ادائے وصیت (جو کی گئی ہو) اور بعد ادائے قرض (جو لئے گئے ہوں)'' ۔۔۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث دار قطنی نے السنن میں حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ''وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہے'' جس کا حصہ وراثت میں طے کر دیا گیا ہے [۴:۱۱ تا ۱۲]۔ السیوطی نے اپنے مختصر مجموعہ حدیث میں اسے حسن کہا ہے یعنی صحیح اور ضعیف حدیث کے درمیان کا درجہ رکھنے والی حدیث۔ لیکن ایک فقہی رائے ایسی وصیت کو جائز قرار دیتی ہے جو آیات ۴:۱۱ تا ۱۲، ۷۶ میں ذکر کئے گئے ورثاء کو اضافی حصہ دیتی ہے اگر وہ وصیت ایک تہائی مال میں سے کی گئی ہو اور اگر اس پر قرآن و سنت میں مقرر کئے گئے سبھی ورثا

راضی ہوں۔ فقہ جعفریہ کے فقہاء نے اس پر صرف ایک تہائی میں سے وصیت کرنے کی شرط لگائی ہے اور باقی سبھی متعین ورثاء کے راضی ہونے سے مشروط نہیں کیا ہے۔ دراصل کل میراث کے ایک تہائی میں سے وصیت کرنے کی اجازت ایک مستند (صحیح) حدیث کی رو سے ہے جسے ابن حنبل، بخاری، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے صحابی رسولؐ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے جو کہ رسول کریم ﷺ کے چچازاد بھائی بھی ہیں۔ ایک تہائی کی حد مقرر کرنے کا مقصد ایک اور مفصل روایت سے معلوم ہوتا ہے جو امام مالک، ابن حنبل، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ سے مروی ہے اور صحابی رسول حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے متعلق ہے جس میں کہا گیا: ''ایک تہائی دیا جاسکتا ہے اور ایک تہائی بہت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم آسودہ حال ورثاء کو چھوڑ دو اور دوسرے ضرورت مند (وارث) کو اس میں سے دے دو۔ اور جو کچھ تم اللہ کی رضا کے لئے خرچ کروگے اس کا اجر اللہ کے یہاں پاؤ گے''۔ یہ بات ایک مفصل حدیث سے اور جس موقع پر یہ حدیث کہی گئی اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر وعیاں ہے، کہ یہ ایسے ضرورت مند لوگوں کے حق میں وصیت کرنے کے لئے ہے جو وصیت کرنے والے کے گھر سے باہر کے لوگ ہیں اور عام صدقات وخیرات کے لئے ہے۔

اضافی وصیت جو قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ ''والدین اور دیگر اقرباء'' کے لئے ہے [۲:۱۸۰]۔ یہ وصیت ہر ایک کی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے ہوگی جو کہ متوفی کے کنبہ کا فرد ہے، اور اسی لئے قرآن میں وراثت کی تقسیم کو ترجیح دی گئی ہے جو کہ آیت ۴:۱۱ تا ۱۲ میں بتائی گئی ہے۔ یہ کوئی مخصوص بچہ یا قریبی عزیز ہوسکتا ہے، جس کا لحاظ کیا جانا کسی نہ کسی وجہ سے ضروری ہو، جو زیادہ ضرورت مند ہو بہ نسبت دوسرے ورثاء کے جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے جو خوشحال ہوں اور ان کے پاس اپنی ہی دولت کافی ہو۔ قرض کے سلسلے میں وصیت کے معاملے میں ایک واحد شرط یہ ہے کہ یہ دوسرے ورثاء کو محروم کرنے کے مقصد سے نہ کی گئی ہو [۴:۱۲]، یا حقائق کے خلاف نہ ہو یا نیکی سے انحراف پر مبنی نہ ہو [۲:۱۸۲]، اور اس طرح کے معاملوں میں ثالثون یا عدالت کے ذریعہ ورثاء کے درمیان منصفانہ اور برحق تصفیہ کرایا جاسکتا ہے۔

''جب موت آ پکڑے'' اور خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ آدمی سفر میں ہو اور گھر سے دور ہو تو اس صورت میں وصیت کے لئے جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ ایک اچانک، پریشان کن اور مشکل حالات کی دقتوں اور فوری تقاضوں کے پیش نظر دیا گیا ہے۔ وصیت لکھنے یا لکھوانے کے بجائے دو معتبر گواہوں کی موجودگی میں زبانی طور سے تاکید کرنے، جیسا کہ آیات ۲:۲۸۲ تا ۲۸۳ میں قرض لین دین کو لکھوانے کی تاکید کی گئی، عجلت کی کیفیت اور ضابطے میں لچک کی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور سفر کی مشکلات کا خیال رکھا گیا ہے [۲:۲۸۲ تا ۲۸۳]۔ یہاں یہ بات دھیان دینے کی ہے کہ وصیت کو سن کر گواہ بننے کے سلسلے میں یہاں مرد اور عورت کا کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے، برعکس اس گواہی کے جو قرض کے لین دین کے سلسلے میں آیات ۲:۲۸۲ تا ۲۸۳ میں بتائی گئی۔ چنانچہ وہاں جو فرق رکھا گیا ہے اسے سبب ومنطق سے سمجھنا چاہئے اور انہی حالات تک اسے محدود رکھنا چاہئے جو قرض لین دین سے متعلق آیات میں ذکر کئے گئے ہیں اور جس کی وجہ سے ایک مرد کی جگہ پر دو عورتوں کی گواہی کا ضابطہ دیا گیا ہے یعنی یہ کہ ''اگر ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلادے'' [۲:۲۸۲]۔ زبانی وصیت کی گواہی کے لئے صرف دو اعتبار والے افراد ہی مطلوب ہیں، جو ''تمھارے علاوہ (یعنی غیر مسلم) لوگوں میں سے'' بھی ہوسکتے ہیں [۵:۱۰۶]۔ یہ اہم اصول ٹھوس طریقے سے یہ اشارہ کرتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں جنس یا مذہب کی بنیاد پر قانونی حیثیت، حقوق اور ذمہ داریوں میں لوگوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ
الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ
ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَ
لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ
كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ
فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ
مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ
اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ
فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾ وَ
لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ
وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ
مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ لَهُنَّ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ
كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ
يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ
فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ
اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ
يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ

اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، اور اگر اولادِ میت صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ تو کُل ترکے میں اُن کا دو تہائی اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اُس کا حصہ نصف۔ اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ بشرطیکہ میت کے اولاد ہو اور اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اُس کے وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ (اور یہ تقسیم ترکہ میت کی) وصیت (کی تعمیل) کے بعد جو اُس نے کی ہو، یا قرض کے (ادا ہونے کے بعد جو اُس کے ذمے ہو عمل میں آئے گی)۔ تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ دادوں اور بیٹوں پوتوں میں سے فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے یہ حصے اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ کر مریں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو اُس میں نصف حصہ تمہارا اور اگر اولاد ہو تو ترکے میں تمہارا چوتھائی (لیکن یہ تقسیم) وصیت (کی تعمیل کے) بعد جو اُنہوں نے کی ہو، یا قرض کے (ادا ہونے کے بعد جو اُن کے ذمے ہو کی جائے گی)۔ اور جو مال تم (مرد) چھوڑ کر مرو اگر تمہارے اولاد نہ ہو تو تمہاری عورتوں کا اُس میں چوتھا حصہ اور اگر اولاد ہو تو اُن کا آٹھواں حصہ (یہ حصے) تمہاری وصیت (کی تعمیل) کے بعد جو تم نے کی ہو اور ادائے قرض کے (بعد تقسیم کئے جائیں گے)۔ اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کے نہ باپ نہ بیٹا مگر اس کے بھائی یا بہن ہو تو اُن میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ (یہ حصے بھی) بعد ادائے وصیت و قرض بشرطیکہ اُن سے میت نے کسی کا نقصان نہ کیا ہو (تقسیم کئے جائیں گے) یہ اللہ کا فرمان ہے اور اللہ تعالیٰ نہایت علم والا (اور) نہایت حلم والا ہے۔ یہ (تمام احکام) اللہ کی حدیں ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کی فرماں برداری کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کو جنتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہیں، وہ اُن

رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور رجو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اُس کی حدوں سے نکل جائے گا اُس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُس کو ذلت کا عذاب ہوگا۔ (۴:۱۱ تا ۱۴)

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

(اے پیغمبر) لوگ تم سے (کلالہ کے بارے میں) حکمِ (الٰہی) دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مرد مرجائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ ماں باپ) اور اس کی بہن ہو تو اُس کو بھائی کے ترکے میں سے آدھا حصہ ملے گا اور اگر بہن مرجائے اور اس کے اولاد نہ ہو تو اُس کے تمام مال کا وارث بھائی ہوگا اور اگر (مرنے والے بھائی کی) دو بہنیں ہوں تو دونوں کو بھائی کے ترکے میں سے دو تہائی اور اگر بھائی اور بہن یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے وارث ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے (یہ احکام) اللہ تعالیٰ تم سے اس لئے بیان فرماتا ہے کہ بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ (۴:۱۷۶)

کوئی ذاتی وصیت جو متوفی کے گھر والوں کے خاص حالات کے مطابق لکھی گئی ہو اسے آیات ۴:۱۱ تا ۱۲، ۱۷۶ میں دئے گئے وراثت کے عام لازمی احکامات پر ترجیح دی گئی ہے۔ یہ عام لازمی احکامات متوفی کے پوری میراث پر عائد ہوں گے اگر متوفی نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی ہے، اور اگر کوئی جائز وصیت ہے جس میں پوری کی پوری وراثت کو شامل نہیں کیا گیا ہو تو یہ میراث کے جز پر عائد ہوں گے۔ ان آیات میں دئے گئے ضابطے ایک کنبہ کے افراد: ماں باپ و بچوں اور بھائی بہنوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں، اور یہ کنبہ کے مختلف قسم کے حالات کے مطابق عائد ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے ورثاء کا دائرہ بڑھ جاتا ہے اور اس میں باپ کے رشتے دار بھی شامل ہوجاتے ہیں، لیکن جعفری فقہ نے اس حدیث کو اور اس ضابطے کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بیٹوں اور بیٹیوں کے لئے یا اگر بیٹے و بیٹیاں نہ ہوں تو بھائیوں و بہنوں کے لئے وراثت میں حصہ سے متعلق جو ضابطہ ان آیات میں دیا گیا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہے، تو اس بارے میں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس طرح کا حکم اس عام اصول کے ساتھ عائد ہوتا ہے کہ مرد گھر کے اخراجات پورا کرنے کا قانونی طور سے ذمہ دار ہے اور اس طرح عورت کی تمام ضرورتیں مرد پوری کرتے ہیں، چاہے وہ باپ ہوں، شوہر ہوں، بھائی ہوں یا بیٹے ہوں، اور اس طرح وراثت میں عورت کو اپنی ذاتی ضرورتوں کے لئے کچھ زیادہ ہی حصہ ملتا ہے جب کہ اس کی ضرورتیں اس کا قریب ترین مرد پوری کرتا ہی ہے جو قانونی طور سے اس کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب ایسا معاملہ نہ ہو اور عورت کو اپنی ضرورتوں کے لئے اپنی روزی خود کمانی پڑے، تو حالات کے پیش نظر ذاتی وصیت میں اس کا خصوصی لحاظ رکھا جاسکتا ہے، اور آیات ۲:۱۸۰ تا ۱۸۲ کے مطابق میراث کی تقسیم عمل میں آئے گی۔ تاہم اہم بات یہ ہے قرآن اس متوفی کی میراث میں جس کے بیٹے اور والدین دونوں موجود ہوں ماں اور باپ

دونوں کو یعنی مرد و عورت کو برابر کا حصہ دیتا ہے [۴:۱۱]، اور سوتیلے بھائی بہنوں کے معاملے میں بھی جب کہ متوفی کا کوئی براہ راست وارث نہ ہو۔

اس صورت میں کہ جب متوفی کی کوئی اولاد نہ ہو یا والدین میں سے بھی کوئی نہ ہو بھائیوں و بہنوں میں میراث کی تقسیم کا جہاں تک معاملہ ہے تو اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت ۴:۱۲ میں جو حصے بتائے گئے ہیں وہ سوتیلے بھائی بہنوں سے متعلق ہیں، جب کہ ایسے ہی معاملے میں حقیقی بھائی بہنوں کے حصے آیت ۴:۱۷۶ میں بتائے گئے ہیں۔ وراثت کے قوانین کو مختلف مکاتب فقہ میں کافی تفصیل سے سمجھا اور سمجھایا گیا جیسا کہ فقہ اسلامی کے ضخیم ذخیروں سے ظاہر ہے۔

❁ ❁ ❁

سماج میں خواتین کا مقام

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بُری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (۹:۷۱)

یہ آیت سماج میں خواتین کے انسانی حقوق اور ذمہ داریوں نیز مردوں سے ان کی مساوات اور باہمی تعاون کے ایک لازمی اصول کو بیان کرتی ہے۔ مسلم خواتین سماج میں اخلاقی قدروں کی حفاظت اور ان کو برتنے کے معاملے میں مسلم مردوں کی نگراں اور ذمہ دار ہیں، جس طرح مسلم مرد سماج کی مجموعی بہتری اور ترقی کے معاملہ میں مسلم عورتوں کے نگراں اور ذمہ دار ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام مسلمانوں کو مل جل کر اخلاقی قدروں پر عمل کرنا ہے اور اس کے لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر (اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں کی روک تھام) کی ذمہ داری ادا کرتے رہنا ہے اگر وہ اپنی اس امتی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو قرآن میں ان کی بتائی گئی ہے کہ ''بہترین امت جو انسانوں (کی بھلائی) کے لئے نکالی گئی ہے'' [۳:۱۱۰]، اور اگر اس مذمت سے بچنا چاہتے ہیں جو پہلی آئی ہوئی اللہ کی تعلیمات کے حامل لوگوں میں سے بعض لوگوں کا مقدر بنی کیوں کہ وہ اپنی بے عملی کی وجہ سے یا بدکاروں اور ظالموں کا ساتھ دینے کی وجہ سے اللہ کے پیغام کی اخلاقی قدروں کو برتنے اور ان کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے [۵:۷۸ تا ۸۱]۔ چنانچہ، اللہ کے پیغام کی اخلاقی قدروں کو برتنے اور برقرار رکھنے کے لئے عوام کے پبلک، سوشل، ایجوکیشنل یا سیاسی گروپ بنائے جاسکتے ہیں [۳:۱۰۴]، اور حکام کی ذمہ داری یہ ہے کہ عوام کو ان قدروں کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ایسے گروپوں کے حقوق کی حفاظت کریں اور ان کی کاوشوں میں ان کی مدد کریں اور اس کے لئے انہیں سہولیات فراہم کریں [۲۲:۴۱]۔

مذکورہ بالا آیت [۹:۷۱] میں قرآن صاف کہتا ہے کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ان ذمہ داریوں میں برابر سے اور مشترکہ طور پر شریک ہیں، اور یہ دونوں کا حق اور ذمہ داری ہے کہ سماجی فلاح و بہبود کے نگراں بنیں۔ سماج کے ان نگہبانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر خود

اپنے آپ ان قدروں پر مضبوطی سے کاربند ہونا چاہئے جنہیں وہ سماج میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کیوں کہ جو چیز انسان کے اپنے پاس نہ ہو وہ دوسروں کو نہیں دے سکتا [۲:۴۴؛ ۶۱:۲ تا ۳]۔ لہٰذا، مومن مردوں اور عورتوں کو سب سے پہلے اپنی انفرادی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہئے یعنی نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، اور اپنے عمل وسلوک میں اللہ کی ہدایات کی پیروی، جس سے وہ سماجی اخلاق کی حفاظت کے معاملے میں قابل اعتبار بنیں اور اللہ کی رضا اور اجر انہیں حاصل ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اے پیغمبر جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ اللہ کے ساتھ نہ تو شرک کریں گی نہ چوری کریں گی نہ بدکاری کریں گی نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی اور نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۲:۶۰)

یہ آیت اس عام قرآنی اصول پر عمل درآمد کی اولین مثال پیش کرتی ہے کہ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے تئیں برابر سے ذمہ دار اور ایک دوسرے کے نگراں ہیں [۹:۷۱]۔ قرآن نے بتایا کہ نبی ﷺ جب اسلام پر ثابت قدمی کی بیعت لیں تو مردوں اور عورتوں کو مساوی طور سے برتنا چاہئے۔ دونوں کو ہی یہ عہد کرنا ہوتا ہے وہ ایک اللہ پر ایمان اور اس کے حضور جواب دہی پر یقین کے تئیں ہمیشہ چوکنا رہیں گے اور اللہ کی ہدایت میں جو اخلاقی قدریں سکھائی گئی ہیں ان پر ہمیشہ عامل رہیں گے اور نبی ﷺ کی اطاعت کریں گے۔ جب کسی عورت نے اس طرح کا عہد کیا جس طرح کا عہد مردوں سے لیا گیا تھا تو رسول ﷺ نے اس عہد کو قبول کیا اور اللہ سے دعا کی کہ اس سے جو کچھ گناہ ہوئے ہوں اللہ اسے معاف فرمائے۔ جب مسلمانوں کے دین اور جان و مال کی حفاظت کے لئے جہاد کا اعلان ہوا تو مردوں اور عورتوں دونوں نے اس جہاد میں حصہ لیا اور اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کیں اور میدان میں سب ساتھ ساتھ گئے، ہر ایک نے اپنے عہد کو پورا کر دکھانے کی اور مومنوں کے حقوق، اور عقیدے و اس کے اظہار کی آزادی کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

(ہاں) اگر تم کسی ایسے گھر میں جاؤ جس میں کوئی بستا نہ ہو اور اس میں تمہارا اسباب (رکھا) ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ لوگ

خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى
جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ
اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ
اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ
التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ
الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا يَضْرِبْنَ
بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْٓا
اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے خبردار ہے۔ اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش (یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہو اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اور خسر اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی (ہی قسم کی) عورتوں اور لونڈی غلاموں کے سوا نیز ان خدام کے جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں (غرض ان لوگوں کے سوا) کسی پر اپنی زینت (اور سنگھار کے مقامات) ظاہر نہ ہونے دیں اور اپنے پاؤں (ایسے طور سے زمین پر) نہ ماریں کہ (جھنکار کی آواز کانوں میں پہنچے اور) ان کا پوشیدہ زیور معلوم ہو جائے اور مومنو! سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۲۴:۲۹ تا ۳۱)

چوں کہ مومنوں کو یعنی مردوں و عورتوں دونوں کو بغیر کسی اجازت کے عوامی مقامات پر اور غیر آباد گھروں میں جانے کی اجازت دی گئی ہے اس لئے انہیں اس آزادانہ حرکت و عمل میں کچھ مخصوص آداب و اخلاق پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ کسی کے جسم پر یا جسم کے کسی حصے پر نظریں نہ گڑائیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ نگاہوں کو بچانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی آنکھیں میچ لی جائیں یا جس شخص سے بات کر رہے ہیں اس کی طرف نہ دیکھیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بات کرتے ہوئے نگاہ جما کر نہ دیکھیں۔

دوسری بات یہ کہ، حیا پر قائم رہنے کے لئے اور کسی ناپسندیدہ اکساوے سے بچنے کے لئے، مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے لباس کا ایک ضابطہ بھی ہے۔ مردوں کے جسم کے تمام پرکشش حصے لباس سے ڈھکے رہنا ضروری ہیں اور اپنے بازوؤں کی نمائش یا جسم کے زیادہ تر حصے محض کشش دکھانے کے لئے کھلے رکھنا آدمی کی حیاداری و شرافت کے خلاف ہے اور بدکاری کے لئے اکسانے کا موجب ہے۔ عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم کی زینت و حسن کو نہ دکھائیں سوائے اس کے کہ جو کچھ خود ہی ظاہر ہو۔ قرن اول میں مسلمانوں کے عمل کی رو سے اور متعدد فقہاء کی آراء کے مطابق، اس زینت کو تفصیل سے نہیں بتایا گیا ہے اور یہ تفصیلات ایک مستقل عمومی قانون کے لئے موزوں یا ممکن بھی نہیں ہیں کیوں کہ زمانے اور مقام کے فرق سے سماجی طور طریقوں میں فرق اور تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ماضی میں جو کچھ ایک آزاد عورت کے لئے شریفانہ حلیہ سے بعید سمجھا گیا تھا وہ اس وقت کی غلام عورت کے حلیہ سے مختلف تھا۔ یہی فرق آج ایک گھریلو خاتون اور ایک ملازمت پیشہ خاتون میں ہوسکتا ہے، یا ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان عورت میں ہوسکتا ہے یا نامحرم مردوں اور محرم مردوں سے ملنے کے معاملے میں ہوسکتا ہے [مثال کے طور پر دیکھیں: شوکانی کی نیل الاوطار، بیروت ۱۹۷۳، جلد ۱ ص ۵۵ تا ۶۶، جلد ۶ ص۔ ۲۳۹ تا ۲۴۵؛ الامیر السنانی، سبل السلام، قاہرہ ۱۹۶۰، جلد ۳، ص۔ ۱۱۳؛ ابن رشد: بدایۃ المجتہد، بیروت، جلد ۱ ص ۸۲ تا ۸۴]۔ بعض مشہور

مفسرین نے بھی آیات ۲۴:۳۰ تا ۳۱ کی تفسیر میں اس لچک کا مظاہرہ کیا ہے۔ الفخر الرازی لکھتے ہیں کہ کیا کچھ ڈھکا جائے یہ رواج پر چھوڑ دیا گیا ہے، جب کہ زمخشری نے اسے رواج اور فطرت پر چھوڑا ہے۔ الواحدی اور ابن عطیہ نے نصف بازو کو کھلا رکھنے کی اجازت دی ہے (حالانکہ حدیث رسول میں کلائی تک ڈھکنے کی واضح تاکید ہے) اور النسابوری نے کہنی تک ہاتھ کھلے رکھنے کی اجازت دی ہے۔ کھلا رکھنے کے معاملہ میں ابن حیان رواج اور فطرت کے علاوہ غریب عورتوں کی ضرورت کا بھی لحاظ کرتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عرب کی عورتوں میں سر ڈھکنے کا رواج تھا لیکن وہ اس طرح سے کہ عورتیں اپنی اوڑھنی کو پیچھے کمر کی طرف ڈالتی تھیں جب کے ان کا سینہ کھلا رہتا تھا [دیکھیں القرطبی کی تفسیر آیت ۲۴:۳۰ کے ذیل میں، جلد ۲، ص ۲۳۰، قاہرہ]۔ قرآن کی آیت صاف طور سے اس پر زور دیتی ہے کہ سینے کو ڈھانکا جائے اور اسے نمایاں رکھنے کے اس وقت کے رواج سے بچا جائے۔ مسلم عورتوں کے ضابطہ لباس (ڈریس کوڈ) کا اصل مقصد جیسا کہ ایک اور آیت میں بتایا گیا ہے ان کی شرافت و حیا کا اظہار کرنا ہے''۔ تاکہ وہ پہچان لی جائیں [کہ شریف عورتیں ہیں] اور ستائی نہ جائیں [۳۳:۵۹]۔ یہ مقصد کسی ایک ہی طرز کے لباس سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اسے بدلتے ہوئے حالات کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے، جب کہ حیا و شرافت ایک مستقل قدر ہے اور ہمیشہ مطلوب ہے چاہے یہ تقاضا کسی بھی قسم کے لباس سے پورا ہو۔

مومن مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اس طرح کی اخلاقی اور رسمی پابندیاں اس لئے ہیں تاکہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے سامنے آسکیں اور انفرادی یا سماجی ضروریات کے تحت آسانی سے مل سکیں، اپنی عقل اور صلاحیتوں سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرسکیں اور ایک دوسرے سے بات چیت کرسکیں بغیر اس کے کہ ان میں جسمانی قربت و کشش کا جذبہ پیدا ہو۔

وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۸ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۹

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے کام (کی تہمت) سے جو انہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔ اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (منہ) پر چادر لٹکا (کر گھونگھٹ نکال) لیا کریں یہ اَمر ان کے لئے موجبِ شناخت (وامتیاز) ہوگا تو کوئی اُن کو ایذا نہ دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۳۳:۵۸ تا ۵۹)

یہ ہر انسان کا حق ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، کہ اس کی شخصیت، وقار اور اعتبار کو تحفظ حاصل ہو۔ کسی کے خلاف کوئی بھی تہمت و بہتان یا بدگمانی اور افواہ پھیلانے کی اجازت کسی کو بھی نہیں ہے [نیز دیکھیں ۴۹:۶، ۱۲]، اور جو کوئی بھی کسی دوسرے کے اس انسانی حق کے خلاف ورزی کا مرتکب ہو وہ اس کے لئے اخلاقی اور قانونی طور پر قصوروار ہوگا۔ البتہ مومن مرد اور عورتوں کو لاپرواہی اور بے حسی سے خود اس طرح کے حملوں کے لئے نرم چارہ نہیں بننا چاہئے۔ گزشتہ آیات ۲۴:۳۰ تا ۳۱ میں لباس کا ضابطہ دیا گیا ہے جس سے مردوں و عورتوں کی حیا و اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے، اور درج بالا آیت بھی عورتوں کے لباس کی اصل ضرورت کو اجاگر کرتی ہے، اور مزید یہ اس مقصد کی طرف

اشارہ کرتی ہے کہ جس کے لئے عورتوں کو اپنے جسم کی زینت کا اظہار کرنے سے منع کیا گیا ہے بجز اس کے جو خود بہ خود ظاہر ہو، اور گھر سے باہر اپنے لباس پر ایک باہری لبادہ اوڑھنے کو کہا گیا ہے۔ ان احتیاطی احکامات کا مقصد عورتوں کے حقوق اور آزادی کو سلب کرنا یا انہیں کمتر صنف کے طور پر برتنا اور انہیں دبا کر رکھنا نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ ''وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں''۔ عورت کے جسم میں بہت دل کشی ہوتی ہے اور لباس کا ضابطہ بے بنیاد اور من مانے پن سے نہیں ہے۔ یہ مردوں اور عورتوں کو عوامی مقامات پر ایک دوسرے کے ساتھ سہولت سے ملنے کے لئے ہے اور عورت کو اپنی انفرادی وسماجی ذمہ داریوں کے لئے نقل وحرکت پر قدغن نہیں لگایا گیا ہے اور اس لئے کہ جسمانی اور جنسی کشش کی وجہ سے مرد اور عورتیں تعمیری اور اخلاقی مقاصد کے لئے بات چیت یا ایک دوسرے کے ساتھ سماجی تعاون کر سکیں۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی اَمر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہ ہو گیا۔ (۳۶:۳۳)

عربی زبان میں اگرچہ مرد وعورت دونوں کے لئے واحد یا جمع کا ایک صیغہ (مذکر) استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن دونوں کا ذکر الگ الگ صیغہ مذکر اور صیغہ مونث میں کرتا ہے اور کئی آیات میں اس طرح سے استعمال ہوا ہے جس سے ہر ایک کی آزادانہ ذمہ داری کی تاکید ہوتی ہے، چاہے مرد ہو یا عورت، اور اللہ کے دین وشریعت میں دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا اظہار ہوتا ہے خاص طور سے ان کے انسانی حقوق اور ذمہ داریوں کے معاملے میں [۹:۷۱ تا ۷۲؛ ۲۴:۱۲، ۳۰ تا ۳۱؛ ۳۳:۳۵ تا ۳۶، ۵۸، ۷۳؛ ۴۷:۱۹؛ ۴۸:۵، ۲۵؛ ۵۷:۱۲؛ ۷۱:۲۸؛ ۸۵:۱۰]۔ حتیٰ کہ مشرکین اور منافقین کے حوالے سے بھی مردوں وعورتوں کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے تاکہ اپنے ایمان و عمل کے بارے میں دونوں صنفوں کی الگ الگ ذمہ داری کی نشان دہی ہو [۹:۶۷ تا ۶۸؛ ۳۳:۷۳؛ ۴۸:۶؛ ۵۷:۱۳]۔

درج بالا آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ مومن مرد اور مومن عورتیں اللہ کی ہدایت پر چلنے کے لئے آزادانہ اور برابر سے ذمہ دار ہیں اور اللہ کی ہدایت سے منھ موڑنے یا نافرمانی کے لئے دونوں میں سے ہر ایک انفرادی طور پر اور برابر سے جواب دہ ہوگا۔ اس طرح مسلم خواتین کو اللہ کا دین مردوں کے واسطے سے [مثلاً باپ، بھائیوں اور شوہروں کے ذریعہ] مخاطب نہیں کرتا ہے بلکہ اللہ کے پیغام میں انہیں براہ راست مخاطب کیا گیا ہے، اور ایک عورت آزادانہ طریقے سے اپنے انفرادی اور سماجی حقوق وذمہ داریاں رکھتی ہے۔ زمانہ نبوت میں عورتوں نے اسلام پر کاربند ہونے کا عہد الگ سے کیا، [۶۰:۱۲] وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمی مجالس میں شریک ہوئیں، اور آپ ﷺ سے ایسے معاملات میں جن کی وہ وضاحت چاہتی تھیں سوال اور گفتگو کی۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے دفاع میں بھی اپنا رول ادا کیا جیسا کہ سنت وسیرت کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے۔

❀ ❀ ❀

باب آٹھ

شریعت ۲
شہری اور تجارتی معاملات

عام اصول

شریعت کا ایک عام اصول یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز انسانوں کے لئے پیدا کی ہے اور اس لئے ہر چیز جائز ہے جب تک کہ کسی چیز کے لئے خاص طور سے قرآن وسنت میں ممانعت نہیں آئی ہو۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، تمہارے لئے پیدا کیں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ (۲:۲۹)

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام میں لگا دیا جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے اس میں (قدرتِ الٰہی کی) نشانیاں ہیں۔ (۴۵:۱۳)

اللہ کے قانون یعنی شریعت اسلامیہ کا مقصد انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنا اور ان کی زندگی کو ہر ممکن حد تک آسان بنانا ہے" اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا [۲:۱۸۵]؛ "اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو" [۵:۶]۔ شریعت کا مقصد نہ تو انسان کو سمت ۔۔۔۔۔۔ اور نہ انسانی

سرگرمیوں کے وسیع دائرے کی ہر تفصیل کا احاطہ کرنا ہے۔ اگر موجودہ حالات کے اعتبار سے ہر تفصیل طے کر دی جاتی تو آئندہ کے اہل ایمان بدلتے ہوئے حالات میں اس کے مطابق پوری طرح کیسے عمل کر پاتے؟ مستقبل میں پیش آنے والی تمام ضروریات اور حالات کے لئے وحی کے ذریعے سے لازمی تعلیمات نازل کرنا اللہ کی حکمت اور منشاء کے خلاف ہے کیوں کہ وہ انسان کو ہر چیز کا علم خود نہیں دینا چاہتا بلکہ انسانوں کو غور و فکر کی قوت سے کام لینے کا مکلف بناتا ہے جس کے ذریعہ وہ نئی تبدیلیوں اور نئے پیدا شدہ حالات کے مطابق شریعت کے اصولوں کی روشنی میں غور کریں اور اپنی راہ نکالیں" اور اللہ نہیں چاہتا کہ تمھیں غیب کی باتوں پر مطلع کرے [۳:۱۷۹؛ نیز دیکھیں ۶:۵۹؛ ۷:۱۸۸؛ ۲۷:۶۵؛ ۷۲:۲۶ ۔۔۔]۔ انسانی عقل بھی اللہ کی ہی تخلیق ہے، اور اللہ کے پیغام کا مقصد انسان کی عقلی استعداد کو محدود کرنا نہیں ہے۔

درج بالا آیات میں قرآن واضح طور سے بتاتا ہے کہ پوری کائنات میں ہر چیز انسانوں کے استعمال یا تصرف کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ قدرت میں پائی جانے والی ہر چیز انسانی تصرف کے لئے جائز ہے جب تک کہ کسی چیز کے بارے میں قرآن وسنت میں خاص طور سے کوئی ممانعت موجود نہ ہو، اور ہر انسانی عمل یا معاملہ جائز ہے جب تک کہ قران یا سنت میں اس کی ممانعت یا اس کی ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہو۔ کسی کے لئے اس ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ قدرتی اشیاء کا استعمال یا کسی انسانی عمل کی اجازت قرآن وسنت یا تاریخی نظائر سے ثابت؛ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا جائز ہونا ایک عام اصول ہے جب تک کہ کسی چیز کے جائز ہونے کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ ہو، اور کسی چیز کی ممانعت کے بارے میں کوئی قابل قبول شہادت فراہم کرنا اسی شخص کی ذمہ داری ہے جو اس کی ممانعت کا دعویٰ کرے یا اس کی حوصلہ شکنی کرے۔ انسانی عقل اور صواب دید کا ایسا جائز استعمال جسے اجتہاد کہتے ہیں اور جو بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت معلوم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے وہ صرف شریعت کے عام اصولوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے جو کہ عدل اور احسان پر مبنی ہیں [۱۶:۹۰]۔ شریعت میں ہر اس چیز کو جائز مانا گیا ہے جو شریعت کے مقاصد اور اصولوں کو پورا کرتی ہے، اور انسانوں کے فطری تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے، نیز قرآن وسنت میں دئے گئے عدل واحسان کے اصولوں کو پورا کرتی ہے، اور ان میں سے کسی بھی اصول سے ٹکراتی نہیں ہے۔ بدلتے ہوئے، لامحدود اور غیر متوقع حالات میں شریعت کی منشاء کو سمجھنے کے لئے اجتہاد کیسے کیا جاتا ہے اس کے لئے دیکھیں: الشہرستانی، الملال والنہال، بہ توثیق محمد سید کائلانی ۱، ص۔ ۱۹۹، بیروت؛ ۱۹۷۵؛ ابن خلدون، المقدمہ، ص۔ ۴۴۵ تا ۴۴۶، بیروت: ۱۹۷۸]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

مومنو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اُن کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۸۷۔ اور جو حلال طیب روزی اللہ نے تمہیں دی ہے اُسے کھاؤ اور اللہ سے جس پر ایمان رکھتے ہو ڈرتے رہو۔ (۵:۸۷ تا ۸۸)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو مزین کیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور بے جا نہ اڑاؤ کہ اللہ بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۔۳۱۔ پوچھو تو کہ جو زینت (و آرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں اُن کو حرام کس نے کیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کیلئے ہیں اور قیامت کے دن خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں سمجھنے والوں کیلئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔ (۷:۳۱ تا ۳۲)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

کہو کہ بھلا دیکھو تو اللہ نے تمہارے لئے جو رزق نازل فرمایا تو تم نے اُس میں سے (بعض کو) حرام ٹھہرایا اور (بعض کو) حلال (ان سے) پوچھو کیا اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر افتراء کرتے ہو؟ ۵۹۔ اور جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں وہ قیامت کے دن کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ بیشک اللہ لوگوں پر مہربان ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (۱۰:۵۹ تا ۶۰)

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

پس اللہ نے جو تم کو حلال طیب رزق دیا ہے اُسے کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر کرو اگر اُسی کی عبادت کرتے ہو۔ (۱۶:۱۱۴)

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

اور یونہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آ جائے مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہیں ہوگا۔ ۱۱۶۔ (جھوٹ کا) فائدہ تو تھوڑا سا ہے مگر (اس کے بدلے) ان کو دردناک عذاب (بہت) ہوگا۔ (۱۶:۱۱۶ تا ۱۱۷)

ان آیات میں اس عام اسلامی اصول پر زور دیا گیا ہے کہ زندگی کی اچھی چیزیں انسان کے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور جائز ہیں، سوائے ان کے جنہیں خاص طور سے ممنوع کر دیا گیا ہے۔ مومنوں کو تقدیس و تحریم کے معاملہ میں مبالغہ کرنے اور چیزوں کو حلال و حرام ٹھہرانے کے انفرادی رجحان کے خلاف متنبہ کیا گیا ہے اور انہیں یہ ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ وہ اپنے طور پر اللہ کی طرف سے کسی چیز کو

حلال یا حرام نہیں قرار دے سکتے؛ حلال وحرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی ہے۔ کسی جائز چیز کو ناجائز مان لینا بھی اسی طرح غلط ہے جس طرح کسی ناجائز چیز کو جائز کر لینا۔ جائز ہونے اور ممنوع ہونے کے تعلق سے انسان میں مبالغہ آرائی کا رجحان پایا جاتا ہے اور یہ رجحان انتہا پسندی ہے جس سے بچنا چاہئے، اور اس طرح کے معاملوں میں اللہ کے قوانین یعنی شریعت ہی یہ طے کرتے ہیں کیا صحیح اور مناسب ہے۔ شدت پسندی سے اللہ کا پیغام وسیع تر دائرے میں انسانوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا اور تمام لوگوں کے لئے قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں، رسول کریم ﷺ نے اس طرح کی شدت پسندی کو اللہ کے راستے سے انحراف یعنی فتنہ قرار دیا ہے [معاذ بن جبل کو رسول اللہ ﷺ کی ہدایت جب انھوں نے لمبی نماز پڑھائی جس کی وجہ سے مقتدی تھک گئے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے اس بات کی شکایت رسول اللہ سے کی؛ بہ رویات بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، نسائی، بن ماجہ، الدارامی]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۰۱ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝۱۰۲

مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر (اُن کی حقیقتیں) تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بُری لگیں اور اگر قرآن کے نازل ہونے کے ایام میں ایسی باتیں پوچھو گے تو تم پر ظاہر بھی کر دی جائیں گی (اب تو) اللہ نے ایسی باتوں (کے پوچھنے) سے درگزر فرمایا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ ۱۰۱۔ اس طرح کی باتیں تم سے پہلے لوگوں نے بھی پوچھی تھیں (مگر جب بتائی گئیں تو) پھر اُن سے منکر ہو گئے۔ (۵:۱۰۱ تا ۱۰۲)

انسانوں کو اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں اپنی عقل ودانش کو کام میں لانے، اپنی اخلاقی قدروں کو برتنے اور خود کچھ نہ کچھ کرنے کا اہل بنایا گیا ہے، اور اس کے لئے بہت زیادہ قانونی بندشوں اور اجازتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ قانون بنانے کی ضرورت صرف وہاں ہوتی ہے جہاں وہ ناگزیر ہو جائے، جیسے کہ تب جب انفرادی اقدامات اور اخلاقی ترغیبات انصاف کو برتنے میں اور تمام متعلقہ فریقوں (مختلف افراد اور سماج) کے حقوق کو برقرار رکھنے میں ناکام ہو جائیں۔ انسان کے اعمال وافعال کو جہاں تک ممکن ہو رکاوٹوں سے آزاد ہونا چاہئے، تاکہ انسانی ذہن کو کام کرنے اور ترقی کرنے کے اختراعات کا موقع ملا رہے، کیوں کہ عقل اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے اور اس کی شاہکار تخلیق کی ایک وقیع علامت ہے۔

یہ ایک ایسا اہم اصول ہے جو سماج کو غیر ضروری قانون سازی یا ایسی بھاری بھرکم ذمہ داریوں سے روکتا ہے جو انسان کے اندر عقلی یا اخلاقی لحاظ سے کامل ہونے کے غیر حقیقت پسندانہ میلان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح کے طول طویل قوانین نے دوسری قوموں کو گمراہی میں مبتلا ہونے یا قول وعمل میں راست بازی کو مسترد کرنے سے محفوظ نہیں رکھا۔ درج بالا آیت کی طرز پر ہی رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث بھی ہے کہ ''مجھ سے ایسی باتوں کے بارے میں سوال نہ کیا کرو جنھیں میں بیان نہیں کرتا۔ تم سے پہلے کے لوگ اسی لئے ہلاک کئے گئے کہ وہ اپنے نبیوں سے بہت زیادہ سوال کیا کرتے تھے اور پھر نبی کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے تھے۔ جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو اور جب میں کسی کام سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ'' [دارقطنی] (اس حدیث کے الفاظ

حدیث کی کتاب سے نقل کرنا ہیں) ایک اور حدیث میں ہے کہ: اللہ نے تمھارے فرائض بتادئے ہیں اس لئے انہیں نظر انداز نہ کرو؛ اور اس نے کچھ حدیں مقرر کردی ہیں لہٰذا ان حدود کو نہ پھلانگو، اور اس نے کچھ معاملے بغیر وضاحت کے چھوڑ دئے ہیں بجائے اس کے وہ بھول گیا ہو، لہٰذا ان کے بارے میں سوال نہ کرو" [مسلم، ابن حنبل، النسائی، ابن ماجہ]۔

غذائی قوانین

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اے اہلِ ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اُن کو کھاؤ اور اگر اللہ ہی کے بندے ہو تو اُس (کی نعمتوں) کا شکر بھی ادا کرو۔ ۱۷۲۔ اُس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کردیا ہے۔ ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اُس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔ (۲:۱۷۲ تا ۱۷۳)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳﴾

تم پر مرا ہوا جانور اور (بہتا) لہو اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے اور جو گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں مگر جس کو تم (مرنے سے پہلے) ذبح کرلو اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے اور یہ بھی کہ پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔ آج کافر تمہارے دین سے ناامید ہو گئے ہیں تو اُن سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو (اور) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند فرمایا۔ ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۵:۳)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵

تم سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ان کیلئے حلال ہیں (ان سے) کہہ دو کہ سب پاکیزہ چیزیں تمہیں حلال ہیں اور وہ (شکار) بھی حلال ہے جو تمہارے لئے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جنہیں تم نے سدھا رکھا ہو اور جس (طریق) سے اللہ نے تمہیں (شکار کرنا) سکھایا ہے (اس طریق سے) تم نے ان کو سکھایا ہو تو جو شکار وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں اُس کو کھا لیا کرو اور (شکاری جانوروں کے چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ ۴۔ آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کو حلال ہے اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہلِ کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جب کہ اُن کا مہر دے دو اور اُن سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی۔ اور جو شخص ایمان سے منکر ہو اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔

(۵:۴ تا ۵)

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝۱۲۱

اور جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اُسے مت کھاؤ کہ اُس کا کھانا گناہ ہے اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم لوگ اُن کے کہے پر چلے تو بیشک تم بھی مشرک ہوئے۔ (۶:۱۲۱)

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴۵

کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں میں اُن میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا بجز اسکے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو یا بہتا لہو یا سؤر کا گوشت کہ یہ سب ناپاک ہیں یا کوئی گناہ کی چیز ہو کہ اُس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو اور اگر کوئی مجبور ہو جائے لیکن نہ تو نافرمانی کرے اور نہ حد سے باہر نکل جائے تو تمہارا رب بخشنے والا مہربان ہی۔ (۶:۱۴۵)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَآ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾

بنی اسرائیل کیلئے (تورات کے نازل ہونے سے) پہلے کھانے کی سب چیزیں حلال تھیں سوائے اُن (چیزوں) کے جو یعقوب (علیہ السلام) نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تورات لاؤ اور اُسے پڑھو (یعنی دلیل پیش کرو) (۳:۹۳)

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَ بِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَ اَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

تو ہم نے یہودیوں کے ظلموں کے سبب (بہت سی) پاکیزہ چیزیں جو ان کو حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور اس سبب سے بھی کہ وہ اکثر اللہ کے رستے سے (لوگوں کو) روکتے تھے۔ اور اس سبب سے بھی کہ باوجود منع کئے جانے کے سُود لیتے تھے اور اس سبب سے بھی کہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۴:۱۶۰ تا ۱۶۱)

وَ عَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا كُلَّ ذِىۡ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الۡبَقَرِ وَ الۡغَنَمِ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ شُحُوۡمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُوۡرُهُمَآ اَوِ الۡحَوَايَآ اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِبَغۡيِهِمۡ ۫ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گایوں اور بکریوں سے ان کی چربی حرام کر دی تھی سوا اس کے جو اُن کی پیٹھ پر لگی ہو یا اوجھڑی میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔ یہ سزا ہم نے ان کو ان کی شرارت کے سبب دی تھی اور ہم تو سچ کہنے والے ہیں۔ (۶:۱۴۶)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَكُمۡ بَهِيۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ مَا يُرِيۡدُ ﴿۱﴾

اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو تمہارے لئے چارپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں بجز اُن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا اللہ تعالیٰ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ (۵:۱)

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَيۡسِرِ ؕ قُلۡ فِيۡهِمَآ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَا ذَا يُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ

(اے پیغمبر) لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر اُن کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کون سا مال خرچ کریں تو کہہ دو کہ جو

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو۔ (۲:۲۱۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کر لو ہاں اگر بحالتِ سفر رستے چلے جا رہے ہو (اور پانی نہ ملنے کے سبب غسل نہ کر سکو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہمبستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمم) کر لو بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہی۔ (۴:۴۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمالِ شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ ۔۹۰۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تمہیں (ان کاموں سے) باز رہنا چاہئیے ۔۹۱۔ اور اللہ کی فرمانبرداری اور رسول (اللہ ﷺ) کی فرمانبرداری کرتے رہو اور ڈرتے رہو اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے ۔ ۹۲۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے جب کہ انہوں نے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کئے پھر پرہیز کیا اور ایمان لائے پھر پرہیز کیا اور نیکوکاری کی اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (۵:۹۰ تا ۹۳)

غذائی قوانین کو خالصتاً دینی امور میں رکھا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے دئے ہیں؛ تاہم یہ قوانین سول لاء

کے دائرے سے بہت دور نہیں ہیں، کیوں کہ ان کا اثر بازار پر اور مومنوں کے آپسی معاملات پر پڑتا ہے۔ کچھ خاص چیزوں کو ناجائز قرار دینے سے وہ چیزیں جائز لین دین سے الگ تھلگ ہوجاتی ہیں جب تک کہ ان میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آجائے، جیسے شراب (وائن) کا سرکہ بن جانا]۔ کھانے پینے کی ممنوع چیزوں کے معاملہ میں صفائی وصحت کا لحاظ رکھا گیا ہے جیسے سڑی ہوئی چیز، خون، دم گھٹ کر یا جھٹکے سے ہلاک ہونے والے جانور یا چوٹ لگنے، گر جانے یا بیماری سے مرجانے والے جانور یا وہ جانور جنہیں جنگلی جانوروں نے چیر پھاڑ دیا ہوالا یہ کہ ایسا کوئی جانور زندہ ہواور اسے باقاعدہ ذبح کرلیا جائے۔ پورک یعنی خنزیر کا گوشت کھانے کی ممانعت میں بھی صحت کا لحاظ ہے جس کے تحت یہودی اور اسلامی قوانین میں اس کی ممانعت ہے، حالانکہ غذا اور دوا کے ماہرین کے درمیان یہ ابھی تک بھی ایک متنازعہ معاملہ بنا ہوا ہے۔ نشہ آور جو کسی بھی قسم کی ہوں اور کسی بھی شکل میں ہوں، صرف شراب ہی نہیں، بالآخر نقصان دہ ہوتی ہیں، اور اس کی وجہ انسان نشہ میں دھت رہنے کا عادی بھی بن جاتا ہے اور تشدد وفساد کا بھی باعث بنتی ہیں اور یہ تمام چیزیں فرد اور سماج دونوں کے لئے تباہ کن بنتی ہیں۔ قرآن اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ جو چیزیں اپنے آپ میں طیب یعنی اچھی ہیں وہ جائز ہیں اور انہیں کھانا پینا چاہئے اور قرآن ان چیزوں کو ممنوع کرتا ہے جو اپنے آپ میں بری اور نقصان دہ ہیں [مثلاً ۵: ۴ تا ۵]؛ ۷: ۱۵۷] اور محض سزا کے طور پر کسی بھی چیز کو ممنوع نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ یہودیوں پر کچھ چیزیں اسی وجہ سے حرام کردی گئی تھیں [۴: ۱۶۰ تا ۱۶۱]؛ ۶: ۱۴۶، نیز دیکھیں ۳: ۹۳]۔

مزید نفسیاتی اور تصوراتی پابندیاں یہ ہیں جیسے مومنوں کے لئے لازم کیا گیا ہے کہ جب وہ کسی جانور پرندے کو ذبح کریں تو اس پر اللہ کا نام لیں، جن چیزوں پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا گیا ہو وہ نہ کھائیں، یا جو جانور کسی آستانہ پر یا مورتی پر ذبح کیا جائے [۵: ۳؛ ۶: ۱۲۱، ۱۴۵]۔ مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کا ذبیحہ حلال کیا گیا ہے اور ان کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے اور خود مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اہل کتاب کو اپنا کھانا کھلائیں یا کھانے کے لئے بلائیں۔ محمد عبدہ اور رشید رضا نے اس معاملہ میں تفصیل سے بحث کی ہے، فقہی حوالے دئے ہیں اور آراء کو نقل کیا ہے جو ان کے جائز ہونے کو تسلیم کرتے ہیں اس بات سے قطعہ نظر کہ کس طرح سے انہیں ذبح کیا گیا ہے یا ذبح کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ کچھ فقہاء کے نزدیک جائز ہونے کے اس دائرے کو زرتشتیوں اور سابئین کے ذبیحہ تک بھی وسیع کیا جاسکتا ہے۔ فقہی آراء میں مطلقاً حرام چیزوں جیسے خنزیر اور کسی سبب سے ممنوع ہونے والی چیزوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے جیسے جانور کس طرح مرا۔ آیت ۵: ۵ کی رو سے اہل کتاب کے ذریعہ پکایا گیا گوشت کھانے کی مسلمانوں کو اجازت ہے، قطع نظر اس بات کے کہ جانور کیسے مرا۔ البتہ بتوں اور دیوی دیوتاؤں کے نام پر مارا گیا جانور کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے [تفسیر المنار، آیت ۵: ۵ کی تشریح، جلد ۶، ص۔ ۱۷۷ تا ۱۸۰، ۱۸۵ تا ۱۸۶، ۱۹۶ تا ۲۱۹]۔

شراب پینے کی مطلقاً ممانعت قطع نظر اس کے کہ پینے والا نشہ کی حالت میں پہنچا یا نہیں، فرد، خاندان اور سماج کو نشہ خوری کی تباہ کاری سے بچانے میں کارگر ثابت ہوئی ہے کیوں کہ جب شراب پینے کی اصولی طور پر اجازت ہو تو اس حالت کو پہنچنے سے پوری طرح بچنا ناممکن ہے۔ محض پینے اور مدہوش ہوجانے کے درمیان کوئی لائن کھینچ دینا انفرادی اور سماجی حالات کے مطابق الگ الگ معاملہ ہے، اور ان تمام کے اعتبار سے قانونی ضابطے بنانا بہت مشکل ہے۔ کار حادثے، تشدد، اور دیگر بہت سے حرکتیں جو نشہ کی حالت میں انسان انجام دے ڈالتا ہے، انسانی زندگی کے لئے اور سماجی سلامتی نیز جدید سماج میں ہم آہنگی وخیر سگالی بنائے رکھنے کے لئے ایک بڑھتا ہوا خطرہ ہیں۔ عرب معاشرے میں جہاں اسلام سے پہلے کے دور میں شراب نوشی بہت عام اور مرغوب تھی، شراب پینے پر پابندی لگانے کے لئے ایک تدریجی طریقہ اختیار کیا گیا۔ ایسی عادتوں سے نمٹنے کے معاملہ میں اس طرح تدریجی طریقہ اختیار کرنا اسلام کے اصلاحی طریقہ کار میں بہت اہمیت

رکھتا ہے۔اسلام نے عقیدے کے معاملے میں تو کوئی سمجھوتہ نہیں کیا یا تدریج کو تسلیم نہیں کیا لیکن شراب نوشی کے معاملہ میں بالکل مختلف طریقہ سے برتاؤ کیا۔ پہلے تو قرآن نے یہ سمجھایا کہ شراب نوشی اور جوا بازی نقصان اور فائدے دونوں ہیں لیکن ان کے نقصانات ان کے فائدے سے زیادہ ہیں[۲:۲۱۹]۔اگلے قدم کے طور پر نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا گیا، اور آخر میں حتمی طور سے شراب نوشی کو حرام قرار دیا[۵:۹۰]۔

قرآن میں لفظ سے ''خمر'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہر اس چیز سے ہے جو عقل اور دماغ کی کیفیت کو متاثر کرے۔ چنانچہ شراب کی ممانعت میں ہر طرح کی نشہ آور چیز شامل ہے خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو۔اس بات کی توثیق رسول اللہ ﷺ کی کچھ احادیث سے بھی ہوتی ہے جیسے یہ کہ ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے''[مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، الترمذی، النسائی اور ابن ماجہ]۔لہٰذا کسی بھی قسم کی نشہ آور شے جو کسی بھی شکل میں سامنے آئے اس کی حرمت کے لئے فقہاء کے یہاں یہ حدیث ایک عام اصول بن گئی ہے۔جب کافی کا استعمال شروع ہوا تو فقہاء کے درمیان اس پر غور وفکر ہوا کہ کیا یہ خمر ہے اور اس کے لئے انھوں کافی کے خواص واثرات پر بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے یہ کوئی نشہ آور شئے نہیں ہے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ کی دیگر کئی احادیث بھی ہیں۔ایک حدیث میں ہر نشہ آور شئے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ہر اس چیز کو افسردگی کا ضعف کا سبب بنے[ابن حنبل اور ابوداؤد]۔اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ہر شغل کی مذمت کی ہے جس کا تعلق نشہ آور اشیاء سے ہو، وہ چاہے ان کا بنانا ہو، بیچنا ہو، خریدنا ہو، پلانا وکھانا ہو یا خود پینا اور کھانا ہو[بہ روایت ابوداؤد، الحاکم]، اور اس دسترخوان پر بیٹھنے کو بھی آپؐ نے منع فرمایا جس پر شراب موجود ہو[ابوداؤد، ابن ماجہ اور الحاکم]۔البتہ فقہاء نے اہل کتاب کے لئے شراب نوشی اور اس سے متعلق کاموں کو انجام دینے کی اجازت دی ہے کیوں کہ شراب (وائن) عیسائیوں کے مذہبی جشن میں بھی استعمال ہوتی ہے اور یہودی کے یہاں چھٹی کے مقدس دنوں میں پی جاتی ہے، اس لئے مذہبی آزادی کے نقطہ نظر سے اس کی اجازت دی گئی ہے کہ اسلام اور شریعت اسلامیہ نیز اسلامی حکام نے مذہبی آزادی کو محفوظ رکھا ہے[نیز دیکھیں آیت ۵:۹۰ تا ۹۲ کی تشریح جو 'پینل لاء' عنوان کے تحت دی گئی ہے]۔

اسلام مال کمانے کے غیر مفاد اور غیر مناسب ذرائع کو بھی ممنوع کرتا ہے اور حقائق کو بیان کرنے میں نامعقول طریقے اختیار کرنے پر بھی پابندی لگاتا ہے۔جوے کے ذریعہ دولت کمانا[۵:۹۰] یا کسی بھی قسم کا ایسا کھیل جس میں اتفاق سے مال کمانے یا مال کھونے کا معاملہ ہو اور اس میں انسان کی کوئی محنت یا ہنر کا دخل نہ ہو وہ منع ہے، کیوں کہ یہ غیر مفید اور غیر مناسب طریقے سے نفع کمانا ہے۔اس طرح کے اعمال آسانی سے اور بغیر محنت مال کمانے اور صرف اتفاقاً ہی مال ہاتھ آجانے کا لالچ پیدا کرتے ہیں اور طرفین کے درمیان نفع ونقصان میں مطلوب توازن سے خالی ہوتے ہیں۔اور اس طرح کے معاملوں میں ہارنے والوں کی بہ نسبت جیتنے والوں کا تناسب بہت ہی کم ہوتا ہے۔آج کے زمانے میں ایسی مختلف قسم کی قمار بازیوں کا چلن ہے جس وہ لوگ یقینی طور سے اور ہمیشہ زبردست مال کماتے ہیں جو ان قمار بازی کے مقابلوں کا انعقاد کرتے ہیں۔اس طرح کی قمار بازیوں کی وجہ سے سماج سنجیدہ تخلیقی کام کرنے سے باز رہتا ہے اور قمار بازی وجوئے سٹے سے مال کمانے والے افراد کے ہاتھوں لٹتا رہتا ہے اور متواتر نقصان اٹھاتے رہنے سے دل شکستی میں مبتلا لوگوں کا سماج بن جاتا ہے۔

مستقبل کا حال بتانا (یقینی طور سے) جس کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے، یا جو محض ذاتی طور سے ایک قیاس آرائی کا معاملہ نہ ہو وہ بھی ممنوع ہے۔اس طرح کی کوششیں اسلام کی اس تعلیم کے خلاف ہیں کہ فطرت کے قوانین سب کے لئے عام ہیں اور سب کے سب مستقل طور سے قوانین فطرت کے پابند ہیں۔نیز یہ کہ کسی قسم کا دعویٰ کرنے کے لئے ٹھوس عقلی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اور ان معاملوں

میں کوئی ٹھوس عقلی دلیل ہوتی نہیں ہے۔ فطرت کا مکمل علم صرف اللہ کو ہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی قادر مطلق ہے، خود اللہ کے نبی ان چیزوں کو جان نہیں سکتے جو انسان کی قوت ادراک و مشاہدہ سے پرے ہوں الا یہ کہ انہیں وحی کے ذریعہ سے کسی بات کا علم دیا گیا ہو [مثال کے طور پر ۳:۱۷۹؛ ۶:۵۰، ۵۹، ۷۳؛ ۷:۱۸۸؛ ۱۰:۲۰؛ ۱۱:۳۱، ۱۲۳؛ ۲۷:۶۵؛ ۷۲:۲۶ تا ۲۸]۔ پیش گوئیاں کرنے والے وہم گمان سے بتاتے ہیں یا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں مستقبل کا حال بتانے کی اور فرد کی قسمت بنانے اور برے انجام سے اسے بچانے کی مافوق الفطری قوت حاصل ہے، اس لئے یہ تمام باتیں اسلام کے بنیادی عقیدوں کے خلاف ہیں۔ اسی لئے اس طرح کی تمام کوششوں کو ممنوع کیا گیا ہے چاہے ان کا تعلق پیسہ کمانے سے ہو یا نہ ہو۔

اعمال کا دارومدار نیت پر ہے

وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

اور اللہ (کے نام) کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ (اُس کی) قسمیں کھا کھا کر سلوک کرنے اور پرہیزگاری کرنے اور لوگوں میں صلح و سازگاری کرانے سے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔ ۲۲۴۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں تم قصدِ دلی سے کھاؤ گے اُن پر مواخذہ کرے گا اور اللہ بخشنے والا بُردبار ہے۔ (۲:۲۲۴ تا ۲۲۵)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اللہ تمہاری بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہ کرے گا لیکن پختہ قسموں پر (جن کے خلاف کرو گے) مواخذہ کرے گا تو اُس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا اُن کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا لو (اور اسے توڑ دو) اور (تم کو) چاہئیے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے (سمجھانے کے) لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (۵:۸۹)

کسی بھی کام کی قدر و قیمت طے کرنے کی بنیاد نیت ہے۔ چنانچہ درج بالا قرآنی آیات یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان قسموں کو معاف کر دیتا ہے جو بلا ارادہ توڑ دی گئی ہوں، حالانکہ قسم یا عہد پیمان کے قصداً خلاف ورزی پر فرد کو قصوروار قرار دیتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے ہر فرد کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو'' [بخاری و مسلم]۔ چوں کہ شریعت میں عبادت کے علاوہ دیگر انسانی اعمال کے لئے رسمیت مطلوب نہیں ہے اس لئے ایک شخص کسی ایسی بات کے لئے اپنی قسم توڑ سکتا ہے جو زیادہ بہتر ہو اور اللہ کے

نزدیک مطلوب ومقبول ہو۔ اسلام بعض معاملات میں قسم کے کفارے کے طور پر غلاموں کو آزاد کرنے کی مانگ کرتا ہے [۴:۹۲؛ ۵:۸۹؛ ۵۸:۳]، اور عام طور سے وہ بطور احسان ایسا کرنے کی تاکید کرتا ہے [۲:۱۷۷؛ ۹۰:۱۳]؛ شریعت بھی حکومت کو عوامی خزانے سے غلاموں کو آزاد کی ذمہ داری دیتی ہے، خاص طور سے زکوٰۃ کے مال سے [۹:۶۰]۔ اگر قسم توڑنے والا شخص غریب ہے، یا صدقہ نہیں دے سکتا، تو اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ کفارے کے طور پر روزے رکھے۔

لیکن، انسانوں کے لئے انسانوں کی نیت کا فیصلہ کرنا مشکل ہے، خاص طور سے جب یہ بالکل خفیہ ہو اور اس کی کوئی علامت ظاہر نہ ہو۔ چنانچہ جب کسی فرد کے اعمال کی گواہی دی جارہی ہو، خاص طور سے عدالت میں، تو اس کے لئے فرد کی نیت کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ٹھوس ظاہری حالات کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح طور سے فرمایا کہ کسی معاملہ میں آپؐ ایک بشر ہونے کے ناطے اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں جو آپؐ کے سامنے لوگ بیان کرتے ہیں، اس حقیقت کے مطابق نہیں جو آپؐ کے سامنے نہ ہو [حدیث بہ روایت مالک، بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ]۔ جو چیز انسانی ادراک ومشاہدے سے بعید ہو، جس میں وہ بات بھی شامل ہے جو کوئی انسانی چھپالے اور ظاہر نہ کرے، اس کا علم صرف اللہ کو ہے [۹:۷۸؛۱۱:۵؛۴۰:۱۹؛ ۲۰:۷؛ ۴۳:۸۰؛۵۸:۷؛ ۶۷:۱۳]۔ اس دنیا میں کسی مقدمے میں جج کا فیصلہ ظاہر اور ٹھوس شہادت پر مبنی ہوتا ہے، نا کہ محض ذاتی احساس یا خیال پر۔ خلیفہ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اپنی ذاتی معلومات کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے حق میں کوئی اور ثبوت اور شہادت نہ ہو [مثال کے لئے دیکھیں: الشوکانی، نیل الاوطار، جلد ۹، ص۔ ۱۸۵ تا ۱۸۷، ۱۹۶؛ بیروت، ۱۹۷۳]۔ زمانہ نبوت میں منافقین معلوم اور اس بات سے پہچان لئے جاتے تھے کہ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روک رہے ہیں کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں بُرے ہیں'' [۶۳:۲]۔ قرآن کی متعدد آیات میں منافقوں کی نیت اور اعمال کو بے نقاب کیا گیا ہے [جیسے ۳:۱۶۷ تا ۱۶۸؛ ۴:۶۱ تا ۶۳، ۷۲ تا ۷۳، ۸۸ تا ۸۹، ۹۱، ۱۳۸ تا ۱۴۶؛ ۹:۴۷ تا ۵۹، ۶۱ تا ۶۸، ۷۵ تا ۹۰، ۹۳ تا ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۷ تا ۱۱۰، ۱۲۴ تا ۱۲۷؛ ۱۰:۲۹ تا ۱۱؛ ۳۳:۱۲ تا ۲۰، ۶۰ تا ۶۲، ۷۳؛ ۴۷:۱۶، ۲۰ تا ۳۲؛ ۴۸:۶، ۱۱ تا ۱۲، ۱۵:۱۶؛ ۵۷:۱۳ تا ۱۵؛ ۵۹:۱۱ تا ۱۳؛ ۶۳:۱ تا ۸؛ ۶۶:۹]۔ اس کے باوجود رسول اللہؐ کی پالیسی کسی جماعت کی نیت کے بارے میں اپنے احساسات کے مطابق معاملہ نہ کرنے کی تھی، بلکہ ان کے ظاہری بیانات کے ذریعہ کرنے کی تھی اور ان کا ظاہری بیان یہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہر فرد اسی بات کے لئے جواب دہ ہے جو وہ کہے اور جس کا ثبوت موجود ہو۔ رسول اللہؐ کی سنت اس اصول پر زور دیتی ہے کہ جو شخص فیصلہ کرنے والا ہو اسے ظاہری شہادتوں پر اور ٹھوس ثبوتوں پر انحصار کرنا چاہئے جب کہ نیت وارادہ بلاشک وشبہ معلوم نہ۔ اور کسی انسانی عمل کا فیصلہ کرنے اور اسے جانچنے کے لئے یہ بنیادی بات ہے۔ آخرت میں فیصلہ والے دن اللہ تعالیٰ عمل کا فیصلہ اور اس کی جزا کا تعین عمل کرنے والے کی نیت کے مطابق کرے گا، کیوں کہ وہ ہی ہے جو اس بات سے باخبر ہے کہ انسانوں کے دل ودماغ میں کیا ہے [دیکھیں ۲:۷۷؛ ۶:۳؛ ۹:۷۸؛ ۱۱:۵؛ ۲۰:۷؛ ۲۵:۶؛ ۴۳:۸۰؛ ۴۷:۲۶؛ ۶۷:۱۳؛ ۸۶:۹ تا ۱۰]۔

افراد اور سماج کے باہمی مفادات کا متوازن رویہ (نیز دیکھیں: 'سماجی ومعاشی انصاف')

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور

الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

(اللہ کی) کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اُس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (اللہ سے) ڈرنے والے ہیں۔ (۲:۱۷۷)

وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۲:۱۹۵)

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کیلئے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔ (۲:۲۷۹)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

(مومنو!) جب تک تم اُن چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور جو چیز تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اُس کو جانتا ہے۔ (۳:۹۲)

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

اور بے عقلوں کو اُن کا مال جسے اللہ نے تم لوگوں کیلئے سبب معیشت بنایا ہے مت دو (ہاں) اس میں سے اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور اُن سے معقول باتیں کہتے رہو۔ (۴:۵)

وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ

اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اُس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو اُن کاموں کا ثواب ہے جو اُنہوں نے کئے اور عورتوں کو اُن کاموں کا ثواب ہے جو اُنہوں نے کئے اور اللہ سے اُس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ (۳۲:۴)

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾ ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ ۚ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَ مَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کیساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کیساتھ احسان کرو کہ اللہ تعالیٰ (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور) تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ ۳۶۔ جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں اور ہم نے ناشکروں کیلئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۷۔ اور خرچ بھی کریں تو (اللہ کیلئے نہیں بلکہ) لوگوں کے دکھانے کو اور ایمان نہ اللہ پر لائیں نہ روزِ آخرت پر (ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہوا تو (کچھ شک نہیں کہ) وہ بُرا ساتھی ہے۔ ۳۸۔ اور اگر یہ لوگ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان لاتے اور جو کچھ اللہ نے اُن کو دیا تھا اُس میں سے خرچ کرتے تو اُن کا کیا نقصان ہوتا اور اللہ اُن کو خوب جانتا ہے۔ ۳۹۔ اللہ کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا۔ اور اگر نیکی (کی) ہوگی تو اُس کو دوچند کر دے گا اور اپنے ہاں سے اجرِ عظیم بخشے گا۔ (۳۶:۴ تا ۴۰)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ (۵۸:۴)

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

ان لوگوں کی بہت سی مشورتیں اچھی نہیں ہاں (اُس شخص کی مشورت اچھی ہوسکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات یا لوگوں میں صلح کرنے کو کہے اور جو ایسے کام اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کرے گا تو ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے۔ (۴:۱۱۴)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

مومنو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) اللہ کے رستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے اُن کو اس دن کے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ ۳۴۔ جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا پھر اُس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔ (۹:۳۴ تا ۳۵)

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو اُن کا حق ادا کرو اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ۔ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔ اور اگر تم اپنے رب کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو ان (مستحقین) کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو۔ اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن کے گرد بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ بے شک تمہارا رب جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کرتا ہے (اور جس کی روزی چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور (ان کو) دیکھ رہا ہے۔

(۱۷:۲۶ تا ۳۰)

وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو وہ پاکدامنی کو اختیار کئے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے اور جو غلام تم سے مکاتبت چاہیں اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو اور اللہ نے جو مال تمہیں بخشا ہے اس میں سے ان کو بھی دو اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو (بے شرمی سے) دنیاوی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کیلئے بدکاری پر مجبور نہ کرنا اور جو ان کو مجبور کرے گا تو ان (بیچاریوں) کے مجبور کئے جانے کے بعد اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۳۳:۲۴)

وَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کیساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ (۶۷:۲۵)

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۷﴾

(تو) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (مال) خرچ کرتے رہے ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔ (۷:۵۷)

مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۷﴾

جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجتمندوں کے اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولتمند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۷:۵۹)

وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۹﴾

اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور) خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔ (۹:۵۹)

وَ الَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۙ﴿۲۵﴾

اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے۔ (یعنی) مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے کا۔ (۷۰:۲۴ تا ۲۵)

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝

اور باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش (اور حاجت) ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو خالص اللہ کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکر گزاری کے (طلبگار)۔ (۷۶:۸ تا ۹)

كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ؕ﴿۸﴾

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ (اس کو) تمہارے پروردگار ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (۹۶:۶ تا ۸)

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾

جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ (اور) خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہوگا۔ ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔ (۱۰۴:۲ تا ۴)

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ؕ﴿۳﴾

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔ تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے۔ جو نماز کی

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

طرف سے غافل رہتے ہیں۔ جو ریا کاری کرتے ہیں۔ اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے۔ (۱۰۷:۱ تا ۷)

اسلام میں نجی ملکیت کو، تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی حفاظت کا نظم کیا گیا ہے جو کہ جائز ذرائع سے اور ایمان دارانہ کام کی محنت سے بنائی گئی ہو [۲:۲۷۹؛ ۴:۳۲]، یا وراثت میں قانونی طریقے سے حاصل ہوئی ہو۔ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کا اختیار فرد کو دیا گیا ہے کہ وہ شریعت کی اجازت کے دائرے میں اپنی منشاء اور خواہش کے مطابق خرچ کر سکتا ہے، لیکن مومن کو فضول خرچی اور کنجوسی سے منع کیا گیا ہے [۱۷:۲۶ تا ۳۰؛ ۲۵:۶۷]، اور دولت کو جمع کر کے رکھنے کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے [۹:۳۴ تا ۳۵؛ ۱۰۴:۲ تا ۴]۔ البتہ فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور تعامل کو اسلامی قانون یعنی شریعت میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قرآن نجی ملکیت یا مال و دولت کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ''جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے'' [۵۷:۷]، اور ''اللہ نے جو مال تمہیں بخشا ہے'' [۲۴:۳۳]۔ نجی ملکیت کے معاملے میں فرد کی آزادی اس بات سے مشروط ہے کہ اس کے اندر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی اور خود کو یا دوسرے افراد کو یا مجموعی طور پر پورے سماج کو نقصان پہنچانے سے بچنے کی لیاقت ہو۔ چنانچہ دماغی طور سے معذور کوئی فرد اپنی املاک کو نہیں سنبھال سکتا، اور اس لئے اس کا انتظام کسی ایمان دار اور اہل شخص کو کرنا چاہئے جو اس دماغی معذور کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے اور اس کو اس کی دولت کے مطابق آرام و سکون کی زندگی فراہم کرائے [۴:۵]۔ کوئی یتیم جو شادی کی عمر کو پہنچ جائے یعنی بالغ ہو جائے اس کو بھی دماغی طور سے اپنی املاک سنبھالنے کا اہل ہونا چاہئے اس سے پہلے کہ اسے اپنی املاک پر تصرف کا اختیار اس کے سرپرست کی طرف سے اسے سونپا جائے [۴:۶]۔ نجی ملکیت ہو یا عوامی (سرکاری) ان چیزوں میں شامل ہے جس کا اختیار لوگوں کو دیا جاتا ہے اور انہیں ان لوگوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوتا ہے جو اس سے متعلق کسی بھی حق کے مجاز ہیں [۴:۵۸]۔ افراد اور سماج کے درمیان معاشی میدان میں ناخواہی باہمی تعلق و تعامل کی وجہ سے قرآن فرد کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا پابند کرتا ہے اور اسے اسلام کے پانچ ارکان میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے حاصل ہونے والی رقم انہی لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے مختص کی گئی ہے جو مالی امداد کے ضرورت مند ہوتے ہیں اور عارضی طور سے یا مستقل طور سے اپنا روزگار خود کمانے کے اہل نہیں ہوتے [۹:۶۰، ۱۰۳]۔ قرآن کہتا ہے کہ فرد ''کے مال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے (ضرورت مند) کا اور (اپنی ضرورتیں پوری کرنے سے) محروم لوگوں کا'' [۷۰:۲۴ تا ۲۵؛ نیز دیکھیں ۵۱:۱۹]

قرآن کے مطابق حکومت کو سماجی توازن قائم کرنے، برقرار رکھنے یا اس کی کوشش کرنے پر خرچ کرنا چاہئے ''تاکہ جو لوگ تم میں دولتمند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے'' [۵۹:۷] عوامی وسائل اور عوامی خزانے سے خرچ کے لئے مختلف قسم کے لوگوں کی ضروریات کو دیکھنا چاہئے، ان کے حال کے اعتبار سے بھی اور آئندہ کی قلیل مدتی یا طویل مدتی ضرورت کے لحاظ سے بھی [۵۹:۷ تا ۱۰]، اور اس کا مقصد ان کے معیار زندگی کو ترقی دینا ہونا چاہئے۔ سماجی تحفظ کی اس اسکیم میں اسلامی ریاست کے سبھی افراد شامل ہیں چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم [دیکھیں حیرہ کے لوگوں سے خالد بن ولیدؓ کا معاہدہ جب کہ حیرہ کے لوگ اس وقت زیادہ ایمان نہیں لائے تھے۔ اس معاہدے میں بزرگ شہریوں، بیمار لوگوں، اور کسی بھی قسم کے ضرورت مند لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے امداد دینے کا وعدہ کیا گیا تھا؛ اور حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے ضرورت مند یہودی کو وظیفہ جاری کیا تھا اس بارے میں حضرت عمر کا بیان ملاحظہ کریں: ابو یوسف، الخراج،

ص۔ ۱۵۵ تا ۱۵۶، ۱۳۶؛ قاہرہ ۱۳۹۷ ہجری]۔ قرآن نے اس بات پر سب سے پہلے توجہ دلائی کہ جنگی قیدیوں کے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے، ان سے دشمنی اور اختلاف کے باوجود [۷۶: ۸ تا ۹]۔

قرآن میں ۵۰ سے زیادہ مقامات پر مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ جو کچھ اللہ نے انہیں بخشا ہے اس میں سے ضرورت مند افراد اور سماجی ضرورتوں پر خرچ کریں [دیکھیں ''سماجی و معاشی انصاف''، ۲: ۳، ۱۹۵، ۲۶۱ تا ۲۷۴؛ ۳: ۹۲؛ ۹: ۳۴ تا ۳۵، ۶۰، ۱۰۳ ۔۔۔]۔ یہ خرچ مادی چیزوں سے بھی کیا جا سکتا ہے، جسمانی طاقت و توانائی سے بھی، عقلی لیاقتوں اور علم سے بھی، یا محض اخلاقی حمایت سے بھی۔ ہر آدمی کو دوسروں پر کچھ نہ کچھ خرچ کرنا چاہئے، آدمی کے بس میں جو کچھ بھی [۲: ۱۷۷؛ ۳: ۹۲؛ ۷۶: ۸]۔ افراد کے لئے یہ جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ خود غرضی اور کم نظری سے سماج تباہ ہوتا ہے اور سماج کی تباہی کا نقصان ہر فرد کو پہنچتا ہے۔ اس لئے سمجھ دار افراد کو اس فریب سے خود کو بچانا چاہئے کہ وہ خود کفیل ہے اور اسے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح کی فریب خیالی سے تکبر اور حق تلفی کو راستہ ملتا ہے۔ جو ''یتیم کو دھکے دیتا ہے اور ضرورت مند کا کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا'' وہ اللہ کے پیغام کو رد کرتا ہے اور آخرت میں اللہ کے حضور انسان کی جواب دہی کا انکار کرتا ہے۔ جو لوگ نماز تو پڑھتے ہیں لیکن ضرورت مند کی مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کے دل ان کی نماز سے غافل ہوتے ہیں وہ صرف دکھاوا کرتے ہیں اور دوسروں کی مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں [۱۰۷: ۱ تا ۷]۔ جس طرح مسلمانوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اپنی صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اسی طرح انہیں سماجی اتفاق و اتحاد قائم کرنے کی اور سماجی مدد کے ذریعہ مل جل کر رہنے کی بھی تعلیم دی گئی ہے، راست بازی کے دوسرے کام جیسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا رویہ اختیار کرنے کی لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی اور ان کے تنازعات کا تصفیہ کرانے کی تعلیم بھی دی گئی ہے [۴: ۱۱۴]۔ اگرچہ دوسرے ضرورت مندوں کی مدد اعلانیہ بھی کی جا سکتی ہے (خاص طور سے ایسے موقعوں پر جب دوسروں کو ترغیب دینے کی بھی ضرورت ہو) تاہم مومنوں کو دکھاوے اور تعریف کے لئے دوسروں پر خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور خرچ کرتے وقت احسان جتانے اور لینے والے کی تحقیر کرنے سے روکا گیا ہے [۲: ۲۶۲ تا ۲۷۴؛ ۴: ۳۶ تا ۴۰؛ ۷۶: ۸ تا ۹]۔

افراد اور سماج کی ضرورتوں پر خرچ کرنے کی زوردار قرآنی تعلیم مومنوں کے دل و دماغ کو اپیل کرتی ہے کہ وہ رضا کارانہ طور سے بڑھ چڑھ کر خرچ کریں، جب کہ حکومت کی مداخلت اور اس کی قوت قاہرہ و اس کے اقدامات ممکن حد تک محدود ہی رکھے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ لازمی زکوٰۃ کے معاملے میں بھی خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ نے سونے و چاندی کی کمائی کو بھی خود کمائی کرنے والوں پر ہی چھوڑ دیا کہ وہ اگر چاہیں تو براہ راست خود ہی ضرورت مند دے دیں کیوں کہ اس طرح کی آمدنی کے لئے بہت زیادہ انتظامی کوششیں درکار تھیں اور جہالت کی وجہ سے سماج میں جھگڑے شروع ہو سکتے تھے۔ انھوں نے زکوٰۃ کی سرکاری وصولیابی کو وہیں تک محدود کر دیا جسے فقہاء نے ''ظاہری املاک'' قرار دیا ہے جیسے مویشی اور کھیتی جسے آسانی سے دیکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔

دوسروں پر خرچ کرنے کی ایسی تلقین کا مطلب کسی بھی طرح سے یہ نہیں ہے کہ فرد خود اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ذمہ داریوں سے غفلت برتے کیوں کہ اسلام افراد اور سماج کے باہمی تعلقات میں مناسب توازن کو برقرار رکھتا ہے۔ جب ایک صحابی رسولؐ نے رسول اللہ کو بتایا کہ وہ وہ اپنا سارا مال صدقہ کر دینا چاہتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''اپنے مال کا ایک تہائی حصہ صدقہ کر دینا کافی ہے، یا یہ بھی زیادہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑو بجائے اس کے کہ فقر و محتاجگی کی حالت میں چھوڑو'' [مالک، بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ، بہ روایت سعد ابن ابی وقاصؓ]۔

دیگر بنیادی باتیں: سبھی فریقوں کو مناسب منافع اور ان سب کی رضامندی

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۠ ﴿۱۸۸﴾

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اُس کو (رشوۃً) حاکموں کے پاس پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو۔ (۱۸۸:۲)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾

مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔ (۲۹:۴)

''ایک دوسرے کا مال کھا جانا'' ایک اصطلاح ہے جس میں بے ایمانی اور ناجائز کمائی کے سارے طریقے آجاتے ہیں جیسے دھوکہ، غبن، ڈبل ڈیلنگ، بلیک میلنگ، ہیرا پھیری، رشوت اور استحصال کی مختلف شکلیں جو ایک فریق کے لئے ناجائز طریقے سے کمائی کا ذریعہ بنتے ہیں اور دوسرے کے لئے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ جو لوگ سرکاری منصبوں پر ہوتے ہیں اور انہیں عوامی معاملات کا مختار بنایا جاتا ہے ان کے اندر اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرنے کی ہوک پیدا ہو جاتی ہے اور یہ حرص کہ وہ بغیر کسی استحقاق کے دوسرے کے مال میں سے حصہ لیں، یا وہ دوسروں کو اس طرح کے فوائد پہنچانے میں فعال یا غیر فعال طریقے سے سے شامل ہوتے ہیں اور اس سے خود بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں [۱۸۸:۲]۔ قرآن جہاں لوگوں کے درمیان لین دین میں ناانصافی کی ایسی شکلوں کو حرام قرار دیتا ہے وہیں یہ تبادلہ اور کمائی لامحدود شکلوں کو جائز کرتا ہے جو باہمی رضامندی پر مبنی ہوں اور جس میں تمام فریقوں کے درمیان باہمی لین دین میں مناسب طریقے اختیار کئے جائیں۔

قرآن کی ایک اور آیت ۲۹:۴ ایک دوسرے کا مال کھا جانے کی ممانعت سے آگے بڑھ کر ''ایک دوسرے کو ہلاک کرنے'' کی ممانعت کرتی ہے۔ یہ قتل یا ہلاکت جان سے مار دینے کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور وسیع تر مفہوم میں اسے ''ایک دوسرے کی زندگی تباہ کر دینے'' کے معنیٰ میں بھی لیا جا سکتا ہے، اس طرح کہ آدمی اقتصادی، خاندانی، سماجی یا اخلاقی لحاظ سے تباہ ہو جائے۔ یہ آیت پورے مسلم سماج کو مخاطب کرتی ہے کیوں کہ ''زندگی کی تباہی'' صرف اسی شخص کی زندگی تک محدود نہیں رہتی جو اس کا براہ راست نشانہ ہو بلکہ تمام فریقوں کی جو اس میں ملوث ہوں، جو بھی جو اس تباہی کا قصوروار ہو، اور پورا سماج بھی۔ اسی طرح، قرآن دوسرے ضرورت مند افراد یا سماجی بہبود کی مد میں بہت زیادہ خرچ کر ڈالنے کے معاملے میں بھی متنبہ کرتا ہے کیوں کہ اس طرح فرد ''خود اپنے ہاتھوں خود کو ہلاک'' کرنے والا ہو سکتا ہے (۱۹۵:۲)۔

ربوٰی (سود)

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گی جیسے کسی کو جن نے لپیٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ تجارت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اُس کا اور (قیامت میں) اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ (۲:۲۷۵)

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ٭۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾

اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اُن کو اُن کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سُود باقی رہ گیا ہے اُس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کیلئے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔ اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو تو (اُسے) وسعت (کے حاصل ہونے تک) مہلت (دو) اور اگر (زرِ قرض) بخش ہی دو تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اور اُس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ (۲:۲۷۶ تا ۲۸۱)

یہ آیات قرض کے لین دین میں سود وصول کرنے کے ناجائز ہونے کو بتاتی ہیں۔ ربوٰی کا لفظ اس سے پہلے آیت ۳۰:۳۹ میں

بھی آچکا ہے: ''اور جو تم سُود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو اللہ کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے اللہ کی رضامندی طلب کرتے ہو تو (وہ موجبِ برکت ہے اور) ایسے ہی لوگ (اپنے مال کو) دوچند کرنے والے ہیں''۔ اس قرآنی لفظ ربوٰ میں ہر وہ ناجائز اضافہ شامل ہے جو اصل رقم میں کیا جائے جب یہ اضافہ نامناسب ہو اور افراد و سماج کے لئے نقصان دہ ہو۔ جیسا کہ ابن کثیر نے آیت ۲:۲۷۵ کی تشریح میں نیز دیگر فقہاء نے لکھا ہے کہ ربوٰ اسلامی قانون کے سب سے مشکل موضوعات میں سے ایک ہے، کیوں کہ جس آیت میں ربوٰ کو ممنوع کیا گیا ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ حج الوداع میں ربوٰ کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ رسول اللہ کی زندگی کے آخری ایام کی بات ہے۔ اس وجہ سے صحابہ کرامؓ کو اس معاملہ میں رسول اللہ ﷺ سے مزید استفسار کا موقع نہیں ملا اور خود حضرت عمرؓ نے ایک بار یہ فرمایا کہ کاش رسول اللہ ﷺ اس کی کچھ وضاحت فرماتے (بہ روایت ابن حنبل)۔ ربوٰ بالعموم قرض سے متعلق ہے جس میں معاشی ضرورت مند یا کمزور فرد کسی مال دار آدمی سے قرض لیتا ہے اور اس قرض لین دین میں قرض دینے والا تو ہمیشہ فائدے میں ہوتا ہے جب کہ قرض لینے والا اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لئے قرض لی گئی رقم استعمال کرتا ہے۔ اور قرض خواہ اگر قرض لی گئی رقم سے کوئی سرمایہ کاری بھی کرتا ہے تو بھی اسے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے مقابلے کم ہوتا ہے جو اسے قرض دینے والے کو ادا کرنا پڑتا ہے، یا قرض دار پوری طرح نقصان میں ہی رہتا ہے۔ اس آیت کی تشریح میں محمد اسد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''۔۔۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سوال کہ کس قسم کے لین دین ربوٰ کے زمرے میں آتے ہیں سماجی و معاشی موٹی ویشن سے متعلق ہے۔'' یہاں موٹی ویشن سے مراد قرض دینا اور قرض لینا ہے اور اس کا تعلق آپسی نفع و نقصان اور لین دین سے فائدہ اٹھانے پر مبنی حالت سے ہے جس میں قرض دینے اور لینے والی باہمی رضامندی ہوتی ہے۔ اس طرح ''۔۔۔ یہ سوال یہ ہے کہ نفع اور نقصان دونوں میں قرض دینے اور لینے والے فریق کیسے شامل ہوں ۔۔۔۔ ہمارا جواب لازمی طور سے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق الگ الگ ہوگا۔۔۔'' یہ تبدیلیاں فریقین کی صورت میں بھی ہوسکتی ہیں، سماج میں بھی ہوسکتی ہیں اور معیشت میں بھی ہوسکتی ہیں۔ ''چوں کہ ربوٰ کے تصور اور عمل کی قرآن میں جو مذمت کی گئی ہے وہ حتمی اور ناقابل تبدیل ہے اس لئے ہر آن والی مسلم پیڑھی کو اس اصطلاح کے نئے معاشی معنیٰ تلاش کرنے اور اس کو نئی جہتیں دینے کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

محمد اسد نے جو وضاحت کی ہے وہ لازمی ہے، کیوں کہ ربوٰ کسی ٹھوس شئے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے درمیان ایک معاملہ ہوتا ہے جسے تاریخی اور سماجی حالات کے دائرے میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ربوٰ کی لسانی تعریف یعنی ''اضافہ'' سے معاملہ پر کوئی روشنی نہیں پڑسکتی، کیوں کہ جائز طور سے نفع کمانا بھی ایک اضافہ ہی ہے۔ ''اضافہ'' یا ''بڑھوتری'' کے الفاظ کو خاص طور سے قرض سے جوڑ کر دیکھنا بھی کافی نہیں ہے کیوں کہ سماج اور معاملہ کرنے والے کے حالات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے، کیوں کہ قرض لین دین میں باہمی رضامندی، باہمی منافع اور ادائیگی، باہمی مساوی فائدے، سماجی افادیت وغیرہ بھی شامل ہے۔ اس طرح، کسی سماجی و معاشی عمل کی تعریف بیان کرنے کے لئے اور یہ طے کرنے کے لئے کہ معاملہ میں کیا نقصان اور ناانصافی مضمر ہے جس کی وجہ سے اسے ممنوع کیا گیا ہے، ایک سماجی و معاشی تناظر ضروری ہے، کیوں کہ ربوٰ کے تعلق سے قرآنی آیات بہت کم ہیں اور قبل اس کے کہ خود نبی ﷺ اس معاملہ کی کوئی تشریح کرتے یا اس تعلق سے سوالات کے جوابات فرماتے، دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ربوٰ کے تعلق سے حج الوداع میں آپ نے جو کچھ فرمایا وہ دور جاہلیت کے عربوں میں رائج ربوٰ (ربوٰ الجاہلیہ) کے بارے میں تھا اور اس سے اس وقت کے تاریخی اور سماجی حالات میں لین دین کے طریقوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔

سماجی اور کاروباری لین دین میں ممانعت کا کوئی سبب (علت) ہوتا ہے، جو واضح طور سے یا مبہم طور سے معلوم ہوتا ہے۔ ربوٰ کے معاملہ میں ہمیں کوئی واضح علت معلوم نہیں ہوتی۔ قرض لین دین یا اور کسی قسم کے تبادلہ اشیاء میں کیا چیز نقصان دہ اور نامناسب ہے اسے سمجھنے میں چوں کہ تاریخی اور سماجی حالات کا بھی رول ہے اس لئے زمان ومکان کے فرق کے لحاظ سے اس کا قانونی جواب الگ الگ ہوسکتا ہے۔ لین دین کے نئے نئے طریقے ہمیشہ سامنے آسکتے ہیں۔ ایسا کوئی ٹھوس اور بے لچک سطحی سا قانونی خاکہ نہیں بنایا جاسکتا جس میں انفرادی اور سماجی حالات کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ لین دین یعنی ''معاملات'' کے سلسلے میں شریعت کا عام اصول ہے کہ ہر طرح کا معاملہ اس وقت تک جائز اور صحیح ہے جب تک اس میں شریعت کے کسی حکم کے خلاف ورزی نہ ہو۔ شریعت کا ایک بنیادی اور اہم مقصد ''ضرر'' (نقصان) اور ''مشقت'' یا ''حرج'' سے بچانا ہے [دیکھیں ۵:۶؛ ۲۲:۷۸، نیز ۲:۱۸۵، ۲۳۳، ۲۸۶؛ ۶:۱۵۲؛ ۷:۲۴؛ ۲۳:۶۲؛ ۶۵:۷]۔ تاریخی ارتقاء اور سماجی واقتصادی فرق وتبدیلیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جدید زمانے کے بعض فقہاء ''انٹرسٹ'' کی اصطلاح کو سمجھنے کی طرف مائل ہوئے ہیں جو کہ جدید لین دین [جیسے بنکنگ، انشورنس، مورٹاج وغیرہ] میں استعمال ہوتی ہے، جیسے کہ یہ ربوٰ کا عین مترادف ہو۔ ان جدید حالات کو جن میں بنکنگ اور انشورنس وغیرہ کے امور پروان چڑھے ہیں جس سے مالیات اور مالی سرمایہ کاری پیداواری عمل سے (چاہے وہ زرعی پیداوار ہو یا صنعتی یا کاروباری وکوئی دیگر) الگ ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ جدید لین دین میں ٹائم فیکٹر بھی لازم ہوگیا ہے، کیوں کہ ٹرانسپورٹیشن اور کمیونکیشن کے میدان میں انقلابی تبدیلیوں کا زبردست اثر مال کر گردش ''منی سرکولیشن'' پر، نقد رقم کی دستیابی اور بہاؤ پر اور نتیجتاً قرض کی ضرورت پر پڑا ہے۔

اسی طرح، ٹرانزیکشن کی رفتار کی وجہ سے جو کہ ٹیلی فون، موبائل فون، فیکس یا کمپیوٹر سے ہوسکتا ہے، رسک فیکٹر بھی بڑھ گیا ہے۔ معاصر گلوبل دنیا میں جس میں ہم رہ رہے ہیں ماس پروڈکشن اور ماس مارکیٹنگ (کثیر مقدار میں پیداوار اور بڑے پیمانے پر خرید وفروخت) کا عمل چل پڑا ہے جس کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی آسٹریائی کمپنی کا کوئی کاروباری یونٹ ملیشیا یا پاکستان میں ہوسکتا ہے اور اس کے لئے مالیات کی فراہمی کا مدار امریکہ یا یوروپ کے بنکوں پر ہوسکتا ہے۔ اس چیز کی وجہ سے مالیات کے معاملات کو دیکھنے اور مالیاتی خدمات فراہم کرنے والے خصوصی اداروں کی ضرورت بڑھ گئی ہے جو کہ طویل یا درمیانی مدت والے آپریشنس اور زراعت یا صنعتی پیداوار کے عمل کے اور کاروباری اداروں کے رسک سے مختلف ہے۔ اس طرح کے مالیاتی ادارے شیئر ہولڈرس کو، ڈیپازٹرس کو اور قرض لینے والوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اور یہ افراد کی ملکیت نہیں ہوتے ہیں۔ اس طرح قانونی تحفظاتی بندوبست اجارہ داری سے اور مختلف قسم کی دھوکہ دھڑی واستحصال سے بچاتے ہیں۔ مرکزی (قومی) بنک کو مالیاتی اداروں اور سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ مزید برآں، مال کا تبادلہ سونے اور چاندی کی شکل میں نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس کی قدر برقرار نہیں رہتی۔ کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافے سے قوت خرید پر اثر پڑتا رہتا ہے۔ فی زمانہ معیشت واقتصادیات کے میدان میں ان تمام تبدیلیوں پر گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انٹرسٹ پر مبنی لین دین اور انٹرسٹ کی کارکردگی کی نوعیت کو ٹھیک سے سمجھا جاسکے اور اس بات کو کہ قرآن وسنت کے بیانات کی روشنی میں اس کی حیثیت ہے اور ربوٰ سے وابستہ تاریخی وسماجی حالتوں سے اس کی نسبت کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ متعلقہ فریقوں کی مخصوص صورت حال اور ان کے درمیان ٹرانزیکشن کی نوعیت کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔ محمد اسد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''ہر آنے والی مسلم پیڑھی کو (میرے خیال میں ہر مسلم معاشرے کو اپنی مخصوص صورت حال کے مطابق) لفظ ربوٰ کے نئے مطلب اور نئی جہتوں کا تعین کرنے کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔ آج کے زمانے میں مختلف قسم کے لازمی ٹرانزیکشنس کو اس لحاظ سے سمجھنے کے لئے کہ یہ

ربوٰ کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں بہت سی فقہی کوششیں کی گئی ہیں۔

مصر کے معروف فقیہ اور قاہرہ یونیورسٹی میں کالج آف لاء کے پروفیسر آف شریعت عبدالوہاب خلاف (متوفی جنوری ۱۹۵۶) نے اپنی ممتاز تصنیف ''علم اصول الفقہ'' (۱۹۴۲) نے بعض موخرین احناف کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے ایسے لون لینے کی اجازت دی ہے جو اضافی رقم کے ساتھ واپس کئے جاسکتے ہیں اگر لینے والا واقعی ضرورت مند ہو [ص ۲۱۰، ۱۲واں ایڈیشن، کویت ۱۹۷۸]۔ (یہاں اس بات کو پیش نظر رکھا جانا چاہئے کہ کوئی ایسی چیز جو صاف طور سے حرام کی گئی ہو، اسے بھی شدید کی ضرورت کی حالت میں بقدر ضرورت استعمال کرنے کی اللہ نے ضرورت مند فرد کو اجازت دی ہے) [دیکھیں ۲:۱۷۳؛ ۵:۳؛ ۶:۱۱۹، ۱۴۵؛ ۱۶:۱۱۵]، اور اجتماعی ضرورت شدید کی حالت میں معاشرے کو بھی اللہ نے اس کی اجازت دی ہے [دیکھیں خلاف کی علم اصول الفقہ، ص ۲۰۸ تا ۲۱۰؛ الجوائنی، امام الحرمین عبد الملک، غیاث الامم، مرتبہ فواد عبدالمنعم، مصطفیٰ حلمی، قاہرہ، (تاریخ نامعلوم)، ص۔ ۳۴۵]۔ ۱۹ویں صدی سے مسلمانوں کو ان بنکنگ اور انشورنس امور سے سابقہ پیش آرہا ہے جو یوروپی ادارے چلاتے ہیں۔ ممتاز حنفی فقیہ محمد ابن عابدین [م۔ ۱۲۵۲ ہجری/۱۸۳۶ء] نے انشورنس کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ مراکش کے محمد ابن الحسن الحاجوی الثعلبی نے جو مالکی فقہ کے مشہور فقیہ ہیں فقہی اسلامی کی تاریخ پر ایک شاندار کتاب ''الفکر السامی فی تاریخ الفقہ الاسلامی'' تصنیف کی ہے جس میں انھوں نے انشونس معاہدے کو قابل قبول قرار دیا ہے اور ان تین فقہاء کے دلائل کو رد کیا ہے جنھوں نے اسے ممنوع مانا ہے [بحوالہ احمد عاشور الفقہ المیسر، جلد ۲، ص ۳۶۰، ۵واں ایڈیشن، قاہرہ]۔

محمد الہبی سابق صدر جامعہ ازہر، مصر نے جنھوں نے دس سال پہلے وفات پائی، انشورنس کو جائز مانا ہے اور اس تجزیہ کا تتبع کیا ہے انشورنس میں دو الگ الگ آپریشن (کارروائیاں) ہوتی ہیں۔ پہلی کارروائی انشور۔

۔۔۔ دوسری کارروائی انشور کرنے والی پارٹی کی طرف سے سرمایہ کاری کی کارروائی ہے اور یہ پوری طرح انشور کرنے والے کی ذمہ داری ہے۔ انشورنس لینے والے کی کوئی ذمہ داری اس معاملہ میں نہیں ہوتی کہ انشور کرنے والا رقم کی سرمایہ کا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہے اور جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے اگر۔۔

اسلامی فقہ میں ہر اس شخص کے جائز حقوق کی حفاظت کرتی ہے جو قرآن میں سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے سود خوری میں مبتلا تھا۔ ایسے شخص کو کہا گیا کہ وہ جو کچھ پہلے لے چکا وہ لے چکا کیوں کہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ قانون کا اعلان کئے جانے کے بعد ہی قانون نافذ ہوتا ہے، اسے پہلے گزر چکے وقت سے لاگو کرنے کی کوئی تک نہیں ہے؛ ''جس کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اُس کا اور (قیامت میں) اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے [۲:۲۷۵]؛ ''جو پہلے ہو چکا وہ اللہ نے معاف کر دیا اور جو پھر (ایسا کام) کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے'' [۵:۹۵؛ نیز دیکھیں ۴:۲۲، ۲۳؛ ۸:۳۸]۔ شریعت کا مقصد ناانصافی کو ختم کرنا ہے اس شخص کو تباہ کرنا نہیں ہے جو ناانصافی کا مرتکب ہوا ہو۔ اس کی منشاء تو یہ ہے کہ ''زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پس جب وہ رجوع کرے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے'' [۴۹:۹]۔ اگر گزرے دنوں میں غلط کام کرنے والے لوگ آج بھی غلط کام کرتے رہیں تو انسانوں کی حالت کبھی بہتر نہیں بن سکتی۔ مہاجن جو قرض کی ادائیگی میں ہونے والی ہر تاخیر سے فائدہ اٹھاتا چلا جاتا ہے اسے قرآن یہ تاکید کرتا ہے کہ وہ قرض دار کی حالت کا لحاظ کرے، اگر اسے قرض کی ادائیگی میں تاخیر ہو رہی ہے تو اسے مہلت دے: ''اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو تو (اُسے) وسعت (کے حاصل ہونے

تک) مہلت (دو)''۔قرض دینے والے کو مزید یہ تاکید کی گئی کہ وہ انصاف سے آگے بڑھ کر احسان کا معاملہ کرے، اگر قرض دار قرض ادا کرنے کی حالت میں نہیں ہے تو اسے معاف ہی کردے اور یہ کہ ایسا کرنا''تو تمہارے اپنے لئے ہی زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو [۲:۲۸۰]۔قرض کے بوجھ تلے دبے کسی انسان کا قرض معاف کردینے سے، آنے والی زندگی میں اللہ کی طرف سے انعام ملنے کے علاوہ دنیاوی فائدہ یہ ہے کہ اس قوت خرید پھر سے بحال ہوگی جس سے صنعت کار، فروخت کار اور پورے سماج کو فائدہ ہوگا۔اسلامی حکومت کے خزانے میں زکوٰۃ سے آنے والی رقم کا بھی ایک حصہ قرض کے بوجھ تلے لوگوں کو قرض سے نکالنے میں خرچ کیا جاتا ہے[۹:۶۰]۔

آخری بات یہ ہے کہ جو لوگ مشکل ومشقت میں مبتلا لوگوں کا خون نچوڑتے ہیں اور ان سے مال چوستے رہتے ہیں انہیں قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ یہ زندگی تو آخر کار ختم ہوجائے گی، اور انسان کے لئے سمجھ داری کی بات یہی ہے کہ وہ آنے والی زندگی میں اللہ کے سامنے جواب دہی سے ڈرتا رہے، جب ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا[۲:۲۸۱]

قرض لین دین کے وقت گواہی کا اہتمام

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَ لْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا

مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کیلئے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اُس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں (کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ) انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسا اُسے اللہ نے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے اور دستاویز لکھ دے۔اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے اور اللہ سے کہ جو اُس کا مالک ہے خوف کرے اور زرِ قرض میں سے کچھ کم نہ لکھوائے۔اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کیساتھ مضمون لکھوائے اور اپنے میں سے دو مردوں کو (ایسے معاملے کے) گواہ کرلیا کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو (کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی اور جب گواہ (گواہی کیلئے) طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اُس (کی دستاویز) کے لکھنے لکھانے میں کاہلی نہ کرنا۔یہ بات اللہ کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے۔اور شہادت کیلئے بھی یہ بہت درست طریقہ ہے۔اس سے تمہیں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پڑے گا۔ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اگر (ایسے معاملے کی) دستاویز نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔اور جب خرید وفرخت کیا کرو تو بھی گواہ کرلیا کرو اور کاتبِ دستاویز اور گواہ

يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

(معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں۔ اگر تم (لوگ) ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے اور اللہ سے ڈرو اور (دیکھو کہ) وہ تمہیں (کیسی مفید باتیں) سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور اگر تم سفر پر ہو اور (دستاویز) لکھنے والا نہ مل سکے تو (کوئی چیز) رہن باقبضہ رکھ کر (قرض لے لو) اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے (یعنی رہن کے بغیر قرض دیدے) تو امانتدار کو چاہئے کہ صاحبِ امانت کی امانت ادا کردے۔ اور اللہ جو کہ اُس کا رب ہے اُس سے ڈرے۔ اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔ جو اُس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کروگے یا چھپاؤ گے تو اللہ تم سے اُس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے مغفرت کرے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲:۲۸۲ تا ۲۸۴)

چوں کہ قرآن ربوٰ (سود) کو حرام قرار دیتا ہے اور سودی لین دین کو سختی سے منع کرتا ہے اور ان لوگوں کو جو سود سے آمدنی سے حاصل کرتے ہیں ''اللہ اور رسول سے برسر جنگ'' قرار دیتا ہے اس لئے وہ قرض لین دین کا ایک متبادل طریقہ بتاتا ہے جس میں ذمہ داری سے منکر ہونے کے خطرے کو دور کرنے کے لئے قانونی اور اخلاقی بندوبست کئے گئے ہیں۔ پہلا تحفظاتی بندوبست یہ ہے کہ قرض لینے اور دینے کو تحریر میں لایا جائے اور اس کی تاریخ واپسی لکھی جائے، نیز قرض لینے اور دینے والے کے بارے میں دیگر ضروری تفصیلات لکھی جائیں [جیسے نام، پتہ، قرض کی واپسی کا مقام وغیرہ]۔ دوسری تحفظاتی تدبیر یہ ہے کہ قرض لین دین کو تحریر میں لانے کا کام ترجیحی طور سے کوئی تیسرا فریق کرے گا تا کہ غیر جانب داری اور بھروسہ قائم رہے،'' لکھنے والا تم میں (کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ) انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسا اُسے اللہ نے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے''۔ یہ بات اس کام کو انجام دینے کے لئے کسی عوامی عہدے (دفتر) کی قیام کے لئے بھی ایک صاف مانا جاسکتا ہے تا کہ یہ محض ایک رضا کارانہ کام ہی نہ رہ جائے۔ تیسرا بندوبست یہ ہے کہ قرض لینے والا خود لکھوائے گا کہ لکھنے والے کو کیا لکھنا ہے، تا کہ لکھی ہوئی تحریر ایک بیان کے طور پر بھی ضبط تحریر میں لائی گئی ہو۔ چوتھے بندوبست کے طور پر دو گواہوں کی گواہی کو لازم کیا گیا ہے جو اس بات کے گواہ ہوں کہ لین دین ان کی موجودگی میں صحیح طریقے سے ہوا ہے اور اس میں دونوں کی آزادانہ رضامندی شامل ہے کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ گواہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ جب ضرورت ہو تو وہ گواہی دینے کے لئے آئے اور پوری حقیقت کو بتائے اور کسی بات کو نہ چھپائے۔ اسی کے ساتھ گواہ اور کاتب کو پورا تحفظ دیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کسی حق بات کو نہ کہنے یا بدلنے کے لئے ان پر کوئی دباؤ نہ ہو یا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ تمام ضروری بندوبست قرض لینے اور دینے کے معاملے میں کوئی تنازعہ پیدا ہونے کے امکان کو کم سے کم کرتے ہیں: ''یہ بات اللہ کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے۔ اور شہادت کیلئے بھی یہ بہت درست طریقہ

ہے۔اس سے تمہیں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پڑے گا۔'' یہ پورا طریقہ عمل پہلے پہل ایک ناخواندہ اور بے پڑھے لکھے سماج کو سکھایا گیا تھا اور اہل ایمان کو اس طریقے پر قرض لینے و دینے کی تعلیم دی گئی تھی چاہے قرض چھوٹا ہو یا بڑا۔

ان تمام قانونی لوازمات کے پہلو بہ پہلو متعلقہ فریق اور پورا سماج جو ان ضابطوں کی پابندی کرے اسے ان لوازمات کو اختیار کرنے کی تلقین یہ کہہ کر کی گئی کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اس طرح خود ان کے ایمان کو ان کے کاروباری معاملات کا نگراں بنا دیا گیا۔ کاتب کو یہ تاکید کی ہے کہ وہ دستاویز منصفانہ طریقے سے لکھے اور جو کچھ اس نے سیکھا ہے اور کرسکتا ہے اسے کرنے سے کترائے نہیں؛ یہ افراد کو ان کی سماجی ذمہ داری کی واضح یاددہانی ہے کہ اپنی لیاقتوں کے مطابق دوسروں کی مدد کریں، چاہے وہ سرکاری افسر ہوں، کوئی کلرک ہوں، یا رضا کارانہ خدمت دینے والے ہوں۔قرض دار جسے دستاویز کا مضمون لکھوانا ہوتا ہے اسے چاہئے کہ ''اللہ سے کہ جو اُس کا مالک ہے خوف کرے اور زرِ قرض میں سے کچھ کم نہ لکھوائے۔''

قرض لین دین کی دستاویز لکھ کر رکھنے کی قرآنی تاکید کو پورا کرنا بعض معاملوں میں مشکل ہوتا ہے، جس کے لئے متبادل یا تکمیلی بندوبست قرآن نے فراہم کئے ہیں: '' اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کیساتھ مضمون لکھوائے''۔ جہاں تک ایک مرد گواہ کی کمی پوری کرنے کے دو خاتون گواہوں کا تقاضا ہے تو اس کا سبب قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ''اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی''۔اس زمانے میں عرب کی عورتیں کاروباری معاملات کی اور ان کے حساب کتاب نیز ان میں استعمال ہونے والی زبان کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتی تھیں اور اس لئے قرض دار کے ذریعہ لکھوائی جانے والی شرطوں اور ضابطوں اور کاتب کے ذریعے لکھی جانے والی تحریر کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔جیسا کہ فقہاء نے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ ایک مرد گواہ کی جگہ دو خاتون گواہوں کی ضرورت قرض لین دین کے اس معاملے تک ہی محدود ہے [جیسے ابن القیم، ''الطروق الحاکمیہ'']۔ کچھ فقہاء جیسے التھاور، طبری اور ابن حزم نے عورت کو جج بننے کی اجازت دی ہے اگر وہ اس منصب کے لازمی تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور اس کے لئے طے شدہ اہلیت رکھتی ہو۔دوسری طرف حنفی فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت صرف سول معاملوں کی جج ہوسکتی ہے، کیوں کہ کرمنل معاملے عورت کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لئے قابل برداشت نہیں ہیں۔تو ایک فطری سوال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت جج بننے کی مجاز ہوسکتی ہے تو اسے آدھی گواہی کے لائق کیسے مانا جاسکتا ہے؟ یہ ایک فقہی اصول ہے کہ کوئی قانونی ضابطہ اس کی علت ہونے یا نہ ہونے۔۔۔۔۔۔۔۔

کاروباری معاہدوں میں رسم خانہ پوری کو کم سے کم کرنا چاہئے کیوں کہ انہیں جلدی جلدی نمٹانے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ فریقوں کے درمیان بھروسہ اور اعتماد پر ہوتے ہیں؛ چنانچہ ریکارڈ اور ڈاکومنٹیشن کا بوجھ ہلکے سے ہلکا ہونا چاہئے: ''ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اگر (ایسے معاملے کی) دستاویز نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔اور جب خرید وفرخت کیا کرو تو بھی گواہ کرلیا کرو''۔ اس طرح قرآنی قانون جدید قوانین کی طرح گواہوں کی ضرورت کے معاملے میں سماجی اور کاروباری ذمہ داریوں کے درمیان فرق ملحوظ رکھتا ہے۔سفر کے حالات کا بھی اس میں لحاظ رکھا گیا ہے کیوں کہ سفر میں کاتب اور گواہوں کا دستیاب ہونا مشکل ہے۔ایسی صورت میں قرض دار کو چاہئے کہ قرض دینے والے کے پاس ضمانت کے طور پر کوئی چیز رکھے۔البتہ قانون میں بھروسہ کا بھی مقام ہے اور خاص طور سے سفر جیسی حالت میں، اور قرض دینے والے نے جو اعتماد اور بھروسہ قرض خواہ پر کیا ہو اسے پورا کرنا قرض دار کی ذمہ داری ہے۔گواہ کا یہ حق کہ وہ ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہو اور ہر طرح کے خطرے سے اسے تحفظ حاصل ہو صرف قرض کے لین دین تک ہی محدود نہیں ہے۔یہ دراصل

انسانی حقوق اور ذمہ داریاں ہیں جو افراد اور سماج کو پوری کرنا چاہئیں اور سماج کی طرف سے یہ اس کو یقینی بنانا حکومت کا کام ہے۔ یہ ہر فرد اور گروہ کا حق و ذمہ داری ہے کہ اپنی رائے آزادانہ طریقے سے عوامی طور پر ظاہر کرے اور سماج و حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام لوگوں کے لئے بغیر کسی ظاہری یا اخلاقی دباؤ کے اظہار کے حق کی حفاظت کرے۔ اوپر درج کی گئی آیتوں میں دو آیتیں ۲:۲۸۲ اور ۲:۲۸۳ تمام انسانی تعلقات کے لئے اور قانونی نظام عمل کے لئے ایک لیگل اور مورل سورس فراہم کرتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایسے بہترین اور محتاط قانونی ضابطے پورے قرآن کے مخصوص اسلوب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ قرض کے لین دین کے لئے ان قانونی اور اخلاقی لوازم کا ذکر کرنے کے بعد (جو کہ مجموعی طور سے سول اور کمرشیل ٹرانزیکشن کے لئے اور وسیع تر دائرے میں حقوق و ذمہ داریوں کے لئے عمومی رہنمائی دیتے ہیں)، قرآن مومنوں کو یہ یاد دلاتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور روز آخرت کا خوف رکھتے ہیں انکا ایمان انہیں ان باتوں پر عمل کے لئے تیار کرتا ہے اور اس ایمانی کیفیت کا کوئی مقابلہ کسی انسانی اختیار اور حکم سے نہیں کیا جا سکتا۔ اہل ایمان کو یہ بات ہمیشہ اپنے دل و دماغ میں رکھنا چاہئے کہ ''تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو گے یا چھپاؤ گے تو اللہ تم سے اُس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے مغفرت کرے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے'' [۲:۲۸۴؛ نیز دیکھیں ۲:۳۳، ۷۷؛ ۳:۲۹؛ ۵:۹۹؛ ۵:۱۱؛ ۱۶:۱۹، ۲۳؛ ۳۳:۵۴؛ ۶۰:۱؛ ۶۷:۱۳ وغیرہ]۔

معاہدوں کو پورا کرنا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو تمہارے لئے چار پائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں بجز اُن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا اللہ تعالیٰ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ (۱:۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰۗىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰي قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ②

جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑے وہ اور جنہوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور اُن کی مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو اُن کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں اور اگر وہ تم سے دین (کے معاملات) میں مدد طلب کریں تو تم کو مدد کرنی لازم ہے مگر اُن لوگوں کے مقابلے میں کہ تم میں اور اُن میں (صلح کا) عہد ہو (مدد نہیں کرنی چاہئیے) اور اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ (۷۲:۸)

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾

اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دستبردار ہے) پس اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر نہ مانو (اور اللہ سے مقابلہ کرو) تو جان رکھو کہ تم اللہ کو ہرا نہیں سکو گے، اور (اے پیغمبر!) کافروں کو دردناک کی خبر سنا دو۔ ۳۔ البتہ جن مشرکوں کیساتھ تم نے عہد کیا ہو اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا ہو اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی ہو تو جس مدت تک اُن کیساتھ عہد کیا ہو اُسے پورا کرو (کہ) اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (۹:۳ تا ۴)

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾

اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اُس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام الٰہی سننے لگے پھر اُس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو اس لئے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں۔ (۹:۶)

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷﴾ كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾

بھلا مشرکوں کیلئے (جنہوں نے عہد توڑ ڈالا) اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیونکر (قائم) رہ سکتا ہے، ہاں جن لوگوں کیساتھ تم نے مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کے نزدیک عہد کیا ہے اگر وہ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تو تم بھی اپنے قول و اقرار (پر) قائم رہو بیشک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۷۔ (بھلا ان سے عہد) کیونکر (پورا کیا جائے جب اُن کا یہ حال ہے) کہ اگر تم پر غلبہ پالیں تو نہ قرابت کا لحاظ کریں نہ عہد کا۔ یہ منہ سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں لیکن اُن کے دل (ان باتوں کو) قبول نہیں کرتے اور ان میں اکثر نافرمان ہیں۔ (۹:۷ تا ۸)

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ

اور جب اللہ سے پختہ عہد کرو تو اُس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو اُن کو مت توڑو کہ تم اللہ کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو اور جو کچھ تم

كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

کرتے ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے توسوت کاتا پھر اُس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ بنا لو گے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ غالب رہے، بات یہ ہے کہ اللہ تمہیں اس سے آزماتا ہے اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اُس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو عمل تم کرتے ہو (اس دن) اُن کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔ اور اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ نہ بناؤ کہ (لوگوں کے) قدم جم چکنے کے بعد لڑکھڑا جائیں اور اس وجہ سے کہ تم نے لوگوں کو اللہ کے رستے سے روکا، تم کو عقوبت کا مزہ چکھنا پڑے اور بڑا سخت عذاب ملے۔ اور اللہ سے جو تم نے عہد کیا ہے (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو (کیونکہ ایفائے عہد کا) جو (صلہ) اللہ کے ہاں مقرر ہے وہ اگر سمجھو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی ہے (کہ کبھی ختم نہیں ہوگا) اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم اُن کو اُن کے اعمال کا نہایت اچھا بدلا دیں گے۔ جو شخص نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اُس کو (دنیا میں) پاک (اور آرام کی) زندگی سے زندہ رکھیں گے اور (آخرت میں) اُن کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔

(۱۶:۹۱ تا ۹۷)

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکنا مگر ایسے طریق سے کہ بہت بہتر ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے ضرور پرسش ہوگی۔ (۱۷:۳۴)

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾

اور جو امانتوں اور اِقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ (۲۳:۸؛ نیز ۷۰:۳۲)

عربی کا لفظ عقد جس کی جمع عقود ہے اور جس کو پورا کرنے کا حکم قرآن نے دیا ہے [۵:۱] اس میں دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے درمیان ہونے والے معاہدے اور عہد و پیمان بھی شامل ہیں اور کسی فرد کا خود اپنے طور پر کوئی عہد کرنا یا قسم کھانا بھی شامل ہے۔ یہ ایک جامع لفظ ہے اور اس میں اللہ سے کیا ہوا عہد بھی شامل ہے [۲:۲۷، ۴۰؛ ۳:۷۶ تا ۷۷؛ ۹:۷۵؛ ۱۳:۲۰، ۲۵؛ ۱۶:۹۵؛ ۳۳:۱۵]، نیز قوموں اور ملکوں کے درمیان ہوئے معاہدے بھی شامل ہیں۔ اس طرح یہ آیت پرائیوٹ لاء کے مختلف میدانوں خاص طور سے اس کی سول اور کمرشیل برانچوں پر بھی عائد ہوتی ہے، جیسے ملازم اور مالک کے درمیان تعلقات اور دستوری، انتظامی، مالیاتی اور بین الاقوامی قوانین کے مختلف میدان۔ وہ تمام عہد اور معاہدے جن سے مسلمان بندھے ہوئے ہوں قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور انہیں اللہ سے کئے ہوئے عہد کہا گیا ہے [۶:۱۵۲؛ ۱۶:۹۱]، کیوں کہ وہ لوگوں سے اللہ کے نام پر یا اللہ کو گواہ بنا کر کئے جاتے ہیں اور یہ ان لوگوں کے عہد ہیں جنھوں نے خود کو اللہ کی رضا اور ہدایت کے آگے جھکا دیا ہے۔ ان لوگوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں جو انہیں دیکھ رہا ہے اور ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے، اور جو فرد بشر کو اپنے کاموں کے لئے جواب دہ بناتا ہے۔ تمام افراد اس کی طرف پلٹائے جائیں گے اور وہ آخرت میں ان کا فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ وہ عہد اور وعدے بھی جو دشمنوں سے کئے جائیں وہ بھی پورے کئے جائیں گے۔ مزید برآں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ کوئی دشمن بھی اگر تحفظ کی فریاد کرے (آج کی اصطلاح میں پناہ کا طالب ہو) تو اسے بھی تحفظ اور پناہ دیں [۹:۶]، اور جب وہ جانا چاہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے ٹھکانے تک محفوظ طریقے سے اس کے پہنچنے کو یقینی بنائیں، چاہے وہ بعد میں پھر دشمنی پر اتر آئے۔

لفظ عقد کا اسی وسیع مفہوم سے ''ذمہ'' یا اہل الذمہ (یعنی ذمی) کی اصطلاح وجود میں آئی جو اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندوں یا وہاں عارضی طور سے قیام کرنے والے غیر مسلموں کو خصوصی تحفظ دینے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ یہ گویا اسلامی ریاست اور اس کے حکام کی طرف سے تحفظ اور انصاف کا ایک عہد ہوتا تھا۔ اسلام کی ابتدائی فتوحات کے دور میں، جب مسلم افواج حکمت عملی کے تحت کسی علاقے سے نکلنے پر مجبور ہوئیں تو انھوں نے غیر مسلم شہریوں کو اس کی خبر دی کہ وہ اب ان کے دفاع اور تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں [بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ، ۱۹۵۹، ص ۱۴۳ (شام کے حمص علاقے سے متعلق ایک رپورٹ)]۔ معروف مالکی فقیہ القرافی [متوفی ۱۲۸۵] نے لکھا ہے کہ کوئی بھی مسلم فرد، گروہ یا حاکم جو اسلامی ریاست میں رہنے والے کسی غیر مسلم کے ساتھ زیادتی کرے وہ اصل میں ''ذمہ'' لینے کے عہد کے خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے، جو ہر مسلمان پر واجب ہے۔ بین الاقوامی قانون کے معاملے میں، وسط ایشیا کے شہر ثمرقند کے لوگوں نے ایک بار خلیفہ عمر بن عبدالعزیز [۷۱۷ تا ۷۲۰] سے شکایت کی کہ سپہ سالار قتیبہ بن مسلم نے عہد کے خلاف ورزی کرتے ہوئے شہر میں دخل اندازی کی ہے اور بہت سے مسلمانوں کو یہاں بسا دیا ہے۔ خلیفہ یہ معاملہ قاضی کے سپرد کر دیا جنھوں نے فیصلہ دیا کہ مسلمان شہر سے نکل جائیں [البلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۱۱]۔

یہ اللہ پر ایمان اور اس کا اثر ہے جو کسی قانونی ذمہ داری کے احساس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اور اس کے حضور جواب دہی کا احساس اس دنیا کے ہر ممکنہ مادی فائدے کو اللہ کے حکم اور انصاف کے آگے چھوڑ دینے کو تیار کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے طاقتور فریق کو چاہے وہ افراد ہوں یا ریاست کے حکام ہوں یا پورا ملک ہو، اپنی طاقت سے کہیں عظیم طاقت رکھنے والی ہستی کا اور ایک منصف حقیقی کا اور اس کی طرف سے ملنے والی جزا یا سزا کا احساس رہتا ہے اور وہ اس دنیا کے کسی عارضی فائدے کو تج دینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے: '' بات یہ ہے کہ اللہ تمہیں اس سے آزماتا ہے اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اُس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو عمل تم کرتے ہو (اس دن)

اُن کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔ اور اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ نہ بناؤ کہ (لوگوں کے) قدم جم چکنے کے بعد لڑکھڑا جائیں اور اس وجہ سے کہ تم نے لوگوں کو اللہ کے رستے سے روکا، تم کو عقوبت کا مزہ چکھنا پڑے اور بڑا سخت عذاب ملے۔ اور اللہ سے جو تم نے عہد کیا ہے (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو (کیونکہ ایفائے عہد کا) جو (صلہ) اللہ کے ہاں مقرر ہے وہ اگر سمجھو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی ہے (کہ کبھی ختم نہیں ہوگا) اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم اُن کو اُن کے اعمال کا نہایت اچھا بدلا دیں گے۔ جو شخص نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اُس کو (دنیا میں) پاک (اور آرام کی) زندگی سے زندہ رکھیں گے اور (آخرت میں) اُن کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔''

[۱۶:۹۲ تا ۹۷]۔

غبن سے اجتناب

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا مگر ایسے طریق سے کہ بہت ہی پسندیدہ ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ماپ اور تول انصاف کیساتھ پوری پوری کیا کرو۔ ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اور جب (کسی کی نسبت) کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو گو وہ (تمہارا) رشتہ دار ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کا اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

(۶:۱۵۲)

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ

اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو (بھیجا) تو اُنہوں نے کہا کہ اے قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو میں تو تم کو آسودہ حال دیکھتا ہوں اور (اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو) مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تمہیں گھیر کر رہے گا۔ اور اے قوم! ماپ اور تول انصاف کیساتھ پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی کرتے نہ پھرو۔ اگر تمہیں (میرے کہنے کا) یقین ہو تو اللہ کا دیا ہوا نفع ہی تمہارے لئے بہتر ہے اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں ہم اُن کو ترک کر دیں یا اپنے مال میں جو تصرف کرنا چاہیں تو نہ کریں، تم تو

اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

بڑے نرم دل اور نیک چلن ہو۔ انہوں نے کہا کہ اے قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اُس نے اپنے ہاں سے مجھے نیک روزی دی ہو (تو کیا میں اُن کے خلاف کروں گا)؟ اور میں نہیں چاہتا کہ جس امر سے میں تمہیں منع کروں خود اُس کو کرنے لگوں، میں تو جہاں تک مجھ سے ہو سکے (تمہارے معاملات کی) اصلاح چاہتا ہوں اور (اس بارے میں) مجھے توفیق کا ملنا اللہ ہی (کے فضل) سے ہے میں اُسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (۱۱:۸۴ تا ۸۸)

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾

اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو اور (جب تول کر دو تو) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔ اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اُس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔ (۱۷:۳۵ تا ۳۶)

وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾

اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔ (۵۵:۹)

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿۳﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾

ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا کریں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اٹھائے بھی جائیں گے؟ (یعنی) ایک بڑے (سخت) دن میں۔ جس دن (تمام) لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ (۸۳:۱ تا ۶)

''پورا ناپو اور انصاف سے تولو'' کا حکم محض ناپ تول اور لین دین کے معاملات سے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع تر مفہوم بھی ہے۔ کسی لین دین میں یا معاہدے میں شامل تمام فریقوں کے حقوق اور ذمہ داریوں میں توازن اور انصاف کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کسی بھی فریق کی طرف سے کسی بھی قسم کا غبن، دھوکہ یا استحصال کا مطلب ہے لوگوں کے مال میں خورد برد کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا اور زمین میں فساد برپا کرنا۔ مال داروں اور محروموں کے درمیان، حاکموں اور محکوموں کے درمیان، طاقت وروں اور کمزوروں کے درمیان یا برابر کی

حیثیت نہ رکھنے والے کوئی بھی دو فریقوں کے درمیان معاملات یا تعلقات میں کسی بھی قسم کی ناانصافی اصل میں حقوق اور ذمہ داریوں پورا ناپنے یا تولنے میں کمی کے مترادف ہے۔ اللہ نے شعیب علیہ السلام کے زمانے میں بھی انسانوں کو یہ ہدایت دی کہ ایک دوسرے کے ساتھ منصفانہ اور درست کیا معاملہ کریں۔ لیکن مال دار لوگوں نے اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ''اپنے مال میں جیسا چاہیں کریں'' والے رویہ پر کسی بندش کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے ایسی کسی مداخلت یا بندش کو صحیح سوچ اور صحیح الدماغ ہونے کے خلاف سمجھا۔ انسانوں کے لئے اللہ کے پیغام ہدایت میں ایک دوسرے کے ساتھ منصفانہ معاملات کی تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور اس کا مقصد چیزوں کو صحیح مقام پر رکھنا یعنی عدل و قسط کو قائم کرنا اور سماجی حالات کو ہر ممکن حد تک درست کرنا ہے: ''میں تو جہاں تک مجھ سے ہو سکے (تمہارے معاملات کی) اصلاح چاہتا ہوں'' [۱۱:۸۸]، ''اللہ کسی نفس پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا [۲:۲۳۳؛ نیز ۲:۲۸۶؛ ۶:۱۵۲؛ ۷:۱۲؛ ۲۳:۶۲]۔ مطلق اور پورا پورا انصاف تو دنیا میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، تاہم ہمیشہ یہ نیت اور کوشش رہنے چاہئے کہ انصاف سے کام لیا جائے اور صحیح سلوک کیا جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تمام ممکن کوششیں کی جائیں اور افراد، سماج و حکومتیں اگر یہ کوشش کریں گی تو انسانوں کے حالات میں بہتری آئے گی اور ان کے معاملات کی اصلاح ہوگی۔ خود اپنے بارے میں یا دوسروں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے آدمی کو دوستی یا دشمنی یعنی طرف داری یا تعصب کے جذبات سے بچنا چاہئے، اور ٹھیک ٹھیک ناپنا و تولنا چاہئے اور ہر معاملہ میں مثبت و منفی کا موازنہ کرنا چاہئے؛ ''انصاف پر قائم رہو اور اللہ کیلئے سچی گواہی دو، خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم خواہشِ نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا اگر تم پیچدار شہادت دو گے یا (شہادت سے) بچنا چاہو گے تو (جان رکھو کہ) اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے'' [۴:۱۳۵]۔، اور ''لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو (بلکہ) انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے'' [۵:۸]

پلاننگ، کنٹرول اور کرائسس مینجمنٹ

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝

انہوں نے کہا کہ تم لوگ سات سال متواتر کھیتی کرتے رہو گے تو جو (غلہ) کاٹو تو تھوڑے سے غلے کے سوا جو کھانے میں آئے اُسے خوشوں میں ہی رہنے دینا۔ پھر اس کے بعد (خشک سالی کے) سات سخت (سال) آئیں گے کہ جو (غلہ) تم نے جمع کر رکھا ہوگا وہ اس سب کو کھا جائیں گے صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تو اختیار سے رکھ چھوڑ گے۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا کہ خوب مینہ برسے گا اور لوگ اُس میں رس نچوڑیں گے۔ (۱۲:۴۷ تا ۴۹)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝

بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ میں اسے اپنا مصاحبِ خاص بناؤں گا پھر جب ان سے گفتگو کی تو کہا کہ آج سے تم ہمارے ہاں صاحبِ منزلت اور صاحبِ اعتبار ہو۔ (یوسف نے) کہا کہ مجھے

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف ہوں۔ اس طرح ہم نے یوسف کو ملک (مصر) میں جگہ دی اور وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔ ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے اُن کیلئے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔ (۱۲:۵۴ تا ۵۷)

ان آیات میں ایک منصوبے کا ذکر ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کو تجویز کیا تھا تا کہ آنے والے دنوں میں سات سال تک قحط سالی رہنے کے امکان کے پیش نظر اسے اختیار کیا جائے۔ اس میں یہ لحاظ کہ اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر فوقیت دی جائے اور راحت کے موجود دنوں میں آنے والے سخت حالات کے لئے منصوبہ بندی کی جائے، یہ دونوں باتیں شریعت میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، جس کا مقصد افراد اور سماج کے درمیان ہمیشہ توازن قائم رکھنا ہے، اور حال و مستقبل کے درمیان بھی توازن بنائے رکھنا ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق کسی اجتماعی نقصان سے بچنے کے لئے انفرادی نقصان کو برداشت کیا جا سکتا ہے اور اجتماعی مفاد کی بنیاد پر کوئی قانون اس شرط کے ساتھ وضع کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی نصوص اور تصریحات کے خلاف نہ ہو۔

اس کے علاوہ، یہ آیات یہ بتاتی ہیں کہ کوئی شخص کوئی عوامی خدمت انجام دینے کا اہل ہو، خاص طور سے مشکل حالات میں، اسے خود کو پیش کرنا چاہئے اور اپنی لیاقت و استعداد لوگوں کو اور ذمہ داران کو بتانا چاہئے تا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کی شکر گزاری کرے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ قرآن مسلمانوں کو یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ وہ آنے والے کل کے بارے میں بھی سوچیں، ''اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے آنے والے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے'' [۱۸:۵۹]۔ اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی کوشش کرے'' اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے'' [۱۰:۵۹]۔

دھات کا استعمال اور منظّم طریقے سے کام

قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا

ذوالقرنین نے کہا کہ خرچ کا جو مقدور اللہ نے مجھے بخشا ہے وہ بہت اچھا ہے تم مجھے قوتِ (بازو) سے مدد دو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط اوٹ بنا دوں گا تو تم لوہے کے (بڑے بڑے) تختے لاؤ (چنانچہ کام جاری کر دیا گیا) یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کر دیا اور کہا کہ (اب اسے) دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو (دھونک دھونک کر) آگ کر

اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

دیا تو کہا کہ (اب) میرے پاس تانبا لاؤ کہ اس پر پگھلا کر ڈال دوں۔ پھر ان میں یہ قدرت نہ رہی کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ یہ طاقت رہی کہ اس میں نقب لگا سکیں۔ (۱۸:۹۵ تا ۹۷)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کریں اور ترازو (یعنی قواعدِ عدل) تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ا کو معلوم کر لے بیشک اللہ قوی (اور) غالب ہے۔ (۲۵:۵۷)

ان آیات میں قرآن معدنیاتی وسائل کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس بات کی طرف کہ انہیں لوگوں کے فائدے کے لئے کس طرح استعمال کیا جائے۔ پگھلا ہوا تانبا لوہے کی سلیوں پر ڈالا گیا اور اسے اتنا تپایا گیا کہ انگارے کی طرح لال ہو گیا، اس عمل کے بعد ایک نا قابل تسخیر دیوار کھڑی کر دی گئی تا کہ وہ لوگ ایک دوسری قوم کے حملے سے بچ جائیں۔ آیات (۱۸:۹۵ تا ۹۷) کسی کام کے منتظم یا تکنیکی ہدایت کار اور کارکنوں کے درمیان لازمی باہمی تعاون کو اجاگر کرتی ہیں اور اس بات کو کہ کارکنوں یہ محسوس کریں کہ جس کام میں وہ لگے ہوئے ہیں وہ اس کا حصہ ہیں اور ان کی محنت و مشقت کے بغیر وہ کام نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت، قرآن کی آیات اور سنت کی روایات ایسے عام اصول فراہم کرتی ہیں جو آجر اور متاجر (ایمپلائر اور ایمپلائز) کے درمیان تعلقات پر عائد کئے جا سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث یہ اشارہ دیتی ہے کہ جو شخص کسی کے ماتحت کام کرتا ہو اس کے اور نگراں کے درمیان تعلقات انصاف اور رحم دلی پر مبنی ہونا چاہئیں، ''تمھارے خدمت گار تمھارے بھائی (یا بہن) ہیں، اللہ نے تمھیں ان کا ذمہ دار بنا دیا ہے تو جس کسی کے پاس اس کا کوئی بھائی (یا بہن) اس کی ماتحتی میں ہو اسے چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور ویسا ہی پہنائے جیسا خود پہنتا ہے، اور اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لے، اور اگر اس سے کوئی بھاری کام لو تو اس میں اس کی مدد کرو۔'' [بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ]۔ یہ روایت بنیادی طور سے مالک اور غلام کے حوالے سے ہے لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور یہ کسی کام کے نگراں اور اس کی نگرانی میں کام کرنے والے افراد کے درمیان تعلقات پر بھی صادق آتے ہیں۔

اگر یہ ہدایات ایک مالک اور غلام کے درمیان تعلق کے سلسلے میں ہیں تو کسی آجر اور اس کے متاجر کارکنوں کے درمیان تعلق کیسا ہو، اسی سے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی آزاد کارکن کی واجب مزدوری کے حوالے سے ------------------------
-- ''ہم نے بنی آدم کو اکرام دیا ہے، اور اسے زمین و سمندر میں سواری دی، زندگی کی اچھی چیزوں سے اسے رزق بہم پہنچایا۔۔۔'' [۱۷:۷۰]۔ مذکورہ بالا حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کام کرنے والے کارکنوں کا معیار زندگی ان کے ایمپلائر کے معیار زندگی سے بہت زیادہ پست نہ ہو، بلکہ اچھا یہ ہے کہ تقریباً برابر ہی ہو۔ رسول اللہ ایک اور

صحیح حدیث میں ریاست کے سرکاری ملازموں کے لئے گھر، سواری، گھر کے کاموں کے لئے ایک خادم اور اس کی شادی تک کا خیال رکھا گیا ہے [جیسا کہ ابن کثیر نے آیت ۳:۱۶۱ کی تشریح میں نقل کی ہے]۔ یہی ضرورتیں پرائیوٹ سیکٹر میں کام کرنے والے افراد کی بھی ہیں اور ان کی بھی یہ ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ اس کے لئے ایک سرکاری عہدہ محتسب کا تھا جو غلاموں آزاد محنت کشوں کے ساتھ کسی بھی غلط برتاؤ کی شکایت پر فوراً پہنچتا اور اس مسئلہ کو حل کرتا تھا، چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، بلکہ جانوروں کے ساتھ بدسلوکی کی شکایت بھی دور کرتا تھا۔

آیت ۵۷:۲۵ لوہے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے، ''اور اس میں لوگوں کے لئے فائدے بھی رکھے گئے ہیں''، خاص طور سے ریاست کی طاقت کے حوالے سے اس کی اہمیت جسے انصاف قائم کرنا اور بے انصافی سے لڑنا ہوتا ہے چاہے وہ سرحدوں کے اندر کہیں کسی کی طرف سے ہو رہا ہو یا کسی باہری طاقت کے ذریعہ سے ہو رہا ہو۔ ریاست کی فورسز کو ہتھیاروں اور دیگر تکنیکی آلات سے اچھی طرح لیس ہونا چاہئے تاکہ وہ اللہ کی ہدایت میں دئے گئے انصاف کے اصولوں کو روبہ عمل لا سکے۔۔ جیسا کہ ایک مشہور قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بعض اوقات ان برائیوں کو تلوار (ریاست کی طاقت) سے روک دیتا ہے جنہیں لوگ محض وعظ و نصیحت سے نہیں چھوڑتے''۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہئے کہ لوہے اور معدنیات کے استعمال کے جو زبردست پرامن فوائد ہیں وہ اپنی جگہ ہیں جیسے صنعتوں کی ترقی اور معیشت کو فروغ دینے میں اس کا رول؛ جیسا کہ قرآن حوالہ دیتا ہے کہ'' اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں''۔

جوڈیشیل میرٹس

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۷۹﴾

اور داؤد اور سلیمان (کا حال بھی سن لو کہ) جب وہ ایک کھیتی کا مقدمہ فیصل کرنے لگے جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں (اور اُسے روند گئی) تھیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے۔ تو ہم نے فیصلہ (کرنے کا طریقہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکم (یعنی حکمت و نبوت) اور علم بخشا تھا اور ہم نے پہاڑوں کو داود کا مسخر کر دیا تھا کہ ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور جانوروں کو بھی (مسخر کر دیا تھا اور ہم ہی ایسا) کرنے والے تھے۔ (۲۱:۷۸ تا ۷۹)

داؤد علیہ السلام (۹۶۱ قبل مسیح، دور حکمرانی ۱۰۰۲ تا ۹۶۲ قبل مسیح) اور سلیمان علیہ السلام (دور حکمرانی ۹۷۲ تا ۹۲۲ قبل مسیح) دونوں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل کے بادشاہ تھے، قرآن کے بیان کے مطابق وہ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے [درج بالا آیت کے علاوہ دیکھیں ۴:۱۶۳؛ ۶:۸۴؛ ۳۸:۲۶، ۳۵]۔ بعض صحابہ اور تابعین کے بیان کے مطابق درج بالا آیات بھیڑوں کے ایک غلہ کے حوالے سے ہیں جو ایک رات کو ایک کھیت میں گس گیا تھا اور فصل کو تباہ کر ڈالا تھا۔ جب کھیت کا مالک نے حضرت داؤد سے اس کی شکایت کی تو انھوں نے حکم دیا کہ کھیت کے مالک کو معاوضہ کے طور پر بھیڑیں دے دی جائیں۔ حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان نے اس فیصلہ کو بھیڑوں کے مالک کے ساتھ زیادتی والا فیصلہ سمجھا، کہ وہ جب ساری بھیڑیں کھیت کے مالک کو دے دیگا تو خود کنگال ہو جائے گا جب کہ کھیت کے مالک کے پاس زمین تو ابھی بھی موجود ہے۔ سلیمان نے اپنے والد سے کہا کہ اس معاملے میں ان کا فیصلہ اس سے مختلف

ہوگا، وہ یہ کہ کھیت کے مالک کو بھیڑوں پر تصرف کرنے کا اختیار عارضی طور سے دیا جائے جب کہ بھیڑوں کے مالک کو کھیت پر فصل اگانے کا اختیار دیا جائے اس وقت تک جب تک کھیت پہلے جیسی حالت میں نہ آجائے۔ اس طرح جس فریق کا نقصان ہوا ہے اس کے نقصان کی تلافی مناسب طریقے سے ہوجائے گی اور جو فریق قصوروار ہے وہ بھی اپنے مال سے محروم نہیں ہوگا۔ حضرت داؤد نے تسلیم کیا کہ یہ فیصلہ زیادہ صحیح ہے اور اس لئے انھوں نے اپنے فیصلے کو بدل دیا [دیکھیں ابن کثیر کی تشریح، جلد ۳]۔ اس طرح ان آیات سے یہ روشنی ملتی ہے کہ حضرت داؤد جیسے پیغمبر بھی کوئی فیصلہ اپنی صواب دید سے کرتے ہیں اور انسان ہونے کے ناطے فیصلے میں غلطی بھی کر سکتے ہیں یا صحیح ترین فیصلہ تک پہنچنے میں قاصر رہ سکتے ہیں، اور اس طرح وہ اپنے پہلے فیصلے کو ایک دوسرے فیصلے سے بدل سکتے ہیں جو انصاف کے زیادہ قریب ہو، جیسا کہ حضرت داؤد نے اپنے بیٹے کے مشورے پر عمل کیا [دیکھیں ان آیات پر القرطبی کی تفسیر، جلد ۲]۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کے مطابق جب کوئی اجتہاد کرنے والا کسی معاملے میں اجتہاد کرے اور اس میں غلطی کر جائے تو اس کے حصے میں ایک نیکی لکھی جائے گی کہ اس نے حق کو سمجھنے و جاننے کی اپنی پوری کوشش کی، جب کہ اس شخص کو جس کا اجتہاد صحیح ہو اور وہ صحیح نتیجے پر پہنچے تو اس کے حق میں دو نیکیاں لکھی جائیں گی ایک اجتہاد کرنے اور ایک صحیح فیصلے پر پہنچنے کی [بروایت بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی اصول ایک نبی پر بھی عائد ہوگا جب وہ اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کریں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جب کوئی نبی اجتہاد سے کام لیں اور اجتہاد میں غلط نتیجہ اخذ کریں تو اس غلطی کی اصلاح وحی کے ذریعے سے ہوگی، جیسا کہ کچھ علما اور فقہاء نے کہا ہے، جہاں تک اجتہاد کی اجازت ہے اور اجتہاد سے کیا نتیجہ نکالا یہ بات شریعت کے مقاصد اور اصولوں سے متصادم نہیں ہے، چاہے اس معاملہ میں اجتہاد سے صحیح فیصلہ پر نہ بھی پہنچے ہو۔ قرآن میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ سمیت تمام انبیاء بشر ہی تھے، اور اس وجہ سے اپنے انسانی فیصلے میں غلطی کر سکتے ہیں۔ نبیوں کے معصوم عن الخطاء ہونے کی حیثیت اللہ کے پیغام کو پہنچانے کے معاملے میں ہے اور انسانی معاملوں میں ان کی انسانی صواب دید سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے موقع پر اپنی فوج کے ٹھہراؤ کے لئے ایک جگہ کا انتخاب کرنے کا فیصلہ اپنی صواب دید سے کیا، اور جنگ احزاب کے موقع پر آپؐ نے قبیلہ غطفان کے سرداروں کو مدینے کے کھجوروں کی فصل دینے کی پیش کش کی تا کہ وہ اپنا محاصرہ اٹھانے پر راضی ہوجائیں۔ لیکن دونوں پر موقعوں پر آپ کے بعض صحابہ نے زیادہ بہتر مشورہ دیا جسے آپ نے تسلیم کر لیا، اور ایک بار آپ ﷺ نے صاف صاف فرمایا کہ تم اپنے دنیاوی معاملوں میں مجھ سے بہتر سمجھتے ہو' [بہ روایت مسلم؛ نیز دیکھیں جنگ بدر و جنگ احزاب کی داستان کے بارے میں سیرت ابن ہشام اور ابن سعد کی طبقات جلد ۲، ابن القیم کی زاد المعاد، جلد ۳؛ اور ابن کثیر کی تفسیر آیت ۳:۱۵۹]۔ اور جب حضرت معاذ کو آپؐ نے ایک جگہ کا عامل مقرر کر کے روانہ کرتے وقت ان سے پوچھا کہ لوگوں کے معاملوں کا فیصلہ کس طرح کرو گے، تو حضرت معاذ نے اپنے جواب میں قرآن وسنت کے بعد اجتہاد کی بات بھی کہی جسے رسول اللہؐ نے پسند فرمایا اور اس طرح اس اصول کی توثیق کی کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے وقت جب قرآن وسنت سے براہ راست کوئی مثال نہ ملے تو اجتہاد سے کام لیا جائے گا [ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارامی]۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک غزوہ سے واپسی کے وقت جب صحابہ کی ایک جماعت کو یہ تاکید کی کہ وہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر پڑھیں تو راستے میں عصر کی نماز کا وقت کم رہ جانے کی وجہ سے صحابہ کے درمیان اختلاف رائے ہوا اور دونوں گروہوں نے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کیا۔ رسول اللہؐ نے اجتہاد میں اس اختلاف رائے کو سند قبولیت دی۔ [بخاری، مسلم]۔

مسلم فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی فیصلہ کو اس کا اعلان کئے جانے کے بعد بھی بدلا جا سکتا ہے اگر زیادہ درست اور منصفانہ

فیصلہ سامنے آئے۔ البتہ فیصلہ میں یہ تبدیلی وہی جج کرے گا جس نے اس معاملہ میں پہلا فیصلہ دیا ہو یا پھر اس سے اوپر کا کوئی بااختیار شخص جیسے خلیفہ یا کوئی بالائی عدالت جو ناانصافی کی شکایات کا ازالہ کرتی ہو، جس کا سربراہ دارالحکومت میں یا تو خود خلیفہ ہوتا ہے، یا اس کا نامزد کردہ کوئی وزیر، جب کہ صوبائی گورنر صوبائی عدالتوں کے نگراں ہوتے ہیں۔ کسی جج کا کوئی فیصلہ اس کے مرتبہ کے کسی جج کے ذریعہ نہیں بدلا جا سکتا کیوں کہ اس سے فیصلہ-------------------متاثر ہوگی جو لوگوں اور ریاست کے فائدے کے لئے بنی رہنی چاہئے، گو کہ کچھ مخصوص حالات میں انصاف کو بنائے رکھنے کے لئے کچھ مثنیات کی اجازت ہو سکتی ہے۔ [دیکھیں القرطبی، ایضاً]۔ فیصلہ کا استحکام جدید قوانین میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عدالتوں کا نظام مراتب جیسا کی جدید عدالتی نظام میں اپیلائی ہوتا ہے، جس کے ذریعہ

قرآن میں ایک اور قصہ بھی بیان ہوا ہے جس میں داؤد علیہ السلام ایک فریق کو سن کر فیصلہ سنا دیا جب کہ دوسرے فریق کو سنا ہی نہیں [۳۸:۲۱ تا ۲۶]، جب کہ دونوں فریقوں اپنی بات کہنے کا برابر سے موقع ملنا چاہئے اور یہ انصاف کے لئے ضروری ہے۔ امام مسلم، بخاری، بن حنبل اور نسائی وغیرہ نے جو روایات نقل کی ہیں ان کے مطابق حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے درمیان دو عورتوں کے درمیان ایک تنازعہ کا فیصلہ کرنے میں بھی اختلاف رائے ہوا جو ایک بچے پر اپنا حق جتاتی تھیں۔ حضرت داؤد ایک عورت کے دلائل سے قائل ہو گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ وہی بچے کی ماں ہے، جب کہ سلیمان علیہ السلام نے عملی ثبوتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی کوشش کی، محض دلائل پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے تجویز دی کہ بچے کے دو ٹکڑے کر دئے جائیں اور دونوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی تھا کہ بچا تو مر جائے گا، اس وجہ سے بچے کی حقیقی ماں چیخ پڑی اور بولی کہ یہ بچہ اسی کو دیدو اور اسے مارو نہیں۔ اس طرح سلیمان علیہ السلام نے یہ جان لیا کہ حقیقی ماں کون ہے اور پھر فیصلہ دیا کہ بچہ اپنی حقیقی ماں کے پاس رہے گا۔ اس طرح حقائق کو جاننے کے لئے قیاس سے کام لینا شریعت میں ثبوت و گواہی کے قانون کے تحت تسلیم کیا گیا جب مضبوط شہادتیں جیسے اقرار جرم یا مدعی کے ذریعہ اعتراف، یا ٹھوس ثبوت فراہم ہونا، یا گواہ موجود نہ ہونا یا فیصلہ کے کافی نہ ہونا۔ مسلم فقہاء نے اپنی تفصیلات میں فیصلہ کے تصوراتی اور عملی اصولوں پر اور فیصلہ سازی کے فن پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے [جیسے الماوردی، آداب القاضی، ابن القیم: الطروق الحاکمیہ؛ ابن فرحان، تبصرات الحکام --وغیرہ]۔

روحانی، اخلاقی اور مادی امور میں باہمی تعامل اور توازن

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا اِنْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا

مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد (یعنی نماز) کے لئے جلدی کرو اور (خرید و) فروخت ترک کر دو اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت بہت یاد کرتے رہو تا کہ نجات پاؤ۔ اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو ادھر بھاگ جاتے ہیں اور تمہیں (کھڑے کا) کھڑا چھوڑ جاتے ہیں کہہ دو کہ جو چیز اللہ کے ہاں ہے وہ تماشے اور سودے سے کہیں بہتر ہے اور

عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ — اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ (۶۲:۹ تا ۱۱)

اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ — تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہے اور اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔ (۶۴:۱۵)

قرآن کا مقصد کا مقصد کسی بھی طرح سے انسان کو اس دنیا سے کاٹ دینا نہیں ہے، کیوں کہ اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اسے اس بات کی ذمہ داری دی ہے کہ وہ دنیا کو اللہ کی ہدایت کے مطابق برتے۔ اللہ کی عبادت و بندگی اس دنیا میں انسان کا مقصد زندگی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں دین دار اور صالح لوگوں کے ایک اور دنیا بنالی جائے۔ جو شخص اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے اور خود کو اللہ کی رضا کا پابند کر لیتا ہے وہ ایسا شخص ہے جو اس دنیا میں اپنا رزق تلاش کرتا ہے اور اپنے ذہن میں آخرت کو رکھتا ہے، اور اس دنیا کو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے برتتا ہے اور اسی کے تحت دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے: ''ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت عطا فرما نا اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔ ۲۰۱۔ یہی لوگ ہیں جن کیلئے ان کے کاموں کا حصہ (یعنی نیک اجر تیار) ہے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والا (اور جلد اجر دینے والا) ہے [۲:۲۰۱ تا ۲۰۲]؛ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا تو اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اللہ کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ اور (تم کو) اسی کے پاس (قبروں سے) نکل کر جانا ہے'' [۶۷:۱۵]

اس طرح ایک اللہ پر اور آخرت کی زندگی پر ایمان مومن کو دوسرے لوگوں سے یا دنیا سے الگ تھلگ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس دنیا میں کام کرتے ہوئے دوسروں کے ساتھ تعلقات کو مضبوط و مستحکم کرتا ہے اور مومن کو خود پسندی، مادہ پرستی، بے بصیرتی اور اندھے پن سے بچاتا ہے۔ اللہ پر اور اللہ کے سامنے انسان کی جواب دہی پر یقین سے انسان کو ایک طویل و عریض اور گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے اور ہو ماضی حال و مستقبل کے بارے میں زیادہ واضح شعور رکھتا ہے۔ انفرادی توازن اور تکبر و مفلوک الحالی کی دو انتہاؤں سے بچنا اس ایمان کے ذریعہ ممکن ہے اور زندگی کے نشیب و فراز میں انسان ایک توازن پر قائم رہتا ہے، جیسے کہ رسول اللہؐ کی ایک حدیث ہے: مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے: وہ زندگی میں ہر طرح سے کامیاب ہے، اور یہ صرف مومن کو ہی حاصل ہے۔ اگر اسے راحت و مسرت حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے اچھا ہے، اور اگر اسے تکلیف یا سختی پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے اچھا ہے'' [مسلم، ابن حنبل] (حدیث کے الفاظ نقل کرنا ہیں)

علاوہ ازیں، زندگی کو برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے نیز زندگی کے مسائل کا سامنا طاقت و ہمت سے کرنے کا جذبہ انسان کے اندر پیدا کر کے اسے زندگی گزارنے کے لئے لائق بنانے کے لئے ایک اللہ اور آخرت پر ایمان انسان کی خوبی و استعداد کے لئے ایک گہری اور مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے: ''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔'' اللہ کی رضا اور ہدایت کے آگے خود کو پیش کر دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ''اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو''؛

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اخلاقیات، راست بازی اور حسن عمل پر کاربند ہونے کا ایک حقیقی اور سنجیدہ عزم کرے۔ یہ ایمان انسان کو ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے ابھارتا ہے باوجود اس کے کہ ''وہ مال کو محبوب رکھتا ہے اور اسے بڑھانا چاہتا ہے''، اپنے عہد اور وعدوں کو پورا کرنے کی ترغیب وتحریک دیتا ہے اور زندگی کے تمام نشیب وفراز کا سامان مضبوط قوت ارادی اور متوازن ذہن کے ساتھ کرنے کی اہلیت پیدا کرتا ہے [۲:۱۷۷]۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان والوں میں سے سب سے بہتر وہ ہے ''جو اس دنیا کے لئے آخرت کو فراموش نہیں کرتا، نہ آخرت کی زندگی کے لئے اس دنیا کی زندگی کو تج دیتا ہے، اور جو دوسروں پر بوجھ بن کر نہیں جیتا'' [خطیب نے اسے اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے]، اور یہ کہ ''اللہ کو سب سے محبوب وہ ہے جو اپنے ماتحتوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہے [زوائد الزہد میں عبداللہ کی روایت جو الجامع الصغیر میں سیوطی نے نقل کی ہے، اور ناصر البانی سے اسے حسن کہا ہے، اور ابن ابی الدنیا اور طبرانی نے الکبیر میں اسے الفاظ میں معمولی سے فرق کے ساتھ اسے نقل کیا ہے]۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کے لئے اللہ سے فضل ومہربانی کی دعا کی ہے ''جو بندہ الٰہی خرید وفروخت اور امانتیں لوٹانے میں نرمی کرتا ہے'' [بخاری، ابن ماجہ]

اس تناظر میں، جمعہ کی نماز کے بارے میں مذکورہ بالا آیات اس دنیا میں سرگرم عمل رہتے ہوئے آخرت کو پیش رکھنے میں توازن بنائے رکھنے پر زور دیتی ہیں۔ ''جب جمعے کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد (یعنی نماز) کے لئے جلدی کرو اور (خرید و) فروخت ترک کر دو اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے'' لیکن جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت بہت یاد کرتے رہو تا کہ تمھیں کامیابی ملے۔ [۶۲:۹ تا ۱۱]۔ نماز بہت لمبے وقت تک نہیں ہوتی، البتہ یہ ایمان کو مضبوط کرتی ہے اور فرد وسماج کو اچھے اعمال کی تربیت دیتی ہے: ''اور نماز کے پابند رہو کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے جانتا ہے'' [۲۹:۴۵]

اس متوازن تعلیم اور طریقے سے مومن کا یہ ایمان بنتا ہے کہ ''مال اور اولاد اس دنیا کی زینت ہیں''، لیکن انسان کو اس آسائش میں اتنا مگن نہ ہو جانا چاہئے کہ وہ اپنی خودغرضی اور مادی عیش وعشرت کے دائرے میں ہی قید ہو کر رہ جائے، جس کی وجہ سے یہ دنیاوی آسائشیں انسان کے حسن عمل اور دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے نیز ایک دوسرے کے کام آنے میں ایک رکاوٹ بن جائیں [۶۴:۱۴؛ نیز دیکھیں ۹:۲۴؛ ۲۳:۵۵؛ ۶۸:۱۳ تا ۱۴؛ ۷۴:۱۱ تا ۱۳]۔ ایک مومن جب اس دنیا کی راحت وآسائش سے محظوظ ہوتا ہے تو اسے اپنی آخری منزل اور نصب العین کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے رویے میں ایک توازن قائم رکھنا چاہئے: ''مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق و) زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے رب کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں'' [۱۸:۴۶]، ''یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور اللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے'' [۳:۱۴]۔ مال و اولاد ''ایک فتنہ (آزمائش) ہیں؛ اور اللہ کے پاس عظیم اجر ہے'' [۶۴:۱۵]۔ آخرت میں ملنے والے اس اجر عظیم سے بھی اور دنیا کے بھی کچھ انعامات سے انسان محروم ہو سکتا ہے اگر وہ اس توازن کو برقرار نہ رکھے اور یا تو یہ اس انتہاء پسندی کی طرف مائل ہو کہ گھر بسانے اور مال کمانے سے بالکل بے نیاز ہو جائے یا اس دوسری انتہاء کی طرف مائل ہو کہ دولت کمانے میں ہی لگا رہے اور اپنے بال بچوں میں ہی مگن ہو اور اپنی خود پسندی و مادہ پرستی کے حصار میں قید ہو کر الگ تھلگ ہو جائے اور غیر متوازن زندگی گزارے [۸:۲۸؛ ۹:۶۹؛ ۱۸:۳۴ تا ۴۰؛ ۱۹:۷۷ تا ۸۸؛ ۲۶:۸۸ تا ۸۹؛ ۳۴:۳۵؛ ۵۷:۱۰؛ ۶۳:۹؛ ۶۸:۱۴؛ ۷۴:۱۲ تا ۱۶؛ ۱۰۴:۲ تا ۳]۔

جرمانے

متعین اور غیر متعین

حدود، قصاص، تعزیر

عام اصول

شریعت کے عام اصول فطری طور سے قانون کے ہر میدان پر عائد ہوتے ہیں جن میں پینل لاء بھی شامل ہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قانون کے بغیر کوئی پابندی کسی پر نہیں لگائی جاسکتی اور قانونی پابندیوں کو نافذ کرنے سے پہلے انہیں لوگوں کے علم میں لانا ضروری ہے۔ یہ اصول پینل لاء میں لازمی ہے: یہ طے کرنا کہ کوئی خاص انسانی عمل ایک جرم ہے اور اس کے ارتکاب کی سزا قانون میں طے کی جائے گی جس کا اعلان عوام میں کیا جائے گا۔ مطلوب اور ممنوع کاموں کی وضاحت ایک اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے تاکہ آدمی ذمہ داری سے کوتاہی برتنے اور ممنوعات کا ارتکاب کرنے سے بچ سکے۔ [۵:۱۱۵]؛ چنانچہ عمومی قانون کے بارے میں معلومات اور تعلیم دینا اور خاص طور سے پینل لاء سے واقف کرانا شریعت کے قانون میں لازم ہے۔ چنانچہ قانون کا نفاذ اسے عوام کے علم لانے کے بعد ہی ہونا چاہئے، اور کسی قسم کا retroaction جائز نہیں ہے، خاص طور سے پینل لاء میں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں اپنی رہنمائی دینے کے بعد ہی اس معاملے میں کسی شخص کو اخلاقی اور قانونی جواب دہی کا پابند کرتا ہے [۲:۵۷۲؛ ۴:۲۲ تا ۲۳؛ ۵:۲۹؛ ۸:۳۸]۔

اسلام ایک دین کی حیثیت سے تعلیم اور قانونی طریقے سماجی اصلاح کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتا ہے، اور تعلیم کو قانون پر مقدم رکھتا ہے۔ اس طرح کسی فرد کے بے علم ہونے، یا سماجی لحاظ سے پریشان ہونے کی وجہ سے اس کی سزا کم کی جاسکتی ہے یا ٹالی جاسکتی ہے۔ قتل کی سزا سے پہلے زندگی اور جان کی قیمت وحرمت کے بارے میں اخلاقی تعلیم ضروری ہے اور ان عوامل کو دور کرنے کے لئے سنجیدہ کوششیں ہونی چاہئیں جو تشدد پر اکسانے اور لوگوں کے درمیان دشمنیاں بھڑکانے کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح زنا یا بدفعلی کے ارتکاب کی سزا سے پہلے لوگوں کو شادی کی اہمیت کے بارے میں تعلیم دینا اور شادی کر کے ساتھ رہنے یا شادی کے بغیر جنسی رشتے قائم کرنے کے فرق کو سمجھانا اور یہ بتانا ضروری ہے کہ شادی کے بغیر جنسی تعلق میں ایک دوسرے کا رفیق حیات بن کر ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنے اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، اور اس میں سکون و اطمینان نہیں ہوتا اور آپسی محبت ومسرت مستقل طور سے حاصل نہیں

ہوتی[۴:۱؛ ۳۰:۲۱]۔

علاوہ ازیں، شادی کرکے انسان گھر بساتا ہے، خاندان بناتا ہے اور اہل وعیال کے ساتھ ایک پرمسرت زندگی گزارتا ہے۔ اس مسرت کو حاصل کرنے کے لئے خاندانوں کو افراد کی شادیاں کرانے کی فکر ہونی چاہئے اور اس میں انہیں تعاون کرنا چاہئے اور حکومت کو اس کے لئے مادی اور اخلاقی مدد فراہم کرنا چاہئے۔ شریعت ان لوگوں کی مدد کے لئے حکومت کو ذمہ دار قرار دیتی ہے جو شادی کرنے کی مذہبی، ذاتی اور سماجی ضرورت کو پورا کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اور مال دار لوگوں نے نوجوانوں کی شادیوں میں مدد کے لئے اوقاف کا نظام بنایا ہے جس طرح انھوں نے صاف پانی، تعلیم، علاج معالجہ اور دیگر بہت سی خدمات کے لئے مستقل وسائل فراہم کرنے کے لئے ایسا کیا ہے۔ اس کے لئے اوقاف کا نظام قائم ہوا ہے جو مال دار لوگوں نے اس کے لئے (Rewrite this paragraph on your own)

چوری کے لئے سزا کا التزام تب کیا جائے جب لوگوں کو کام کرنے کے مواقع فراہم کرکے، مناسب آمدنی کا انتظام کرکے، عوامی خدمات فراہم کرکے اور معذور لوگوں کے لئے سماجی امداد کا انتظام کرکے زندگی کی لازمی ضروریات پوری کی گئی ہوں۔ لوگ جب بھوک مری میں مبتلا ہوئے تو خلیفہ عمرؓ نے چوری کے لئے سزا جاری کرنے کو معطل کردیا تھا اور ان لوگوں کو اس سزا سے بری رکھا جو اپنے مالکوں کے نامناسب رویے کی وجہ سے بھوک سے مجبور ہوکر چوری کرتے۔

اس روشنی میں، یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ شریعت اصلاحات کے لئے سزا جاری کرنے کو اولیت نہیں دیتی، نہ سزا دینے پر میں جلد بازی کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزاؤں کے لئے جو احکامات جاری کئے ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپؐ مدعی کے بری ہوجانے کی خواہش رکھتے تھے بجائے اس کے کہ وہ مجرم ثابت ہو۔ کسی مدعی کا جرم اس طرح سے ثابت کیا جائے کہ وہ بلاشک وشبہ مجرم قرار پائے اور سزا کا مستحق ٹھہرے۔ رسول اللہ کی ایک حدیث بتاتی ہے کہ کسی منصف کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ کسی قصوروار کو بری کرنے میں خطا کرجائے بجائے اس کے کہ کسی بے قصور اور معصوم کو غلطی سے سزا دے بیٹھے، اور منصف کو چاہئے کہ سنگین جرائم کے لئے متعین سنگین سزائیں یعنی حدود جاری کرنے سے جہاں تک ممکن ہو بچے۔ [بہ روایت ابی شیبہ، ترمذی، الحاکم اور البیہقی]۔ قصوروار کو سزا دینے کے بجائے معاف کردینے کی ترغیب دی گئی ہے، یہ معافی اور درگزر کرنا انسان کی اس کے اندرون سے اصلاح کا ایک حقیقی ذریعہ ہوتی ہے[قرآن، ۱۶:۴؛ ۵:۳۳ تا ۳۴، ۳۸ تا ۳۹؛ ۶:۵۴؛ ۱۱۹:۱۶؛ ۲۴:۴ تا ۵]۔ دوسری طرف، مظلوم کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ معاف کردیا کرے[۱۷۸:۲؛ ۲۲:۲۴؛ ۱۴:۶۴]۔

کوئی مجرم انفرادی طور پر ہی ذمہ دار ہوتا ہے، کیوں کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور کسی کو اس کے اپنے قصور کے علاوہ کسی اور کے قصور کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جاسکتا[۵۳:۳۸ تا ۳۹؛ نیز ۶:۱۶۴؛ ۱۷:۱۵؛ ۵۳:۱۸؛ ۳۹:۷]۔ فیصلے کے دن اللہ تعالیٰ ہر فرد کا فرداً فرداً فیصلہ کرے گا[۶:۹۴؛ ۱۹:۸۰، ۹۵]، اور اللہ کا انصاف ہی ایک آئڈیل ہے۔ قرآن کے مطابق، حضرت یوسف علیہ السلام سے جب ان کے سوتیلے بھائیوں نے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے حقیقی بھائی کے بدلے ہم میں سے کسی کو روک لیں تو یوسف علیہ السلام نے ''کہا کہ اللہ کی پناہ اس بات سے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اُس کے سوا کسی اور کو پکڑیں، اگر ہم ایسا کریں گے تو ظالم ہوں گے''[۱۲:۷۹]۔ اگر مدعی کے اندر کوئی نقص ہو یا وہ ذہنی طور سے معذور ہو، یا کسی دباؤ کی وجہ سے وہ قصور کرنے پر مجبور ہوا ہو، تو مدعی کی ذمہ داری ساقط کی جاسکتی ہے یا اسے گھٹایا جاسکتا ہے۔

یوسف علیہ السلام کے قصہ میں حالات کی رعایت ومناسب سے فیصلہ کرنے کی نظیر ملتی ہے:

''اس کے قبیلے میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ سچی اور یوسف جھوٹا۔ اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو یہ جھوٹی اور وہ سچا۔ جب اس کا کرتہ دیکھا (تو) پیچھے سے پھٹا تھا (تب اُس نے زلیخا سے کہا) کہ یہ تمہارا ہی فریب ہے اور کچھ شک نہیں کہ تم عورتوں کے فریب بڑے (بھاری) ہوتے ہیں [۱۲:۲۶ تا ۲۸]۔

شریعت کے دیگر تمام قوانین کی طرح پینل لاء بھی عام اصول اور سمتیں طے کرتا ہے اور کچھ خاص بنیادی معاملوں سے بحث کرتا ہے، جب کہ تفصیلی باتوں کو اور مختلف زمانوں کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق خاص نوعیت طے کرنے کو انسانی صواب دید پر چھوڑ دیتا ہے۔ سامنے آنے والے جرائم کے لئے متعارف کرائے گئے پینل لاء کو شریعت کی اصطلاح میں تعزیر کہا جاتا ہے، جو کہ عربی لفظ ہے جس کا مطلب ہے سزا دینا، ادب سکھانا یا اصلاح کرنا''۔ ایسے معاملوں میں سزا کا تعین قانون سازی سے ہوتا ہے یا عدالت کی صواب دید پر چھوڑ دیا جاتا ہے، اور فیصلہ مختلف سماجوں ور مختلف افراد کے سلسلے میں مختلف زمانوں اور مقامات کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق الگ الگ ہوتا ہے۔

عمداً قتل اور مجروح کرنا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اے مومنو! تمہیں مقتولوں کے بارے میں قصاص (یعنی خون کے بدلے خون) کا حکم دیا جاتا ہے (اس طرح پر کہ) آزاد کے بدلے آزاد (مارا جائے) اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت اور اگر قاتل کو اس کے (مقتول) بھائی (کے قصاص میں) سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (وارث مقتول کو) پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہء خون بہا) کرنا اور (قاتل) کو خوش خوئی کے ساتھ ادا کرنا چاہئیے۔ یہ رب کی طرف سے تمہارے لئے آسانی اور مہربانی ہے۔ جو اس کے بعد زیادتی کرے اُس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور اے اہلِ عقل! (حکمِ) قصاص میں (تمہاری) زندگانی ہے کہ تم (قتل وخونریزی سے) بچو۔

(۲:۱۷۸ تا ۱۷۹)

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کیلئے اُس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۴:۹۳)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲

اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اُس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا اور ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں پھر اس کے بعد بھی ان میں بہت سے لوگ ملک میں حداعتدال سے نکل جاتے ہیں۔ (۳۲:۵)

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵

اور ہم نے ان لوگوں کیلئے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلا ہے لیکن جو شخص بدلا معاف کر دے وہ اس کیلئے کفارہ ہوگا اور جو اللہ کے فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔ (۴۵:۵)

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳

اور جس جاندار کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اُسے قتل نہ کرنا مگر جائز طور پر (یعنی بفتویٰ شریعت) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے، ہم نے اُس کے وارث کو اختیار دیا ہے (کہ ظالم قاتل سے بدلہ لے) تو اس کو چاہیے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے کہ منصور وفتحیاب ہے۔ (۳۳:۱۷)

قدیم سماجوں اور ان کے قوانین میں (مثلاً بابل، آشوری، یونانی، رومی، جرمن قبائل اور اسلام سے پہلے کے عرب قبائل میں)، نیز یہودیوں کے قوانین میں انتقام ایک معروف بات تھی[[Exodus 21:23ff یہ انتقام بعض اوقات اجتماعی طور سے لیا جاتا تھا اور قاتل کے پورے قبیلے کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ قرآن کے مطابق حضرت آدم کے ایک بیٹے کو اس کے بھائی نے قتل کیا تھا[قرآن: ۵:۲۷ تا ۳۱؛ بائبل، جینیسس ۴:۱ تا ۱۶] جس کے حوالے سے تورات میں انسانی جان کی قیمت پر زور دیا گیا تھا اور قتل کرنے کو ایک جرم قرار دیا گیا تھا: ''اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اُس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا[۵:۲۳]۔ قرآن نے کسی شخص کے قتل عمد کے انتقام کو صرف قاتل کی جان لینے تک محدود کیا، قاتل کے علاوہ کسی کی بھی جان لینے

منع کیا۔قرآن کی آیت ۲:۱۷۸ سختی اس بات کو منع کرتی ہے کہ قاتل کے خاندان یا قبیلے کے کسی بھی فرد سے یا قبیلے کے سردار سے انتقام لیا جائے، جب کہ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی غلام نے کسی کا قتل کیا ہے تو غلام کے آقا سے یا اس قبیلے کے کسی آزاد آدمی سے اس کا بدلہ لیا جاتا تھا، چاہے قتل ہونے والا خود بھی ایک غلام ہی رہا ہو۔ مزید برآں، بعض اوقات ایسا ہوتا کہ مظلوم (مقتول) کا قبیلہ اپنے مقتول کے بدلے قاتل قبیلے کے زیادہ افراد کو یا اس کے کسی بڑے آدمی کو قتل کرتا تا کہ اپنی برتری اور قوت کا اظہار کرے۔قرآن نے انتقام کو اس لحاظ سے بھی محدود کیا اور جتنے افراد قتل ہوئے ان کے بدلے اتنے ہی افراد کی جان لینے کا اختیار دیا۔مذکورہ بالا آیت کو سمجھنے کے لئے کہ جس میں غلام کے بدلے غلام کا ہی قصاص لینے کا حکم دیا گیا ہے اور آزاد آدمی کو اس کے بدلے قتل نہ کئے جانے کا حکم ہے یا عورت کے بدلے عورت کا قصاص رکھا گیا اور کوئی مرد جو کسی عورت کا قتل کرے اس سے قصاص نہ لئے جانے کا اشارہ ہے تو اس تعلق سے بہت سے فقہاء نے آیت کے پہلے حصہ میں ذکر کئے گئے اصول سے استدلال کیا ہے: ''تم پر مقتول کا قصاص لینا لازم کیا گیا ہے'' اور جیسا کہ آیت ۵:۴۵ میں کہا گیا ''اور ہم نے ان لوگوں کے لئے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان۔۔۔'' نیز جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں بھی کہا گیا ہے۔

وہ خاص معاملے جن کا اشارہ آیت [۲:۱۷۸] میں کیا گیا ہے محض اس بات پر زور دینے کے لئے ہیں کہ انتقام میں زیادتی جائز نہیں ہے، البتہ اس عام اصول کو نہیں بدلا گیا کہ تمام انسانی جانیں برابر اہمیت رکھتی ہیں اور بدلہ صرف قتل کے مجرم سے لیا جائے گا، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اسی طرح قاتل بھی چاہے جو ہو [دیکھیں القرطبی کی تفسیر جلد ۲]، نیز دیکھیں محمد عبدہ اور رشید رضا کی تفسیر المنار جلد ۲]۔مرد اور عورت کی جان بھی برابر کی اہمیت رکھتی ہے اس بات کو بھی بہت سے مفسرین اور فقہاء نے واضح کیا ہے۔علاوہ ازیں، القرطبی نے لکھا ہے: اس میں (فقہاء کے درمیان) کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قتل کا قصاص صرف حکام کے ذریعے سے ہی لیا جائے گا کیوں کہ وہی قصاص دلانے کے مجاز اور ذمہ دار ہیں اور دیگر سزائیں نافذ کرنے کے بھی جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں یا کسی اور طرح سے طے کی گئی ہیں؛ آیت میں تمام اہل ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے اور چوں کہ وہ کام سب کے سب اجتماعی طریقے سے نہیں کر سکتے اس لئے حکام کو اس کا اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مومنوں کی طرف سے اس ذمہ داری کو پورا کریں اور قصاص و دیگر سزاؤں کو نافذ کریں [جلد ۲، ص۔ ۲۴۵ تا ۲۴۶، قاہرہ]

قرآن احسان کے طور پر معاف کرنے کی تلقین کرتا ہے [۲:۱۷۸] اور اسے ایک رحم اور مروت کی بات قرار دیتا ہے کہ ''یہ اس کے لئے (گناہوں کا) کفارہ ہوگا [۵:۴۵]۔محمد اسد نے بالکل درست بات لکھی ہے کہ ''تورات میں معاف کرنے کی یہ تلقین نہیں ہے [جیسا کہ قرآن کی آیت ۵:۴۵ میں بتایا گیا ہے]، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ صرف قرآن بلکہ حضرت مسیح کی تعلیمات سے بھی اور خاص طور سے خطبہ کوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا تعلیم تورات کی اصل تعلیمات کا حصہ رہی ہے، لیکن جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے [نوٹ نمبر ۶۲، آیت ۵:۴۵ کی تشریح؛ نیز دیکھیں میتھیو ۵:۳۸ تا ۴۰]۔مقتول کے وارثوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ قتل کے مجرم کی جان بخش دیں، جیسا کہ اس آیت [۲:۱۷۸] سے مفسرین اور فقہاء نے نتیجہ نکالا ہے۔

اگر مقتول کے وارث موجود نہ ہوں، یا وارثوں کا کچھ پتہ نہ ہو، تو حکومت معافی اور معاوضہ کا یہ معاملہ انجام دے گی۔اسی طرح، پورا سماج قاتل کو معاف کئے جانے کی اپیل کر سکتا ہے اور جاں بخشی کر کے نسبتاً کم درجے کی سزا دینے کی رائے دے سکتا ہے اور یہ کام ریفرینڈم کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے اور نمائندہ ایوان کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے: ''یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور رحمت ہے''۔ بشری غلطیوں کا خمیازہ مقدمہ بازی اور عدالت کے فیصلوں سے ہوتا ہے، آج کے ہمارے پے چیدہ سماجوں میں، اس صورت میں کہ جب کو

ئی شخص عام حالات میں پہلی بار قتل عمد کا مجرم قرار پائے، سزائے موت کو ٹال دینے کی تاویل کی جاسکتی ہے۔ جرم کے اعادے کی صورت میں سزائے موت کی پابندی کی جاسکتی ہے۔ البتہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اصل بدلہ تو آخرت میں ہی ملے گا: ''اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کیلئے اُس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے''۔ جب قتل اور تشدد کی وارداتیں سنگین حد تک بڑھ جائیں اور خاص طور سے سلسلہ وار قتل یا اجتماعی قتل کا معاملہ ہو تو سزائے موت کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کا عمل بھی لازم ہو جاتا ہے: ''قصاص میں تمھارے لئے زندگی ہے'' [۲:۱۷۹]۔

جان بوجھ کر مجروح کرنے کے معاملے میں کہ جب جسم زخمی ہو جائے یا کسی عضو کو نقصان پہنچے تو زخمی شخص کو تلقین کی گئی ہے کہ انتقام لینے سے درگزر کر دے اور مالی معاوضہ وصول کر لے۔ اور دونوں ہی باتوں کو معاف کر دینا نہایت ہی احسان اور شرافت کی بات ہے جسے قرآن میں بہت بڑے مرتبہ کی بات کہا گیا ہے ''یہ اس کے لئے (سابقہ گناہوں سے) کفارہ بن جائے گا'' [۵:۴۵]۔ یہ تورات میں بیان کی گئی شدید ترین سزاؤں کے مقابلے ایک ترقی پسندانہ قدم ہے .[Exodus 21:23 ff] یہ بھی ایک اہم بات ہوگی زخم کا بدلہ لینے کا ذکر قرآن میں صرف آیت ۵:۴۵ میں کیا گیا ہے اور تورات کے قانون کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ چوں کہ معاف کرنے کی تلقین کی گئی ہے اس لئے یہ صرف زخمی شخص تک ہی محدود نہیں ہونا چاہئے اور اسے پورے سماج تک وسیع کیا جاسکتا ہے جو جو ایسے معاملوں میں انتقام سے باز رہنے کے حق میں اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے، اور اس کے بدلے کچھ دوسری سزا نیز مالی معاوضہ وصول کرنے کی تجویز دے سکتا ہے، اور یہ عمل عوامی استصواب رائے (ریفرینڈم) کے ذریعہ یا نمائندہ ایوان کے فیصلے سے ہوسکتا ہے۔ یہ طریقہ آج کے اسلامی ممالک میں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جدید سیکولر قوانین کی طرح شریعت کا قانون اپنے دفاع میں برحق بنیاد پر کسی کی جان لینے کے لئے سزا نہیں دیتا، کیوں کہ یہ قتل کی ممانعت میں ایک استثنائی صورت ہے: ''الا یہ کہ برحق اور انصاف کی بنیاد پر ہو'' [۱۷:۳۳]۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی جان، مال، خاندان بچانے کے لئے دفاع کرنا چاہئے، اور اگر اس کوشش میں کوئی انسان اپنی جان گنوا دیتا ہے تو وہ شہید ہوگا [بہ روایت ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان]۔

غیر ارادی قتل

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ

اور کسی مومن کو شایاں نہیں کہ مومن کو مار ڈالے مگر بھول کر اور جو بھول کر بھی مومن کو مار ڈالے تو (ایک تو) ایک مسلمان غلام آزاد کر دے اور (دوسرے) مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے ہاں اگر وہ معاف کر دیں (تو اُن کو اختیار ہے) اگر مقتول تمہارے دشمنوں کی جماعت میں سے ہو اور وہ خود مومن ہو تو صرف ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو تو وارثانِ مقتول کو خون بہا دینا اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھے یہ (کفارہ) اللہ کی طرف سے (قبول) توبہ (کیلئے) ہے اور اللہ (سب

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ کچھ) جانتا (اور) بڑی حکمت والا ہے۔ (۹۲:۴)

یہ آیات یہ بتاتی ہیں کہ کسی مومن کے ہاتھوں کسی دوسرے مومن کا قتل صرف اسی صورت میں برداشت کیا جاسکتا ہے کہ اس نے غلطی سے ایسا کیا ہو اور قتل کرنے کا کوئی ارادہ اس کا نہ ہو۔ ایسی صورت میں انتقام لینے کی اجازت نہیں ہے، کیوں کہ قتل کرنے کی منشا سے قتل نہیں کیا گیا۔ اس طرح کے قتل سزا عام حالات میں آیت ۹۲:۴ کے مطابق ایک مومن شخص کو غلامی سے آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا (معاوضہ) ادا کرنا ہے، الا یہ کہ مقتول کے گھر والے احسان اور نیکی کے طور پر خون بہا معاف کر دیں۔ البتہ استثنائی صورت یہ ہے کہ کسی مومن کے ہاتھوں غیر ارادی طور سے کسی ایسے مومن کا قتل ہو جائے جس کا قبیلہ اہل ایمان سے دشمنی رکھتا ہو اور برسر جنگ رہتا ہو۔ اس طرح کی ہلاکت صلح کے دوران فرنٹ لائن پر یا سرحدوں پر اتفاق سے ہوسکتی ہے۔ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ دشمن قبیلے سے تعلق رکھنے والا کوئی مومن آدمی مومنوں کے ملک میں داخل ہو اور اتفاقاً کسی مومن کے ہاتھوں مارا جائے۔ اس صورت میں سزا ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگی، لیکن اگر دشمن قبیلے کو جو کہ برسر جنگ ہو، اس کا خون بہا بھی دیا جائے تو یہ لایعنی بات ہوگی۔ اگر مقتول کسی ایسے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو جس سے مومنوں کی جماعت نے کوئی معاہدہ کر رکھا ہو، چاہے وہ فرد مسلمانوں کے ملک میں آیا ہو یا مستقل طور سے رہائش پزیر ہو، تو سزا وہی ہوگی جو عام حالات میں ہے: ایک مومن غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے گھر والوں کو خون بہا دینا۔ یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو ان کے گروہ کے غیر مسلم شخص کا معاملہ بھی اس گروہ کے کسی مومن فرد کے برابر ہی ہے۔

مندرجہ بالا آیت صاف طور سے بتاتی ہے کہ غلامی میں بندھے کسی انسان کو آزاد کرانا غیر ارادی قتل کے تمام معاملوں میں ایک سزا کے طور پر مقرر کیا گیا ہے کیوں کہ غلامی کو بتدریج ختم کرنا اسلام کی اصلاحات کا ایک حصہ تھا۔ یہ اصلاحی منصوبہ انسانی آزادی اور انسانی مساوات کے اصول دیتا ہے، غلامی کے اسباب کی روک تھام کرتا ہے، غلامی کی حالت میں جی رہے افراد کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور زندگی و کام کے تمام میدانوں میں ان کے حقوق محفوظ کرتا ہے، اور انہیں لازمی یا رضا کارانہ طور سے آزاد کرنے کے لئے ضابطے دیتا ہے۔ مشہور مفسر قرآن النصفی [م۔ ۵۳۷ھ بمطابق ۱۱۴۲ء]، نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ کسی انسان کو غلامی سے آزاد کرانا ہی کسی دوسرے انسان کے قتل کی تلافی کا طریقہ ہے، کیوں کہ کسی غلام انسان کو آزاد کرانے کا مطلب ایک انسان کو نئی زندگی دینا ہے [تفسیر آیت ۹۲:۴]۔ چوں کہ غلطی سے بھی کسی انسان کا قتل ہو جائے تو بھی اس کی زندگی نہیں لوٹائی جاسکتی اس لئے کسی دوسرے ایسے انسان کو جو ایک آزاد زندگی کی نعمت سے محروم ہو ایک حقیقی زندگی دینے کو ممکن بنایا گیا۔ النصفی نے غلام کو موت کے برابر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ غلامی کا تعلق ایسے سماج ہے جہاں حق کو چھپانا ایک عام بات ہو یعنی ''کفر کا غلبہ'' ہو، اور اس ناانصافی کی وجہ سے ایسا سماج واقعتاً مردہ ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن نے اشارہ کیا ہے [۶:۱۲۲؛ ۸:۲۴]۔ اس طرح غلامی مسلمانوں کو ماقبل اسلام کے زمانے سے وراثت میں ملی، اور اسلام نے اس بات پر زور دیا کہ غلامی کا چلن اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے، اور اس کے خاتمے کے لئے ایک جامع منصوبہ اختیار کیا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس منصوبے کو ٹھیک سے نہیں سمجھا اور نہ اپنے اقتدار کے زمانے میں اسے مکمل کیا، اور انھوں نے دوسروں کے ثقافتی اور سماجی طریقوں کی پیروی کی جو ان سے پہلے گزر چکے تھے یا ان کے زمانے میں موجود تھے۔

طاقت کے زور پر غنڈہ گردی، ڈکیتی، سلسلہ وار قتل، لوٹ مار

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾

جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں یہ تو دنیا میں اُن کی رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کیلئے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔ ہاں جن لوگوں نے اس سے پیشتر کہ تمہارے قابو آ جائیں توبہ کر لی تو جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۵:۳۳ تا ۳۴)

ان آیات میں جو سخت سزائیں بیان کی گئی ہیں انہیں پڑھتے ہوئے کچھ بنیادی حقیقتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عرب کے جو سماجی و تاریخی حالات تھے ہم انہیں یاد کریں، اور خاص طور سے ان مخصوص موقعوں و معاملوں کو جن کے حوالے سے یہ آیات نازل ہوئیں۔ جہاں عرب کے کچھ شہروں یا قصبوں جیسے مکہ، مدینہ (یثرب) اور طائف وغیرہ میں کچھ قبائل باقاعدہ آباد تھے وہیں صحرا میں بھٹکتے رہنے والے کچھ خانہ بدوش گروہ بھی موجود تھے جو آنے جانے والے قافلوں پر حملے کرتے تھے اور ان کے مال و اسباب لوٹ کر اپنی زندگی گزارتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ کو بتایا کہ وہ بھی آپ پر ایمان لے آئے ہیں اور مسلمان ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ٹھہرایا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا، نیز ان کی دوا علاج کا انتظام کیا کیوں کہ وہ ماحول بدل جانے کی وجہ سے بیمار پڑ گئے تھے، اور انہیں کچھ اونٹنیاں دیں تا کہ ان کا دودھ حاصل کریں۔ جب وہ صحت مند ہو گئے تو انھوں نے اونٹنیوں کے رکھوالوں کو مار ڈالا اور اونٹنیاں اپنے ساتھ بھگا کر لے گئے [بہ روایت بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ]۔ ایسے اجڈ گروہوں کو جو نظم و قانون سے آزاد تھے قبو کرنا ضروری تھا تا کہ وہ نظم و قانون کے پابند بنیں اور امن و امان کا نظام قائم ہو۔ چنانچہ لاقانونیت میں مبتلا ایسے گروہوں کے لئے یہ سزائیں طے کی گئیں جو اپنی تعداد، ہتھیاروں اپنی جائے وقوع کو لوٹ مار، فساد، قتل و غارت گری کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ حکم مسلح باغی گروہوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو ''مارو اور بھاگو'' کی حکمت عملی سے کام کرتے ہیں۔

ان آیات میں جو سزائیں بیان ہوئی ہیں ان میں قتل کر دینے، سولی پر چڑھا دینے، ہاتھ اور پاؤں کاٹ ڈالنے، کسی اور علاقے میں بھیج دینے یا بعض تشریحات کے مطابق جیل میں ڈال دینے تک کی سزائیں ہیں۔ مقننہ یا عدلیہ کے ذمہ داران ان متبادل طریقوں میں کوئی بھی مناسب طریقہ صورت حال کی نوعیت کے مطابق اختیار کر سکتے ہیں۔ فقہاء یہ شرط لگاتے ہیں کہ ان فسادی گروہوں پر حملہ کرنے سے پہلے انہیں انہیں متنبہ کرنا ضروری ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کوئی بھی جرم فیصلہ کن واقعہ سے ثابت ہونا چاہئے جس میں کوئی شک و شبہ نہ ہو، اور مجرم یا مجرموں کی گرفتاری اور حراست و تحقیق و تفتیش کے دوران ان سے سلوک اور عدالت میں ان پر مقدمہ چلانے جیسی

تمام وہ لوازمات جو انصاف کا تقاضہ ہیں اور انصاف کے عمل کے لئے لازم ہیں انہیں پورا کرنا چاہئے۔ جب آزادانہ اور منصفانہ طریقے سے مقدمہ فیصل ہونے کے بعد سزا طے کی جائے تو اس سزا کو انسانی طریقے سے عمل میں لایا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے ہر عمل میں احسن طریقہ اختیار کرنا لازم کیا ہے؛ جب تم ذبح کرو تو ذبح بھی احسن طریقے سے کرو۔۔۔'' [مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ] (حدیث کے الفاظ نقل کرنا ہیں)۔ ٹارچر کرنا (اذیت دینا) منع ہے، اور کوئی سزا دیتے وقت کم سے کم تکلیف ہو یہ یقینی بنانا ضروری ہے۔ مدعی کے مرتبہ اور حالات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے، اور مبینہ مجرمانہ عمل کی پوری نوعیت کو بھی سمجھنا چاہئے [دیکھیں القرطبی کی تفسیر، جلد ۶، برائے آیت ۵: ۳۳، ۳۴؛ محمد عبدہ و رشید رضا کی تفسیر المنار، جلد ۶، برائے آیت ہذا]۔ البتہ، یہ آیات اپنے اسلوب اور شان نزول کے اعتبار سے جنگ جیسے معاملہ سے متعلق معلوم ہوتی ہیں نا کہ کسی مجرمانہ واردات کے تعلق سے جو پینل لاء میں ڈیفائن اور سینکشن کئے گئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ مفسرین اور فقہاء نے اسے دوسرے انداز سے سمجھا ہے۔ اگر اسے جنگ کی حالت سے متعلق مانا جائے تو قتل کرنا، ہاتھ پاؤں کاٹنا، اور در بہ در کر دینا وغیرہ کو فوجی حملے یا جنگ کے واقعاتی نتائج کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

بہر حال، یہ آیات ایک قانونی اصول دیتی ہیں جو شریعت کے اخلاقی مقصد پر زور دیتا ہے جو کہ محض قانونی پہلوؤں سے آگے کی بات ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں اللہ اور رسول کے خلاف جنگ چھیڑنے اور زمین میں فساد پھیلانے کی بات کہی گئی ہے انہیں بھی معاف کیا جا سکتا ہے اگر وہ واقعتا توبہ کریں اور ظلم سے باز آجانا ثابت ہو، اس سے پہلے کہ وہ ''مغلوب'' ہو جائیں۔ مشہور فقیہ ابن القیم اسے ایک عام قانونی اصول مانتے ہیں اور اسے کسی خاص جرم تک محدود نہیں مانتے [علم الموقعین، جلد ۲، ص۔ ۸ ۴ تا ۴۹، قاہرہ]۔ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی معقول سبب موجود ہو تو سزا کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ کسی قصوروار کو بری کر دینے میں غلطی ہو جانا اس بات سے بہتر ہے کہ کسی بے قصور کو غلطی سے سزا دی جائے [بہ روایت ابن ابی شیبہ، ترمذی، الحاکم، البیہقی، سیوطی نے اسے مستند (صحیح) مانا ہے]۔

خودکشی

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۱۹۵:۲)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۲۹﴾

مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔ (۲۹:۴)

ان آیات میں جمع کا صیغہ استعمال کر کے مجموعی طور سے پورے سماج کو مخاطب کیا گیا ہے، اس لئے ان آیات کو پورے سماج کے

لئے ایک تنبیہ سمجھا جاسکتا ہے جو اسے خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کرنے اور خود کو ہلاک کرنے کے خلاف کی گئی، اور اپنے ہاتھوں خود اپنی ہلاکت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ سماج کے افراد خود غرضی اور خود پسندی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے تئیں یا پورے سماج کی فلاح و بہبود کے تئیں اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ تاہم ان آیات کو، اور خاص طور سے آخری آیت کو انفرادی خودکشی کی ممانعت کے معنیٰ میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ ایک اللہ پر ایمان رکھنے والے فرد کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ نے ہی زندگی بخشی ہے، اور یہ عقیدہ مومن سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز کا سامنا ہمت و حوصلے سے کرے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان مومن کو راحت و آسائش کی حالت میں اللہ کی شکرگزاری پر ابھارتا ہے اور ناموافق حالات میں صبر پر قائم رہنے کا جذبہ دیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بھی ہے جو امام مسلم، امام ابن حنبل نے نقل کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی طرح سے خودکشی کرنے کو سختی سے منع کیا ہے، اور خود کو خنجر مار لینے یا زہر کھا لینے کی بات کو ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے [بہ روایت بخاری و مسلم]۔

خودکشی کرنا اللہ پر ایمان کے خلاف ہونے کے علاوہ سماجی فلاح و بہبود کے بھی خلاف ہے۔ ہر فرد سماج سے وابستہ ہوتا ہے اور سماج سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے، کیوں کہ وہ سماج میں ہی پروان چڑھتا ہے اور سماج کے وسائل سے فیضیاب ہوتا ہے۔ بچوں کی پرورش و پرداخت میں گھر والے دوسرے افراد، دوسرے خاندانوں سے، اور پورے سماج سے مختلف قسم کی مدد حاصل کرتے ہیں اور خود نظام ریاست اس کا نگراں ہوتا ہے۔ فرد تعلیم اور روزگار کے حصول میں دوسروں سے مدد لیتا ہے یا باہمی مفاد کے معاملے کرتا ہے۔ چنانچہ، کسی فرد کا اپنی زندگی پر مطلق حق جتانا برحق بات نہیں ہے۔ یہ سماج کا حق اور ذمہ داری ہے کہ فرد کی زندگی کی حفاظت کرے اور صحت و سلامتی کا ذریعہ بنے۔

خودکشی کرنے کا رجحان ایک نفسیاتی عدم توازن اور غیر صحت مندانہ ذہن کا غماز ہوتا ہے، اور اس طرح افراد کے انسانی حقوق اور اس کے سماجی تحفظ میں سماج کی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے۔ فرد کو ہمیشہ یہ ذہن میں رکھنا چاہئے جو کوئی بھی خودکشی کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس کی اپنی نفسیاتی اور ذہنی حالت پر منحصر ہوتی ہے، اور کسی بھی قسم کا دباؤ یا کمزوری جس میں وہ فرد مبتلا ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فرد کے دل و دماغ کی گہرائی میں کیا ہے، اور وہی ہے جو اس شدید حالت کو سمجھ سکتا ہے اور یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا ہے۔

قتل اولاد

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اسی طرح بہت سے مشرکوں کو اُن کے شریکوں نے اُن کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے تاکہ انہیں ہلاکت میں ڈال دیں اور اُن کے دین کو اُن پر خلط ملط کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ تو ان کو چھوڑ دو کہ وہ جانیں اور اُن کا جھوٹ۔ (۶:۱۳۷)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

جن لوگوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے بے سمجھی سے قتل کیا اور اللہ پر افتراء کر کے اُس کی عطا فرمائی ہوئی روزی کو حرام ٹھہرایا وہ گھاٹے میں پڑ گئے بلاشبہ وہ گمراہ ہیں اور ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔ (۶:۱۴۰)

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

کہہ دو کہ (لوگو!) آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں (اُن کی نسبت اُس نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے) کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ بنانا اور ماں باپ سے (بدسلوکی نہ کرنا بلکہ) سلوک کرتے رہنا اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ تمہیں اور انہیں ہم ہی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ اُن کے پاس نہ جانا اور کسی جان (والے) کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا مگر جائز طور پر (یعنی جس کا شریعت حکم دے) ان باتوں کا وہ تمہیں ارشاد فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (۶:۱۵۱)

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

جب اُن میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اُس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے۔ اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے اور خبرِ بد سے (جو وہ سنتا ہے) لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے؟ دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بُری ہے۔ (۱۶:۵۸ تا ۵۹)

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا (کیونکہ) اُن کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں کچھ شک نہیں کہ اُن کا مار ڈالنا بڑا گناہ ہے۔ (۱۷:۳۱)

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾

اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟ (۸۱:۸ تا ۹)

انسانی زندگی، چاہے وہ مرد کی ہو یا عورت کی، بچے کی ہو یا بڑے کی، اسے اللہ نے محفوظ کیا ہے اور اور اللہ کے قانون میں اس کی حفاظت کا بندوبست ہے۔ اسلام سے پہلے کے عرب میں اولاد کو معاشی تنگی کے خیال سے یا سماجی خرافات کے دباؤ میں قتل کر دینے کا چلن تھا حالانکہ یہ کوئی عام رویہ نہیں تھا۔ ایسے پدر بردار سماج میں قبیلے یا خاندان کا سربراہ مرد مطلق العنان ہوتا تھا اور گھر کی عورتوں و بچوں پر اس کے اختیار کو کوئی چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لڑکوں کو دیوی دیوتاؤں کے نام پر قربان کر دینا روا تھا [دیکھیں الزمخشری کی تفسیر جلد ۱، بابت آیت ۶:۱۳۷]، اور لڑکیوں کو بعض اوقات زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ قرآن نے ان ظالمانہ اعمال کی شدید مذمت کی اور انسانی زندگی کی حرمت پر زور دیا اور خاص طور سے بچوں کو قتل کرنے کو سختی سے روکا [۶:۱۵۱؛ ۱۷:۳۱، ۳۳]۔ حرام کاری اور زنا کے نتیجے میں بچوں کو اس طرح سے قتل کرنے کی نوبت آتی تھی کیوں کہ ناجائز جنسی تعلقات سے پیدا ہونے والی بچے کو عورت یا مرد یا دونوں مل ختم کر دینے پر آمادہ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بدکاری شوہر یا بیوی یا ناجائز عشق میں مبتلا عاشق یا معشوق میں سے بھی کسی کے قتل کا سبب بنتی ہے۔ اس طرح یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زنا اور حرام کاری پر روک لگانے والی آیت بچوں کے قتل اور قتل کے عام معاملوں کی ممانعت کے درمیان میں آئی ہے [۱۷:۳۱ تا ۳۳]۔

اس زمانے میں چوں کہ نہ تو لڑکیوں کو تو جنگ میں حصہ لینے لائق سمجھا جاتا تھا نہ ان سے کوئی معاشی فائدہ تھا، جب کہ دوسری طرف وہ جنگ میں دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتی تھیں ان سب کے پیش نظر لڑکیوں کی پیدائش ایک عار سمجھی جاتی تھی اور بیٹی باپ کے لئے ایک ڈراونا خواب بن جاتی تھیں [۱۶:۵۹]، اور بعض لوگ اپنی بیٹیوں سے جلد سے جلد پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تھے [۸۱:۸ تا ۹]۔ البتہ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس معاشرے میں کچھ معقول اور رحم دل لوگ ایسے بھی تھے جن کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ وہ قبل از اسلام کے ان قبیح کی مخالفت کرتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے زید ابن عمرو ابن نوفل جو حضرت عمر بن خطابؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ یہ زید توحید کی طرف مائل تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ [بہ روایت: البخاری، دیکھیں ابن حجر کی شرح فتح الباری، جلد ۱۴، باب فضائل اصحاب النبیؐ، حدیث نمبر ۳۸۲۸، ص۔ ۳۰۱، قاہرہ، ۱۹۷۸]؛ اور ساعدہ ابن ابن نجیہ التمیمی، شاعر الفرازدق کے دادا، جو بچوں کو زندہ درگور کرنے سے بچا لیا کرتے تھے اور جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی اور اسلام کو اپنایا [خیر الدین الزرکلی، العالم، جلد ۳، ص۔ ۲۰۵، بیروت ۱۹۸۰]۔

یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ قتل اولاد یا قتل جنین کا یہ قبیح چلن آج بھی کچھ انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں موجود ہے اور کچھ ترقی پزیر ملکوں میں بھی ہے اور اب اس کے لئے جنین کی جانچ کرنے والی تکنالوجی بھی استعمال میں آ رہی ہے اور اسکیننگ کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے کہ جنین مردانہ ہے یا نسوانی۔ نسوانی یعنی عورت کا جنین ہونے پر حمل ساقط کر دیا جاتا ہے۔

چوری

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ

اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت اُن کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ اُن کے فعلوں کی سزا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور جو شخص گناہ کے بعد توبہ کر لے اور نیکوکار ہو جائے تو اللہ اس کو معاف کر دے گا کچھ شک نہیں کہ اللہ بخشنے والا

عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۹ مہربان ہے۔ (۵:۳۸تا۳۹)

القرطبی اور دوسرے فقہی اور تاریخی ذرائع کے مطابق چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ ڈالنا عرب میں اسلام کے پہلے سے ہی رائج تھا[القرطبی کی تفسیر بابت آیت ۵:۳۸]۔اسلامی قانون میں سزاؤں کا نظام جرم کی سنگینی کا احساس دلانے کے لئے ایک نفسیاتی حربے کے طور پر ہے،لیکن اسلام نے انہیں جامع سماجی اور قانونی ڈھانچے کے اندر جو تمام پہلوؤں سے انصاف کو قائم کرنے والا ہو صحیح تناظر میں رکھتا ہے۔ ہر فرد کے لئے چاہے وہ مرد ہو یا عورت،مسلمان یا غیر مسلم،زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا نظم ہے،اور اس کے لئے انہیں قانون اور حکومت وانتظامیہ کی نگرانی میں مناسب شرطوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے یا ان لوگوں کے لئے جو بے روزگار ہوں یا کسی سبب سے کام کرنے سے معذور ہوں چاہے یہ معذوری عارضی ہو یا عمر درازی وجسمانی یا عقلی نااہلی کی وجہ سے مستقل نوعیت کی ہو،زکوۃ کے مال سے اور عوامی خزانے کے دوسرے ذرائع سے ان کی یہ بنیادی ضروریات زندگی پوری کی جاتی ہیں۔اس طرح کے بہبودی انتظامات اور سماجی انصاف کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی یا عوامی ملکیت والی جائدادوں واثاثوں پر ہاتھ صاف کرنے کو گوارا نہیں کیا جاسکتا،اور جو کوئی بھی ایسا سوچتا ہے،یا ایسی کوئی کوشش کرتا ہے اسے سختی کے ساتھ اس سے روکنا اور سزا دینا لازمی ہوتا ہے۔

اس تناظر میں ہاتھ کاٹنے جیسی ہولناک سزا کے حکم کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔قانونی لحاظ سے حقوق اور ذمہ داریوں میں توازن ہے اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔چنانچہ کسی ذمہ داری کو جس میں سزا دینا بھی شامل ہے متعلقہ حق یا حقوق سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔اگر سماج جس کی نمائندگی حکومت کرتی ہے قدرتی آفات کے موقع پر یا اپنی کوتاہی کی وجہ سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہتا ہے تو وہ ایسی سزا دینے کا حق کھو دیتا ہے،اور مدعی کو سماج یا حکومت کی اس ناکامی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے یہ ثابت کرکے کہ اس نے جو چوری کی وہ اس کی مجبور تھی اور اس نے ضرورت سے تنگ آکر یہ قدم اٹھایا۔امیر المومنین حضرت عمرؓ نے قحط سالی کے زمانے میں یہ سزا جاری نہیں کی اور نہ انھوں نے ایک ایسے غلام کے معاملے میں اس سزا کو نافذ کیا جس کا مالک اس کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں کرتا تھا اور غلام مجبور ہوکر اس کا مال چرالیتا تھا[بحوالہ موطا امام مالکؒ]۔

اسلامی نظام انصاف ہر آدمی کے لئے انسانی وقار کے لوازمات کو برقرار رکھنے کے لئے ہے،چاہے وہ مرد ہو یا عورت،بچہ ہو یا بڑا [۱۷:۷۰]۔بزرگوں،معذوروں اور مالی مشکلات میں مبتلا لوگوں کو(جن میں اس وقت زیادہ تر لوگ غیر مسلم تھے) سماجی تحفظ فراہم کرنے میں اسلامی حکومت کی ذمہ داری کو بیان کرتے ہوئے معروف فقیہ امام ابو یوسف نے امیر المومنین حضرت عمرؓ اور سپہ سالار خالد بن ولید کی نظیریں پیش کی ہیں[الخراج،ص ۵۰ تا ۱۳۶،۱۵۵ تا ۱۵۶؛ قاہرہ ۱۳۹۷ ہجری]۔حضرت عمرؓ نے ایک بار ایک ضرورت مند یہودی کو دیکھا اور فوری حکم دیا کہ ان کی مدد بیت المال سے کی جائے۔

مزید برآں،ہر چور کو سزا اس کا ہاتھ کاٹ کر نہیں دی جاسکتی۔ہاتھ کاٹنے کی سزا کے لئے چرائی گئی چیز کی اہمیت اور قدر کا طے ہونا بھی ضروری ہے۔اس کے علاوہ یہ کہ چرائی گئی چیز کسی محفوظ جگہ پر حفاظت سے اس طرح رکھی گئی ہو کہ اس کا چرالے جینا کوئی آسان کام نہ ہو

بلکہ ایک منصوبہ بند چوری ہو اور ایسی واردات ہو جو شک وشبہ سے بالاتر بالکل واضح ہو۔ کسی چیز تک آسانی سے رسائی اگر ہوتی ہو تو یہ بات حکام کو اس بات سے روکتی ہے کہ وہ اسے چرانے والے پر ہاتھ کاٹنے کی حد جاری کریں۔ اکثر فقہاء کی رائے میں جیب کترنے یا دھوکہ وغبن کرنے جیسے جرائم پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ دراصل ہاتھ کاٹنے کی سزا جاری کرنے کے لئے چوری کی نوعیت ایسی ہونا ضروری ہے جس میں عوامی نظم وقانون اور امن تباہ ہوتا ہو اور افراد کی سلامتی وتحفظ کے نظام کو نقصان پہنچایا گیا ہو۔

چوری کے معاملوں میں عام قانونی اصولوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ ملزم کو پورے قانونی حقوق ملنا چاہئیں اور تفتیش، اعتراف اور مقدمہ کے دوران اس کے تمام حقوق کی حفاظت ہونی چاہئے۔ بہت سے فقہاء نے اس پر زور دیا ہے کہ ملزم کے اعتراف کرنے کی صورت میں اسے اعتراف کے اعادے کا موقع دینا چاہئے اور اسے اس بات کا بھی واقعتا موقع ملنا چاہئے کہ وہ اگر الزام کو تسلیم نہیں کرتا تو اس الزام سے کھل کر انکار کر سکے، چاہے ابتداء میں یا بعد میں کسی مرحلے پر۔ [دیکھیں الشوکانی، نیل الاوطار، جلد ۷، ص۔ ۳۰۸ تا ۹، بیروت ۱۹۷۳]۔ کچھ جدید فقہاء کا خیال ہے کہ چوری کی سزا کو recidivism کے معاملوں تک محدود رکھنا چاہئے۔ حدیث رسولؐ کے مطابق کسی قصوروار کو بری کر دینے میں فیصلے کی غلطی اس بات سے بہتر ہے کہ کسی بے قصور کو سزا دینے کا غلط فیصلہ صادر ہو جائے [بروایت ابن ابی شیبہ، ترمذی، الحاکم، البیہقی، حدیث صحیح]۔ کسی ملزم کو اعتراف جرم پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اعتراف جرم کرنے کے لئے اس پر کوئی جسمانی یا اخلاقی جبر نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ رسول اللہ نے تعلیم دی ہے [حدیث بروایت ابوداؤد، النسائی]۔

تحقیق وتفتیش کرنا، مقدمہ چلانا اور سزا دینا ریاست اور اس کے حکام کا حق اور ذمہ داری ہے، اور جس شخص کی چیز چرائی گئی ہے اسے اس کی سزا دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر چرائی گئی چیز مالک کو واپس نہیں کی جا سکتی تو اس کا معاوضہ عدالت طے کرے گیا اگر وہ کسی طرح سے ممکن ہو۔ چرائی گئی چیز کا مالک یا تو چور کو معاف کر سکتا ہے یا چرائی گئی چیز خود اس چور کو ہی بخش سکتا ہے، اور ایسا کرنے پر قانونی روک دی جائے گی اگر وہ جاری ہو اور حکام کو اس بات کی اطلاع نہ ہو کہ چور کو معاف کر دیا گیا ہے یا چیز اسے بخش دی گئی ہے [حدیث رسولؐ بہ روایت مالک، ابن حنبل، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، الحاکم]، اور وہ چور دوبارہ ایسی حرکت کرتا ہے تو اسے ہلکی سزا دی جائے گی [ابن رشد، بدایۃ المجتہد، جلد ۲ ص ۳۶۰، بیروت]۔ ابن القیم اور کچھ دوسرے فقہاء بھی چور پر اس ملزم کو معاف کر دینے کے اصول کو عائد کرتے ہیں جو پکڑے جانے سے پہلے سچی توبہ کر لے اور سچی توبہ کا ثبوت فراہم ہو۔ یہ بات بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ جب کسی چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو اس کے بعد اسے عوامی (سرکاری) خرچے پر نقلی ہاتھ لگوانے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بات آج کے حالات میں اس سزا کے تعلق سے نئی بحث کا موقع دیتی ہے۔

حرام کاری اور زنا

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔ (۳۲:۱۷)

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد (جب اُن کی بدکاری ثابت ہوجائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو دُرے مارو اور اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو شریعتِ الٰہی (کے حکم) میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے اور چاہئیے کہ اُن کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو۔ (۲۴:۲ تا ۳)

اسلام جہاں ایک طرف نکاح پر زور دیتا ہے اور فرد، خاندان وسماج کو نکاح منعقد کرنے و نکاح کو آسان بنانے کی ذمہ داری دیتا ہے، وہیں دوسری طرف یہ نکاح کے رشتے کے باہر کسی بھی قسم جنسی رشتے پر قدغن لگاتا ہے اور جنسی بے راہ روی کی طرف لے جانے والے ہر طریقے، عمل و بات کو ممنوع کرتا ہے [۱۷:۳۲]۔ چنانچہ اسلام لباس میں شائستگی اور حیا کا تقاضا کرتا ہے، جسم کے جنسی کشش والے حصوں کی طرف نگاہ کرنے سے منع کرتا ہے [۲۴:۳۰ تا ۳۱؛ ۳۳:۵۹]، اور غیر محرم مرد و عورت کے تنہائی میں ملنے جلنے پر پابندی لگاتا ہے۔ عربی کا لفظ زنا جو قرآن وسنت میں استعمال کیا گیا ہے، وہ ایک مرد اور عورت کے درمیان بغیر نکاحی رشتے کے کسی بھی طرح کے جنسی تعلق کے لئے بولا جاتا ہے، چاہے ان میں سے کوئی ایک یا دونوں شادی شدہ ہوں۔ اس جرم کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کا ہونا لازم ہے جو اس کی گواہی دینے کی پوری ذمہ داری قبول کرتے ہوں اور جو کچھ انھوں نے دیکھا ہو وہ من وعن بیان کریں اور چاروں کے بیان میں کوئی تضاد نہ ہو۔ زنا کے ملزم کی طرف سے اس کا اعتراف کرنے کو پسند نہیں کیا گیا ہے اور اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے، اور اگر وہ اعتراف کرتا ہے تو چار الگ الگ وقتوں میں اس اعتراف کو دوہرائے گا، جیسا کے بعض ذرائع سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس طرح چار گواہیوں کے مترادف ہوگا۔ ملزم کا اعتراف جرم پوری طرح واضح ہوگا کہ اس نے واقعتا کیا عمل انجام دیا، اور اسے یہ بھی اقرار کرنا ہوگا کہ اس نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ کوئی ملزم جرم کا اعتراف کرنے کے بعد سزا کے نفاذ سے پہلے اعتراف سے انکار بھی کرسکتا ہے، یا بعض فقہاء کے نزدیک سزا دیتے وقت بھی ایسا کرسکتا ہے [ابن رشد، بدایۃ المجتہد، جلد ۲ ص ۳۲۸ تا ۳۲۹، بیروت، الشوکانی، نیل الاوطار، جلد ۷، ص۔ ۲۵۹ تا ۲۷۳]۔ جج کو چاہئے کہ وہ ملزم کو اعتراف نہ کرنے کی ترغیب دے اور اسے تاکید کرے کہ وہ قصوروار ہونے سے انکار کردے، کیوں کہ توبہ کے ذریعہ اللہ سے مغفرت چاہنا سزاء کے ذریعہ سے خود کو پاک کرنے سے بہتر ہے [ابن القیم، علم الموقعین، جلد ۲، ص۔ ۴۸ تا ۴۹، قاہرہ؛ ابن رشد، ایضاً، جلد ۲، ص ۳۲۹]۔

اس طرح، جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے، ملزم کو پوری قانونی ذمہ داری ملنا چاہئے اور تفتیش ومقدمہ کے دوران اس کے تمام حقوق کی حفاظت ہونی چاہئے، اور یہ کہ کسی قصوروار کے بری ہونے میں غلطی ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ کسی بے قصور کو مجرم ٹھہرانے میں غلطی ہوجائے۔ حرام کاری اور زنا کے معاملے میں ٹھوس شہادت، جیسے بغیر شادی کے عورت کا حاملہ ہوجانا کی تاویل عصمت دری، دماغی طور سے معذور ہونے، بے ہوشی یا غلطی سے کی جاسکتی ہے [ابن رشد، ایضاً، جلد ۲، ص۔ ۳۲۵ تا ۳۲۹]۔ تمام سزاؤں کی طرح اس کی سزا بھی شریعت کے مطابق ریاست کے حکام (یعنی قاضی یا جج) کریں گے اور وہی نافذ کریں گے۔ کوڑے مارنے کی سزا بہت شدت اور اذیت کے ساتھ نہیں

دی جائے گی، اور یہ پیٹھ پر مارے جائیں گے جیسا کہ بعض فقہاء نے لکھا ہے، سر پر، چہرے پر، جوڑوں پر؛ اور جسم کے دوسرے نازک حصوں پر مارنے سے گریز کیا جائے گا۔ کوڑے مارنے والا پوری طاقت سے کوڑے نہیں مارے گا اور اپنا ہاتھ بہت زیادہ بلند نہیں کرے گا۔ کچھ فقہاء نے کوڑے مارنے کی سزا کے لئے کچھ شرائط تجویز کی ہیں [دیکھیں القرطبی کی تفسیر بابت آیت ۲۴:۲، جلد ۱۲، ص۔ ۱۶۱ تا ۱۶۳، قاہرہ؛ الشوکانی، ایضاً، جلد ۷، ص۔ ۲۸۰ تا ۲۸۵]۔

حرام کاری اور زنا کے معاملے میں شہادت اور سزا میں شریعت کے جو تقاضے ہیں ان سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ایک قانونی بندوبست کا مقصد عملی طور پر سزا کی اذیت دینے سے زیادہ جرم کا نفسیاتی طریقے سے انسداد کرنا اور اس کی سنگینی کو ظاہر کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے زنا کے مقدموں میں جس طرح سے فیصلہ کیا اس سے اور فقہا نے جو تفصیلات مرتب کی ہیں ان کی رو سے یہ پوری طرح واضح ہے کہ جسمانی سزا کی بنسبت اللہ سے توبہ کر کے اپنی نفسیاتی اور روحانی اصلاح کر لینے اور اللہ سے مغفرت طلب کرنے کی زیادہ تلقین کی گئی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی نماز کے بعد حاضر ہوا اور اس نے یہ اقرار کیا کہ اس سے گناہ ہوا ہے جس سے پاک کرنے کے لئے اس پر حد جاری کی جائے، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے کوئی تفصیل نہیں پوچھی بلکہ یہ معلوم کیا کہ ''کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ جب آدمی نے ہاں میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے جو گناہ ہوا ہے اس کے لئے اللہ نے تمھیں معاف کر دیا ہے'' [بہ روایت البخاری]۔

کوڑوں کی سزا کے لئے یہ التزام کہ زنا کے مجرم کو جب کوڑے لگائے جائیں تو کچھ لوگ یہ نظارہ کرنے کے لئے بھی موجود ہوں، جرم کی طرف مائل افراد کے اوپر اخلاقی اور سماجی دباؤ بنانے کا ایک ذریعہ ہے اور اس طرح سے بھی جرم کا انسداد کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پھر جب دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور وہاں سے ہٹ کر دوسرے لوگوں کو بتاتے ہیں تو اس سے بھی جرم کی طرف مائل لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور انسداد جرم میں مدد ملتی ہے۔ القرطبی نے مزید لکھا ہے کہ یہ عوامی نظارہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ نظارہ کرنے والے اہل ایمان سزا پانے والے کے لئے اللہ سے بخشش کی دعا کریں اور اس پر رحم کرنے کی التجا کریں [آیت ۲۴:۲ کی تفسیر، جلد ۱۲، ص۔ ۱۶۷، قاہرہ]۔ چوں کہ اس کی تعیین نہیں کی گئی ہے کہ کتنے افراد نظارہ عبرت کے لئے موجود ہوں اس لئے محمد اسد کا یہ کہنا صحیح ہے کہ چوں کی سزا کی تشہیر ضروری ہے اس لئے اس سزا کو عوامی تماشا بنانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ میڈیا میں اس کا اعلان کر دینا، کچھ رپورٹر خبر نگاری کے لئے موجود ہونا اور کچھ متعلقہ سرکاری عہدیداران کا موقع پر موجود ہونا کافی ہوگا۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرآن میں زنا کی سزا صرف کوڑے مارنا بتائی گئی ہے اور نکاح کے بغیر جنسی تعلق قائم کرنے کے کسی بھی معاملے میں قرآن میں سنگسار کرنے کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے اگرچہ زنا اور اس کی سزا کا ذکر جس آیت میں کیا گیا ہے اس سے پہلے والی آیت میں جہاں سے یہ سورۃ شروع ہوتی ہے یہ صاف اعلان کیا گیا ہے کہ: ''یہ (ایک) سورۃ ہے جس کو ہم نے نازل کیا اور اس (کے احکام) کو فرض کر دیا اور اس میں واضح المطالب آیتیں نازل کیں تا کہ تم یاد رکھو'' [۲۴:۱]۔ یہ سورۃ ہجرت مدینہ کے پانچویں یا چھٹے سال میں نازل ہوئی تھی۔ تو لائق غور سوال یہ ہے کہ حدیث میں جو واقعات نقل ہوئے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے زنا کے خاطیوں کو سنگسار کرنے کی سزا دی تھی، وہ واقعات کیا اس سورۃ کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں؟ کیا ان معاملوں میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے تورات کی تعلیم پر مبنی ہیں، اگر یہ واقعات زنا کے لئے کوڑوں کی سزا کا حکم نازل ہونے سے پہلے پیش آئے، خاص طور سے اگر یہ نوٹ کیا گیا ہو کہ رسول اللہ نے یہودیوں سے تورات میں بیان کی گئی سزا کے متعلق کوئی گفتگو کی تھی اور کچھ یہودی ملزموں پر اس کے مطابق سزا نافذ کی تھی؟ [بحوالہ بخاری، دیکھیں ابن حجر العسقلانی کی شرح فتح الباری، جلد ۲۵

ص ۲۶۳، ۳۱۸ تا ۳۲۴، حدیث نمبر ۶۸۴۱، ۶۹۱۳؛ الشوکانی، ایضاً، جلد ۷، ص۔ ۲۵۶ تا ۲۵۹]۔

بخاری کی روایت ہے کہ صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ ابن ابی عوفہ سے پوچھا گیا: رسول اللہ ﷺ نے سنگساری کی سزا کوڑے مارنے والی سزا سے متعلق آیت کے نزول سے پہلے دی تھی یا بعد میں؟ تو انھوں نے جواب دیا ''میں نہیں جانتا''۔ ابن حجر عسقلانی نے اپنی تشریح میں لکھا ہے کہ یہودی خطا کاروں کے خلاف رسول اللہ نے جو فیصلہ سنایا تو یہ واقعہ تب کا ہے جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اور آپ تورات کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے، جب تک کہ آپ کو اللہ کی طرف سے کسی معاملہ میں کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہودی خطا کاروں کو سنگسار کرنے کی سزا غالباً آیات ۴:۱۵ تا ۱۶ کی رو سے یہ حکم منسوخ ہونے سے پہلے دی تھی۔ تاہم ان حجر لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ زانیوں کو سنگسار کئے جانے کی حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ صحابی رسول حضرت ابو ہریرہؓ نے کیا تھا، جو ہجرت کے بعد ساتویں سال ایمان لائے تھے، اور ابن عباسؓ بھی اس واقعہ کے وقت موجود تھے جو اپنی والدہ کے ساتھ ہجرت کے بعد نویں سال مدینہ آئے تھے، جب کہ کوڑوں کی سزا سے متعلق آیت اور وہ سورۃ جس میں یہ آیت آئی ہے (سورہ نور) غزوہ بنی المصطلق کے بعد اور واقعہ افک (حضرت عائشہؓ پر بہتان لگنے) کے بعد پانچویں یا چھٹی ہجری میں نازل ہوئی تھی [فتح الباری، جلد ۲۵، ص ۲۶۳، ۳۱۷ تا ۳۱۸، حدیث نمبر ۶۸۱۳، ۶۸۴۰]۔ سنگسار کرنے کی سزا کے واقعہ کا بیان حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی (رضی اللہ عنہما) سے بھی منسوب ہے۔

البتہ، حضرت علی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے خوارج اور بعض معتزلہ زنا کے لئے سنگساری کی سزا کو تسلیم نہیں کرتے تھے کیوں کہ یہ قرآن میں بیان کی گئی سزا سے مختلف ہے [الشوکانی، ایضاً، جلد ۷، ص ۲۵۴، الفخر الرازی اور ان کی تفسیر برائے آیت ۲۴:۲]۔ علاوہ ازیں، قرآنی آیت یہ کہتی ہے کہ ایک شادی شدہ غلام عورت کو زنا کے معاملے میں ایک شادی شدہ آزاد عورت کی سزا کے مقابلے آدھی سزا ملے گی [۴:۲۵]، اور سنگساری کی سزا کو تو آدھا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ الازہر کے سابق شیخ الجامعہ محمود شلطوت خوارج کے نظریے کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے غالباً سنگساری سے متعلق حدیث کے بیان کو ایک مستقل و متعین قانون حد نہیں مانا ہے، بلکہ ایک عارضی صواب دیدی قانون یعنی تعزیر کے زمرے میں رکھا ہے [الاسلام، عقیدہ و شریعہ، ص ۲۸۳، ۱۲واں ایڈیشن، قاہرہ، ۱۹۸۳، ص۔ ۲۸۳]۔

آیت ۲۴:۳ جو یہ بتاتی ہے کہ نکاح کے بغیر جنسی تعلق صرف خبیث مرد اور خبیث عورت یا مشرک مرد اور مشرک عورت کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے، اس شخص کے مستقبل میں نکاح سے متعلق قانونی حکم معلوم نہیں ہوتی ہے۔------------------------------

----

میرا خیال ہے، اور جیسا کہ بہت قدیم و جدید مفسرین اور فقہا کا بھی خیال ہے، کہ اس آیت کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ عمل کتنا شرمناک ہے کہ اس کی توقع صرف اسی سے کی جا سکتی ہے جو اپنی ہوس کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہو، اور اس سے جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے، لیکن ایک اللہ پر ایمان رکھنے والے، اس سے ڈرنے والے اور اس کی ہدایت کو تسلیم کرنے والے کسی فرد سے ایسے عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیث مومنوں کو متنبہ کرتی ہے کہ ایمان کی کمزوری یا ایمان نہ ہونے سے وہ اس برائی میں مبتلا ہو سکتے ہیں: ''کوئی شخص اگر زنا کرتا ہے تو وہ اس وقت ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا۔--- (حدیث کے مستند الفاظ نقل کرنا ہیں)۔-----------------------------

جہاں تک اس بچے کی بات ہے جو زنا کے نتیجے میں پیدا ہو تو اس کے بارے میں یہ ہے کہ وہ معصوم ہے، اور کسی بھی دوسرے انسان کی طرح اس کے بھی انسانی و قانونی حقوق ہیں۔ اس کی شہادت قبول کی جائے گی، اور وہ اپنی لیاقت کے مطابق کسی بھی منصب کے لئے مجاز ہوگا۔

معروف فقیہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ ایسا شخص قاضی (جج) بن سکتا ہے اگر وہ اس منصب کی اہلیت و لیاقت رکھتا ہو[ابن حزم، المحلہ، جلد ۹، ص۔ ۵۲۵ تا ۵۲۶ نمبر ۱۸۰۲، قاہرہ]۔

بہتان بازی

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴿۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں کو بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو اُن کو اسی دُرے مارو اور کبھی اُن کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں۔ ہاں جو اُن کے بعد توبہ کر لیں اور (اپنی حالت) سنوار لیں تو اللہ (بھی) بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۴:۴ تا ۵)

چوں کہ قرآن حرام کاری یا زنا کے الزام کو ثابت کرنے کے لئے چار گواہوں کی گواہی کو لازم کرتا ہے جن کے اوپر گواہی دینے کی پوری قانونی ذمہ داری عائد ہوگی اور جنھوں نے عمل جرم کو براہ راست دیکھا ہو اور اسے من وعن بیان کر سکتے ہوں اور چاروں کے بیان میں کوئی تضاد بھی نہ ہو، اس لئے بغیر ثبوت اور گواہی کے محض الزام تراشی سے انسان کے وقار کو جو نقصان پہنچتا ہے اور اسے جو نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے اس سے انسانوں کو بچانے کا نظم کیا گیا ہے۔ بغیر ثبوت کے کسی پر حرام کاری یا زنا کا الزام لگانے سے لوگوں کو روکنے کے لئے قرآن بہتان لگانے پر سخت سزا دینے کا حکم دیتا ہے۔ بعض فقہاء نے بہتان تراشی کو پورے سماج کے حقوق پر دست درازی قرار دیا ہے، اور فقہی اصطلاح میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے دیکھا ہے؛ اگر وہ شخص جس پر بہتان لگایا جائے، بہتان لگانے والے کو معاف کر دے تو بھی اس سے بہتان لگانے والے کے خلاف قانونی کارروائی پر اثر نہیں پڑے گا کیوں کہ اس جرم سے پورے سماج کا نقصان ہوتا ہے ''اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت کی خبر، بدکاری) پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہوگا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے'' [۲۴:۱۹]، ''اور تم اُسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور اللہ کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی'' [۲۴:۱۵]۔ بعض فقہاء نے بہتان تراشی سے فرد کو پہنچنے والے نقصان کو پورے سماج کو پہنچنے والے اجتماعی نقصان سے بھی اوپر مانا ہے، اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس شخص کے خلاف بہتان لگایا جاتا ہے یہ اس کا ہی اختیار ہے کہ چاہے تو بہتان تراشی کرنے والے کو معاف کر دے یا اسے کے خلاف قانونی کارروائی کرے۔ اس معاملہ میں فقہاء کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کی رائے یہ ہے کہ بہتان تراشی فرد کے نجی حق اور سماج کے اجتماعی حق کے درمیان کی ایک صورت ہے، یہ گروہ اوپر کی دونوں رایوں کو ملا کر دیکھتا ہے۔

بہتان تراشی کرنے والوں کو کوڑے مارنے کی جسمانی سزا کے علاوہ ایک اخلاقی اور نفسیاتی سزا بھی دی جاسکتی ہے جو اس کے لئے اور زیادہ سخت ہوگی اور وہ یہ کہ اسے ہمیشہ گواہی کے لئے نااہل قرار دے دیا جائے اور اس کی گواہی کبھی کسی معاملے میں قبول نہ کی جائے۔ البتہ آخری آیت بہتان تراشی کرنے والے کے لئے خود کو درست کرنے کا دروازہ کھولتی ہے اور وہ یہ کہ وہ فرد اپنی غلطی تسلیم کرے اور جس پر اس نے بہتان لگایا اس سے معافی مانگے، اگر ممکن ہو۔ حالانکہ بعض فقہاء توبہ اور اصلاح کے نتیجے کو آخرت میں اللہ کی طرف سے معافی کے

معنیٰ تک محدود سمجھتے ہیں، لیکن اکثر فقہاء کا خیال یہ ہے کہ آیت ۵:۲۴ میں جو معافی دی گئی ہے وہ اس سے پہلی آیت میں کہی گئی تمام باتوں پر عائد ہوتی ہے [دیکھیں القرطبی کی تفسیر برآیت ۵:۲۴، جلد ۱۲، ص۔ ۱۷۹، قاہرہ]۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ زنا، بہتان تراشی، چوری یا شراب نوشی میں ماخوذ شخص کی اگر توبہ واصلاح ثابت ہو تو وہ شہادت کا مجاز بن جاتا ہے اور اس حوالے سے اس کے وہ حقوق بحال ہو جاتے ہیں جو اسے پہلے سے حاصل رہے ہیں [المحلہ، جلد ۹، ۵۲۶، قاعدہ نمبر ۱۸۰۳، قاہرہ]۔

شریعت کے عام قاعدے، جیسے کسی شخص کے خلاف فرد جرم عائد کرنے کے لئے اس کی پوری قانونی ذمہ داری ثابت کرنے کی لازمیت، اور تفتیش ومقدمہ جوئی کے دوران اس کے تمام انسانی اور قانونی حقوق کا تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا، اور سزا کا نفاذ انتہائی مہذب و مناسب طریقے سے کیا جائے گا۔ اس نکتہ کے علاوہ، اگرچہ درج بالا آیات بظاہر ایسے شخص پر منطبق ہوتی ہیں جو کسی عورت پر بغیر ضروری ثبوتوں (چار لوگوں کی گواہی) کے بدکاری کا زنا کا الزام لگائے لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ بہتان لگانے والا چاہے مرد ہو یا عورت، شرط یہ ہے کہ جس پر بہتان لگایا گیا ہو وہ پاکیزہ نفس اور شریف ہو جب کہ جسمانی طور سے زنا کاری کی طاقت رکھتا ہو (یا رکھتی ہو) بغیر اس کے کہ وہ خاص طور سے عورت ہی ہو [ابن رشد، بدایۃ المجتہد، جلد ۲، ص ۳۳۰، بیروت]۔ مذکورہ بالا آیات میں بتائی گئی بہتان تراشی کی سزا قصوروار کو دینے کے باوجود بہتان کا نشانہ بنائے گئے فرد کا یہ حق ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنی شخصیت کو پہنچے نقصان کا ہرجانہ طلب کرے، اگر بہتان تراشی کرنے والا یہ ہرجانہ ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

شوہر کی طرف سے بیوی پر بغیر ثبوت کے بدکاری کا الزام لگانا

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَ الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَ يَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

اور جو لوگ اپنی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود اُن کے سواء اُن کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بیشک وہ سچا ہے۔ اور پانچویں بار یہ (کہے) کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اُس پر اللہ کی لعنت۔ اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بیشک یہ جھوٹا ہے۔ اور پانچویں دفعہ یوں (کہے) کہ اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب (نازل ہو) (۶:۲۴ تا ۹)

اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کاری کا الزام لگائے، لیکن اس کے ثبوت میں خود اپنے علاوہ کسی کو گواہ بنا کر پیش نہ کر سکے، تو یہ اس کے لئے نفسیاتی طور سے بہت ہی مشکل ہوگا کہ اپنے گھر کو ٹھیک رکھ سکے، کیوں کہ گواہ نہ ہونے کی بنا پر اس کی بیوی کو مجرم قرار نہ دیا جا سکے گا، اور شوہر پر بہتان تراشی کا الزام آئے گا جو کہ اس کے لئے بہت ہی غلط ہوگا۔ چنانچہ اوپر کی آیت میں ازدواجی تعلق کو ختم کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ بتایا گیا ہے بجائے اس کے کہ مجرم ثابت کرنے کے لئے کوئی قانونی طریقہ اپنایا جائے اور اس طرح زنا کاری یا بہتان کی کسی سزا سے بچنے کا راستہ دکھایا گیا۔ اگر کوئی شوہر الزام لگائے تو اسے اس کے لئے چار بار قسم کھا کر یعنی اللہ کو گواہ بنا کر یہ کہنا ہوگا کہ وہ اپنے

الزام میں سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہنا ہوگا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس کے جواب میں بیوی اگر اپنا دفاع کرنا چاہے تو اسے بھی چار بار قسم کھا کر یعنی اللہ کو گواہ بنا کر یہ کہنا ہوگا میرا شوہر جھوٹ بول رہا ہے۔ اور پانچویں بار اسے یہ کہنا ہوگا کہ میرے شوہر کا الزام اگر سچا ہے تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس عمل کو لعان کہا جاتا ہے یعنی لعنت کرنے والا عمل، اور اس کے نتیجے میں شوہر و بیوی دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ البتہ بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ اس علیحدگی کے لئے قاضی کے فیصلے کی ضرورت ہوگی، اور یہ بہتر ہوگا کہ یہ پورا معاملہ عدالت میں ہوتا کہ خود قاضی اس عمل کا مشاہدہ کریں اور اس کے قانونی تقاضوں کی تکمیل کو یقینی بنایا جا سکے۔ امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر فقہاء کا خیال ہے کہ لعان کرنے والا شوہر اگر یہ کہے کہ اس نے الزام لگانے میں جلد بازی کی اور وہ بہتان کی سزا کا حق دار ہے تو اس کے بعد وہ پھر سے نکاح کی تجویز دے سکتا ہے، اور عورت فطری طور سے اس تجویز کو مسترد کر سکتی ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ نے جو کچھ کہا ہے وہ محض ایک مفروضہ معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ یہ تصور کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ ایک شخص یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ اس نے اپنی بیوی پر بہتان لگایا ہے، سوکوڑے کھانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دے تاکہ اس کا نکاح بنا رہے۔ اس بات کا احتمال ہمیشہ بنا رہے گا کہ بیوی واپس آنے پر رضامندی کا دکھاوا کرے جب تک کہ شوہر اس کی بے گناہی اور اپنے جھوٹ بولنے کا اقرار نہ کر لے، اور پھر بعد میں منع کر دے۔ قرآن کی آیت مخصوص طور سے بیوی پر شوہر کی طرف سے الزام لگانے کے امکان کو پیش کرتی ہے، کیوں کہ یہ الزام شوہر کی طرف سے اس یقین کی بنیاد سامنے آئے گا کہ ایک بچہ جسے بیوی اس کا بچہ بتا رہی ہے حقیقت میں اس کا بچہ نہیں ہے، اور اس طرح یہ بیوی کی طرف سے شوہر پر زنا کاری کا الزام لگائے جانے کہ بنسبت زیادہ متوقع ہے۔ البتہ اس کے برعکس بیوی کی طرف سے شوہر پر زنا کاری کا الزام لگائے جانے کی صورت میں، جب کہ اس کے پاس کوئی گواہ نہ ہو، یہی حکم عائد ہوگا یہ اجتہاد کا موضوع ہے۔

نشہ خوری یا مدہوشی اور جوا بازی

وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمالِ شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تمہیں (ان کاموں سے) باز رہنا چاہئے۔ اور اللہ کی فرمانبرداری اور رسول (اللہ ﷺ) کی فرمانبرداری کرتے رہو اور ڈرتے رہو اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔ (۵:۹۰ تا ۹۲)

نشہ خوری اور نشہ آور اشیاء کے استعمال پر پابندی کا عمل اس تدریجی عمل کا ایک نمونہ ہے جو اسلامی قانون سازی میں اس وقت اپنایا گیا جب ایک قدیم عادت اور رواج کو بدلنا تھا۔ چوں کہ اسلام سے پہلے کے زمانے میں عربوں کے یہاں شراب نوشی اور جوا بازی عام تھی اس لئے قرآن نے بات یہاں سے شروع کی یہ دونوں کام نقصان دہ ہیں، اگرچہ اس میں کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا نقصان ان کے

فائدے سے زیادہ ہے: ''کہہ دو کہ اُن میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر اُن کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں'' [۲:۲۱۹]۔ اگلے قدم کے طور پر یہ تاکید کی گئی ہے کہ جب نشے کی حالت میں ہو تو نماز مت پڑھو'' تاوقت یہ کہ جو منہ سے کہو اسے سمجھنے لگو'' [۴:۴۳]۔ پھر آخری مرحلے پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں شراب پر مکمل اور واضح طور سے ممانعت لگا دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے شراب پینے پر سزا دی ہے لیکن فقہاء کے درمیان اس معاملہ میں اختلاف رائے ہے کہ سزا محض شراب پینے پر دی گئی یا نشہ میں دھت ہو جانے پر دی گئی۔ اس کے علاوہ اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ اس معاملے میں سزا متعین جرائم کے لئے متعین سزاؤں ''حدود'' میں سے ہے یا یہ صواب دید پر مبنی سزاؤں یعنی تعزیر میں سے ہے [ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد ۲۵، ص۔ ۲۰۱ تا ۲۰۹، حدیث نمبر ۶۷۷۹؛ ابن رشد، بدایۃ المجتہد، جلد ۲، ص۔ ۳۳۲ تا ۳۳۳]، قاہرہ؛ الشوکانی، نیل الاوطار، جلد ۷، ص۔ ۳۱۹ تا ۳۲۰، بیروت ۱۹۷۳]۔ شراب نوشی پر رسول اللہ ﷺ نے جو سزا دی تھی ہور وایات کے مطابق محض پیٹنے کی سزا تھی، کوڑے مارنے کی نہیں، اور نہ ضربوں کی متعین تعداد کا ذکر ہے، نہ کسی خاص چیز سے دی گئی بلکہ ہاتھ سے، چھڑی سے، کپڑے سے یا جوتے سے مارا گیا [بہ روایت بخاری اور ابوداؤد]۔ زمانہ نبوتؐ کے بعد امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ نے چالیس کوڑے لگانے کی سزا دی، اور پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت علیؓ کے مشورے سے یہ سزا بڑھا کر ۸۰ کوڑے کر دی گئی کیوں کہ شراب نوشی زیادہ بڑھ گئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ قصوروار قرار پانے والے شخص کو لعنت ملامت کی جائے کیوں کہ اس طرح کی باتوں سے قصوروار فرد کے اندر مزید اکڑ آجاتی ہے اور وہ نیکی کے رویے سے اور دور چلا جاتا ہے۔ جرم کا ثابت ہونا ضروری ہے اور سزا دینے کا اختیار صرف حکام کو ہے، اور ملزم کے انسانی و قانونی حقوق تفتیش و مقدمہ کے دوران محفوظ رکھے جائیں گے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ مجرم قرار پانے والا شخص اس وقت تک کسی بھی شہادت یا گواہی کے لئے ناقابل اعتبار مانا جاتا ہے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ اس نے توبہ کر لی ہے۔ علاوہ ازیں، قرآن و سنت کی بیان سے اور خلفاء راشدین کی نظیروں سے نیز فقہاء کے بیانات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ نشہ میں بدمست ہو جانا یا نشہ آور اشیا کے استعمال کرنے کو اتنا سنگین بڑا جرم نہیں مانا گیا ہے جتنا دوسرے ان جرائم کو مانا گیا ہے جن کی سزائیں متعین ہیں یعنی حدود میں آتی ہیں، خاص طور سے ابتدائی زمانے میں۔ حضرت علیؓ نے صاف فرمایا ہے کہ اگر شراب نوشی کے جرم میں سزا دینے سے مجرم کی موت ہو جاتی ہے تو یہ موت سے متعلق واحد سزا ہوگی جس پر انہیں ملزم سے ہم دردی ہوگی، اور اس کے گھر والوں کو ایک اتفاقی قتل کا خوں بہا دیا جائے گا [ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد ۲۵، ص۔ ۲۰۰ تا ۲۰۱، حدیث نمبر ۶۷۷۸، قاہرہ ۱۹۷۸؛ الشوکانی، نیل الاوطار، جل ۷، ص۔ ۳۲۰ تا ۳۲۱، بیروت ۱۹۷۳]۔ تاہم، نشہ خوری کی برائی کا جائزہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق لیا جائے گا، اسی لئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں سزا بڑھا دی گئی تھی۔

مذکورہ بالا آیت میں جس چیز کو ممنوع کیا گیا ہے یہ وہ چیز ہے جو آدمی کی دماغی کی کیفیت اور ذہنی لیاقت کو متاثر کرتی ہے، یعنی 'خمر'۔ اس کا مطلب ان تمام چیزوں پر حاوی ہے جن کے استعمال سے انسان نشہ میں مبتلا ہو جائے اور اپنی ہوش کھو بیٹھے، چنانچہ وہ ساری چیزیں جو انسان کے اوپر یہی اثر ڈالتی ہیں اس امتناع کے دائرے میں آجاتی ہیں، جیسے نارکوٹکس وغیرہ۔ لیکن اگر کوئی نشہ آور چیز کسی مخصوص کیمیائی عمل سے گزر کر ایک مختلف شئے میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا اثر وہ نہیں ہوتا تو اس نئی شکل میں وہ جائز ہوتی ہے چاہے اس کی اصل کچھ بھی ہو، جیسے سرکہ جو وائن سے بنتا ہے لیکن تمام فقہاء نے اسے بالاتفاق جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح نشہ آور شے کی ممانعت کا مطلب ہر حال میں یہ نہیں ہے کہ نشہ آور شئے ناپاک ہی ہوگی، بہت سے فقہاء نے اس کے پاک ہونے کو تسلیم کیا ہے [دیکھیں القرطبی کی تفسیر بر آیت ۵:۹۰، جلد ۶،

ص۔ ۲۸۸ تا ۲۸۹، قاہرہ]۔تاہم نشہ آور اشیاء کا کوئی بھی معاملہ کرنا مسلمان کے اوپر حرام ہے (جیسے کہ شراب کے برتن کو استعمال کرنا، شراب یا کسی نشہ آور شئے بنانا، اسے ہاتھ لگانا، اسے ادھر سے ادھر پہنچانا، اس سے متعلق کسی بھی کام میں ملوث ہونا اور اس کی آمدنی وصول کرنا سب ممنوع ہے) [دیکھیں القرطبی، ایضاً، ص ۲۸۹ تا ۲۹۱]۔بعض فقہاء کے خیال میں اسلامی ریاست کے اندر غیر مسلم شراب کے معاملات کرسکتا ہے خاص طور سے تب جب مذہبی رسوم میں اس کا استعمال مطلوب ہو، جیسے عیسائیوں کا مذہبی اجتماع، جس کی اجازت عقیدے کی آزادی کے ضمن میں انہیں حاصل ہوتی ہے [نیز دیکھیں آیات ۵:۹۰ تا ۹۲ کی تشریح ''سول لاء'' کے باب میں]۔

جوا بازی اور تقدیر کا حال بتانا یا معموں سے غیب کا پتہ لگانا یعنی فال کھولنا بھی ان آیات میں منع کیا گیا ہے۔ مال کمانا یا کسی معاملے میں فیصلہ کرنا سنجیدہ اور غور وفکر سے کی جانے والی کوششوں سے ہی ہونا چاہئے نا کہ اٹکل پچو طریقے سے۔ اگر اس طرح کے کسی عمل سے اگر کسی کو کبھی کوئی کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو یہ بات اس شخص کے لئے بھی اور سماج کے لئے بھی کئی اعتبار سے سنگین عقلی اور اخلاقی نقصان کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ یہ اٹکل پچو طریقے اسلام کی اس تعلیم کے خلاف ہیں کہ کسی بھی جائز فائدے کو حاصل کرنے کے لئے اللہ کی بخشی ہوئی توانائی، استعداد اور عقل سے کام لینا چاہئے، قسمت آزمائی کے ٹوٹکوں یا توہمات پر انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ آسانی سے اور بغیر محنت وکوشش کے نفع کمانے پر نظر رکھنا صحیح سوچ کے خلاف ہے اور اس سے کاہلی، بے عملی اور توہم پرستی پیدا ہوتی ہے جس انسان کی قوت عمل اور تخلیقی صلاحیت فنا ہوتی ہے اور اللہ پر نیز اس کی ہدایت پر ایمان جاتا رہتا ہے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ نشہ آور اشیاء کا استعمال اور جوا بازی سے لوگوں کے درمیان دشمنی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ نشہ میں دھت ہوکر انسان تشدد اور بے عقلی کی باتوں پر اتر آتا ہے اور جوے میں ہارنے اور جیتنے کے چکر میں ایک دوسرے سے لڑتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان ان چیزوں کا عادی ہوجاتا ہے اور اپنی دوسری اہم ترین ذمہ داریوں سے، اپنے ایمان اور اس کے تقاضوں سے اور اللہ کی عبادات سے غافل ہوجاتا ہے۔ جوے سے رقم کمانے کو اس لئے جائز نہیں مانا گیا ہے کہ اس میں ہونے والی کمائی کسی مفید اور تخلیقی کام کا صلہ نہیں ہوتی ہے جیسا کہ اسلام چاہتا ہے۔ اس طرح کی اخلاقی اور جسمانی، انفرادی اور سماجی برائیاں فائدوں سے زیادہ نقصان کا موجب ہیں۔ البتہ جوا بازی کے اڈے قائم کرنے یا توہمات سے پیسہ کمانے کے کام کرنے والوں کے لئے کوئی مخصوص سزا طے نہیں کی گئی ہے، اور کوئی بھی مناسب سزا طے کرنا مقننہ یا عدلیہ کی صواب دید پر یعنی تعزیری قوانین پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ مختلف مقامات اور مختلف زمانوں میں بدلے ہوئے حالات کے مطابق اس کی سزائیں طے کی جاتی رہیں۔

استحصال، بدعنوانی، اختیارات کا غلط استعمال، غبن اور دیگر مالی بے ضابطگیاں

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۸

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اُس کو (رشوۃً) حاکموں کے پاس پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو۔ (۲:۱۸۸)

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ ‌ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا ﴿۲۹﴾

مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔ (۲۹:۴)

ان آیات میں مال کے لین دین اور تبادلے کے بارے میں ایک عام اصول دیا گیا ہے تا کہ وہ یہ لین دین اور تبادلہ مناسب، منصفانہ، باہمی لحاظ سے مفید ہو اور سبھی متعلق لوگوں کی رضامندی اس میں شامل ہوتا کہ ناجائز استحصال اور ایک دوسرے کا مال ہڑپنے کو روکا جاسکے۔ کسی بھی طرح کا غلط طریقہ، باہمی رضامندی نہ ہونا اور (یا) استحصال قابل سزا ہے، اور چوں کہ اس میں سول اور کرمنل دونوں طرح کے عنصر شامل ہوتے ہیں اس لئے انہیں دونوں قوانین کے تحت برتا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں، حکومت کے افسران اور شہری افراد یا شہریوں کے گروپ اس میں ملوث ہوتے ہیں، افسران اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر کے شہریوں کو مجبور کرتے ہیں، یا خود شہری افراد یا گروپ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں یا جعل سازی کرتے ہیں، اس لئے اس کا تعلق پینل لاء سے بھی ہوتا ہے، جو پبلک لاء کا حصہ ہے۔ حکومت اور عوام کے درمیان خصوصی تعلق، چاہے وہ مستقل طور سے اور مجبوری میں ہو، اسے نجی تعلقات کی طرح نہیں دیکھا جاسکتا جو کہ معاہدوں یا نجی قوانین سے کنٹرول کئے جاسکتے ہیں، چاہے سول ہوں، یا کمرشیل یا دیگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(نظر ثانی)

چنانچہ کسی عوامی منصب پر بیٹھا کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کوئی ناجائز فائدہ پہنچاتا ہے [جیسے عوامی دولت کو نجی فوائد کے لئے خرچ کرنا]، یا اسے کسی عوامی ذمہ داری سے چھوٹ دے دینا [ملٹری سروس سے، یا ٹیکس کی ادائیگی جیسے معاملوں سے] تو اس شخص کو اس کے بدلے خزانہ عامرہ کو یا دوسرے لوگوں کو نقصان کا ہرجانہ دینا ہوگا تا کہ اس بدعملی کے نقصان کی تلافی ہو، چاہے اس نے اس معاملے سے واقعتاً کوئی فائدہ حاصل کیا ہو نہ کیا ہو۔ مزید برآں اس معاملے کو سماج کے خلاف ایک جرم مانا جائے گا اور اس لئے اسے سزا بھی دی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں ایسے شخص پر لعنت کی گئی ہے جو رشوت دے اور جو رشوت لے اور جو اس معاملے میں دلالی کا کام کرے [بہ روایت ابن حنبل]۔ ووٹ حاصل کرنے کے لئے پیسے دینا اور ووٹ دینے کے لئے پیسے لینا، عوامی خزانے کو چونا لگانا، عوامی سرمائے اور جائیداد یا خدمات کی طرف سے بے پروائی برتنا، اور عوامی یا نجی جگہوں پر قبضے کرنا جیسے معاملے سول پہلو رکھتے ہیں جنہیں ایک ساتھ رکھ کر دیکھنا ہوگا۔ اختیار کا کوئی بھی غلط استعمال، کسی سرکاری افسر، یا کسی فزیشین، انجینئر یا دیگر پروفیشنل کا اپنے گراہک کے ساتھ معاملہ کرنے میں غلط کردار کو بھی اسی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ٹیکس کی چوری یا ٹیکس سے ناجائز طور پر مستثنیٰ کر دینا، کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ اور ان کی مارکیٹنگ، جعلی کرنسی بنانا اور اسے پھیلا دینا، اور دیگر بہت سے غبن وفریب اور نقصان پہنچانے والے کام، سب قابل سزا ہیں، اور ان سے جو بھی نقصان پہنچتا ہے چاہے کسی کو نجی طور سے پہنچے یا عوامی مفاد کو مجموعی طور سے پہنچے اس نقصان کا معاوضہ لیا جائے گا۔

ایسے جرائم کی سزا جن سے دوسرے افراد کو یا پورے سماج کو مالی نقصان پہنچتا ہے قرآن اور سنت میں تاکید سے بیان نہیں کی گئی ہے جب کہ وہ صاف طور سے اور سختی کے ساتھ منع ہیں، لیکن انہیں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ ملکی قوانین کے مطابق اس کا تعین کریں۔ اس طرح کی انسانی کوششوں سے یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں کیا سزا دینا مناسب ہوگا، اور اسلامی قانون (شریعت) کا یہ غیر محدود، لچک دار اور قابل تبدیل حصہ جو کہ انسانی صواب دید کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے اور شریعت کے مقاصد اور

اس کے اصولوں کا پابند ہے، اسے عام طور سے اجتہاد کہا جاتا ہے۔ یہ ان سزاؤں کو طے کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے جو قرآن وسنت میں طے نہیں ہیں اور جنہیں تعزیر کہا جاتا ہے۔ بہت سے فقہاء کے مطابق ان معاملوں میں سزائیں، قرآن وسنت میں مخصوص جرائم کی طے شدہ سزاؤں کے مطابق ہوگی اگر کوئی جرم جس کے لئے نیا قانون بنانے کی ضرورت ہو اس درجہ کا سنگین جرم ہو۔ اس طرح تعزیر مختلف مجرمانہ معاملوں کے لئے مستقل اور قابل تبدیل قانون سازی کا ایک سرچشمہ ہے، اور اسے معمولی جرائم اور معمولی سزاؤں کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ مختلف قسم کے قانونی اور اخلاقی ضابطوں کے خلاف ورزی کا معاملہ یکساں نہیں ہے: اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے۔۔'' [۴:۳۱]؛ ''جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں بیشک تمہارا پروردگار بڑی بخشش والا ہے۔۔۔'' [۵۳:۳۲]۔

جھوٹے بیان اور حلف نامے

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾

یہ (ہمارا حکم ہے) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو اللہ نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے تو یہ اللہ کے نزدیک اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمہارے لئے مویشی حلال کر دیئے گئے ہیں سواء اُن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔ (۲۲:۳۰)

وَ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزرتے ہیں۔ (۲۵:۷۲)

اسلام کی تعلیمات میں ہمیشہ سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے پر بار بار اور شدت سے زور دیا گیا ہے۔ جھوٹ بولنا اللہ پر ایمان نہ ہونے اور اس کا ڈر نہ رکھنے کی علامت ہے: ''اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کیساتھ رہو'' [۹:۱۱۹]؛ ''جھوٹ افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی جھوٹے ہیں'' [۱۶:۱۰۵]۔ رسول اللہ ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ آدمی کو ہمیشہ سچ بولنا چاہئے اور جھوٹ سے بچنا چاہئے، چاہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں کہ سچ بولنے یا جھوٹ بولنے سے ایسے عادت پڑتی ہے جو انسان کے عمل کا حصہ بن جاتی ہے، اور پھر وہی اس کی پہچان بن جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (حدیث کے الفاظ نقل کرنا ہیں)

البتہ ہر طرح کے جھوٹ پر قانون میں سزا نہیں دی جاتی، کیوں کہ قانون صرف سنگین اور سنجیدہ معاملوں میں جھوٹ بولنے سے متعلق ہوتا ہے جس سے عوامی مفاد کو اور انصاف کے عمل ونظام کو نقصان پہنچتا ہو۔ عدالت میں کوئی جھوٹا حلف نامہ داخل کرنا، مثال کے طور

پر گواہی کو چھپانا یا گواہی میں اپنی طرف سے کوئی بات ملانا یا بات بدل کر بتانا، یا حکام کو یا عام طور سے دوسرے لوگوں کو کوئی غلط معلومات دینا سنگین نتائج کا باعث ہوتا ہے۔ جھوٹے حلف نامے کے خلاف آیت ۲۲:۳۰ میں کی گئی تنبیہ شرک کے عقیدے اور عمل کے خلاف تنبیہ کے بعد آئی ہے، جس سے اس گناہ (جرم) کی سنگینی اجاگر ہوتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا [ابن حنبل، ترمذی]۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث میں جھوٹی گواہی کو سنگین گناہوں (''کبائر'') میں شمار کیا گیا ہے [بخاری، مسلم]۔ ایسے جرم پر سزا قانون ساز ادارے یا عدالت کے ذریعہ طے کی جاسکتی ہے، کیوں کہ جھوٹ بولنے کی کوئی معین سزا قرآن اور سنت میں نہیں بتائی گئی ہے۔

مسلم فقہاء اور قاضیوں (ججوں) نے عدالت میں معتبر شہادت کے لئے شرائط قائم کرنے پر بہت غور کیا ہے اور ان باتوں کو طے کرنے میں جن کی وجہ سے شہادت غیر معتبر ہو جاتی ہے [دیکھیں ۲:۲۸۲؛ ۵:۹۵، ۱۰۶؛ ۶۵:۲]۔ ماضی میں اسلامی عدالتوں میں مقامی معلومات کے ماہر لوگوں کی ایک جماعت موجود رہتی تھی جو کسی مقام، شخص یا رواج کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتی تھی۔

افواہ بازی

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اُسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اُس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اُس کی تحقیق کر لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی مہربانی نہ ہوتی تو چند اشخاص کے سوا سب شیطان کے پیرو ہو جاتے۔ (۴:۸۳)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ﴿۶﴾

مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔ (۴۹:۶)

جس طرح لوگوں کو کسی عوامی معاملے کی حقیت جاننے کا حق ہے خاص طور سے ایسے معاملے جو ان کی سلامتی اور تحفظ سے متعلق ہوں، وہیں ان کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ جب انہیں کسی خاص معاملے کی خبر لگے تو اسے متعلقہ ذمہ داروں تک پہنچائیں [۴:۸۹]۔ جن لوگ عوامی معاملات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور عوام کے نمائندے ہوتے ہیں اور ملک (یا علاقہ یا شہر) کا انتظام چلاتے ہیں ان کی بھی متوازی ذمہ داری ہوتی ہے کہ لوگوں کو حقائق کی معلومات دیں، اور معلومات کو اپنے پاس روک کر رکھنے سے بچیں سوائے کسی خاص عوامی مصلحت کے یا حساس معاملے کے۔ قرآن حکام اور عوام کے درمیان تعلقات کے اس لازمی معاملے میں لوگوں کو رہنمائی دیتا ہے اور دونوں فریقوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا بلا امتیاز و تفریق تعین کرتا ہے۔ وہ انہیں ایسے ہیجان و اشتعال سے روکتا ہے جس کے سبب حکام اپنے اختیارات کا

بے استعمال کرتے ہوئے ان سے حقائق کو چھپانے پر آمادہ ہوں، سچائی پر پردہ ڈالیں اور عوام کے حقوق پامال کریں، اور جس سے لوگوں کو حکومت کی شبیہ خراب کرنے کا موقع ملے اور حکومت کا اعتبار لوگوں کی نظروں میں کم ہو اور لوگوں کو صحیح معلومات نہ ہونے سے فائدہ اٹھائیں اور کسی بات کے بارے میں محض افواہیں پھیلائیں۔

عہدے داروں اور افراد کے وقار و اعتبار کو بچانے و محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی بھی خبر جو سامنے آئے اس کی تصدیق کر لی جائے تاکہ اس کے مستند اور صحیح ہونے کا ثبوت ملے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ خبر دینے والے شخص کی جانچ کی جائے اور اس کے بارے میں رائے قائم کی جائے کہ ایک سچا آدمی ہے اور اس کی معلومات کا جو ذریعہ ہے وہ مستند ہے۔ اس کے علاوہ، خود خبر کا بھی تجزیہ کرنا چاہئے اور اس کے سیاق و سباق کو سامنے رکھا جائے۔ احادیث کے بارے میں تصدیق کا جو معیار امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اپنایا وہ اس معاملے میں ایک شاندار علمی طریقے کی مثال ہے۔ ممتاز عالم اور مورخ ابن خلدون [م۔ ۱۴۰۶ء] نے تاریخی روایتوں کو جانچنے کے لئے کے طریقے اور اصول تجویز کئے ہیں۔ فقہاء نے بھی عدالت میں گواہوں اور ان کی شہادتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے کچھ طریقے وضع کئے تھے۔ چنانچہ، افواہ پھیلانا ایک جرم ہے اور اس پر سزا ہے جو تعزیرات کے تحت حالات کی مناسبت سے طے کی جاسکتی ہے۔

صحیح معلومات فراہم کرنا حکام کی ذمہ داری ہے اس پر بھی زور دینا ضروری ہے۔ سرکاری ادارے اور اس کے افسران جو ضروری معلومات دینے سے انکار کریں یا ٹال مٹول سے کام لیں انہیں سزا ملنی چاہئے۔ اسی طرح تعزیرات کے دائرے میں اس شخص کے لئے بھی سزا طے کی جاسکتی ہے جو حکام کے بارے میں جھوٹی افواہیں گھڑے اور انہیں پھیلائے۔ کسی بھی فرد پر زنا یا حرام کاری کا بہتان لگانے کو قرآن نے جرم قرار دیا ہے اور اس کی سزا طے کی ہے [۲۴:۴]۔ اسی طرح ہر فرد کو غلط الزام تراشیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے، جو بغیر ثبوت اور دلیل کے لگائے جائیں، قانون بنایا جاسکتا ہے۔ کچھ خاص معاملوں میں نقصان کے لئے ہرجانہ طے کرنا کافی ہوگا، جب کہ کچھ معاملوں میں سزا دینے کی ضرورت بھی ہوگی، جیسے جب کسی عوامی منصب دار کو نشانہ بنانے کے لئے کوئی افواہ پھیلائی جائے۔

بولنے، لکھنے اور اظہار کے دوسرے طریقوں سے اپنا دفاع

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو اعلانیہ بُرا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو اور اللہ (سب کچھ) سنتا (اور) جانتا ہے۔ اگر تم لوگ بھلائی کھلم کھلا کرو گے یا چھپا کر، یا بُرائی سے درگزر کرو گے تو اللہ بھی معاف کرنے والا (اور) قدرت والا ہے۔ (۴:۱۴۸ تا ۱۴۹)

جہاں ایک طرف ایک مومن کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے یا پھیلانے سے گریز کرے جو دوسروں کے لئے نقصان کی وجہ بن سکتی ہو، خاص طور سے ایسی صورت میں اس بات کی تصدیق کی بھی کوئی کوشش اس نے نہ کی ہو، وہیں دوسری طرف کسی فرد یا سماج کی طرف سے اپنا جائز دفاع کرنے کو اس بات سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ جس فرد کے ساتھ کوئی انصافی ہوئی ہو وہ اپنی شکایت انتظامیہ یا عدالت سے کرسکتا ہے اور وہاں یہ بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کتنا اور کیسا ظلم ہوا ہے، اور ظلم یا زیادتی کرنے والے نے اس کے ساتھ یہ زیادتی کس

طرح کی، چاہے وہ زیادتی کرنے والا کوئی افسر ہو یا کوئی عام آدمی۔ ایک مظلوم کو یہ اجازت ہے کہ وہ عدالت میں اپنا دفاع کرنے کے لئے دوسرے فریق کے خلاف اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ اگر یہ ظلم مجموعی طور پر پورے سماج کے ساتھ ہوا ہو، تو کوئی بھی فرد یا گروپ اس معاملے میں پیش رفت کر سکتا ہے اور اس شخص یا گروہ کی مذمت کر سکتا ہے جو جس نے عوامی مفاد کو نقصان پہنچایا ہو۔ البتہ نجی معاملوں میں یعنی کسی کے نجی حق کو اگر سلب کیا گیا ہو تو اس معاملے میں افراد کو معاف کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے، کیوں کہ ایسے معاملوں میں قرآن میں معاف کر دینے کی تلقین بار بار کی گئی ہے [جیسے ۲:۱۰۹، ۱۷۸، ۲۳۷؛ ۳:۱۲۴، ۱۵۹؛ ۴:۱۴۹؛ ۵:۱۳؛ ۱۳:۲۲؛ ۲۸:۵۴؛ ۴۱:۳۴؛ ۴۲:۴۰؛ ۶۴:۱۴]۔

اس طرح کے استثنائی معاملوں سے قطع نظر، کسی برائی کے بارے میں برسرِ عام بولنے سے روکا جا سکتا ہے اور کوئی بھی خلاف ورزی بہتان یا تہمت میں شمار کی جا سکتی ہے جس کے لئے ہرجانہ یا سزا عائد کی جا سکتی ہے۔ بولنے اور اظہار کی آزادی میں دوسروں کی برائیاں کرنے اور انہیں نقصان پہنچانا شامل نہیں ہے، یا افراد یا گروہوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی اجازت نہیں ہے، خاص طور سے جب یہ ایک برے مقصد اور منشا سے کیا جا رہا ہو۔ چوں کہ آزادانہ بولنے و اظہار کرنے کا حق اصولی طور پر اور ایک عام قاعدے کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے حق کا غلط استعمال کرنے اور دوسروں کو بدنام کرنے و نقصان پہنچانے کو ہرجانہ وصول کرنے یا تعزیر کے ذریعہ سزا دے کر کے روکا جا سکتا ہے اور آج کی اسلامی مملکت میں سزا کا یہ تعین فقہاء، قانون سازوں اور قاضیوں (ججوں) کے ذریعہ خوب غور و خوض کر کے کیا جائے گا۔

❀ ❀ ❀

عالم گیر تعلقات

امن ایک عام اصول ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔ (۲:۲۰۸)

یہ ان تمام لوگوں کے لئے جو ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ایک پکار ہے، اس بات کی کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کر کے، انصاف پر قائم ہو کر اور ہمدردی و جذبہ اخوت سے خود اپنے اندرون میں امن کی کیفیت پیدا کریں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات میں بھی امن کو فروغ دیں۔ نفرت اور بیزاری سے فرد کے اپنے اندر کا سکون بھی تباہ ہوتا ہے اور سماج و پوری دنیا کا امن بھی برباد ہوتا ہے۔ امن انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات کی بنیاد ہے جو مسلمانوں اور دیگر تمام لوگوں کے درمیان قائم رہنا چاہئے، مقامی اور علاقائی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی، جب کہ جنگ صرف ایک مجبوری کی اور استثنائی حالت ہے جو تب پیدا ہوتی ہے جب مسلمانوں کے عقیدے یا ان کے وطن سے متعلق ان کے انسانی حقوق سلب کئے جاتے ہیں، اور طاقت کا استعمال بالکل آخری درجے کی بات ہے جب دیگر کسی بھی طریقے سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت نہ کر سکیں۔ بعض مفسرین یہ سمجھتے ہیں کہ لفظ امن، جس کے لئے اس آیت میں سلم (یا سلام) کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا مطلب اسلام ہے، کیوں کہ دونوں الفاظ ایک ہی مادے سے بنے ہیں۔ اسلام اللہ پر ایمان کے توسط سے فرد کے اندرون میں اور قدرت و فطرت کے ساتھ اس کے تعلقات میں نیز دوسرے انسانوں کے ساتھ امن پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام السلام ہے [۵۹:۲۳] جس کا مطلب امن ہی امن ہے، اور جنت کا بھی ایک نام دارالسلام (امن کا گھر) ہے [۶:۱۲۷؛ ۱۰:۲۵] اور جنت نشینوں لوگ آپس میں ایک دوسرے کو تہنیت پیش کرنے ''السلام علیکم'' ہی کہیں گے اور سلام سے ہی جنت میں ان کا استقبال کیا جائے گا [۱۰:۱۰؛ ۱۳:۲۴؛ ۱۶:۳۲؛ ۳۳:۴۴؛ ۳۹:۷۳؛ ۵۰:۳۴؛ ۵۶:۲۶]۔

دنیا کی اس زندگی میں مسلمان ایک دوسرے کو السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کہہ کر ہی تہنیت پیش کرتے ہیں۔ اوپر کی آیت میں السلم (امن) کا جو لفظ آیا ہے اسے اس کے حقیقی معنیٰ اور وسیع مفہوم میں لینا اسلام سے متضاد نہیں ہے، بس یہ بات ہے کہ یہ اس کا عام معنیٰ ہے اور اس لحاظ سے یہ محض دین اسلام تک محدود نہیں ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخرالزماں) آ گئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب (الٰہی) میں سے چھپاتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں بیشک تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے۔ جس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا اور ان کو سیدھے رستے پر چلاتا ہی۔
(۵:۱۵ تا ۱۶)

ان آیات میں اسلام کے پیغام کو ''امن کے راستوں کی طرف اللہ کی رہنمائی'' کے بطور بیان کیا گیا ہے۔ عربی کے لفظ سلام اور اسلام دونوں کا مادہ اور مصدر ایک ہی ہے، اور یہ جنت کا بھی نام ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا[۱۶:۱۲۷؛ ۱۰:۲۵]۔ امن ایک جامع لفظ ہے، اور اس کے متعدد راستے ہیں جن سے اندرون کا سکون بھی ملتا ہے اور سماج و دنیا میں دوسروں کے ساتھ بھی سکون کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ امن تک قائم نہیں ہوسکتا ہے جب تک یہ انصاف پر مبنی نہ ہو، جو کہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں (طبعی، نفسیاتی، عقلی، روحانی و عقلی) کا احاطہ کرتا ہے اور گھر، پڑوس، سماج اور حکومت کے ساتھ فرد کے تعلق اور رویے میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح کا مجموعی امن جو ہر پہلو سے انصاف پر مبنی ہو یقینی طور سے لوگوں کو گہری تاریکیوں سے نکال لائے گا؛ جن اندھیروں میں انسان سب سے پہلے خود اپنے آپ میں ٹوٹتا اور بکھرتا رہتا ہے، کیوں کہ اس کا ذاتی توازن بگڑ جاتا ہے اور اس کا جھکاؤ کسی ایک طرف ہوجاتا ہے جب کہ دوسرے پہلوؤں کو وہ نظر انداز کرتا ہے، یا تمام سمتوں میں بہت سے دشمنوں سے معمولی معمولی باتوں پر غیر ضروری طور سے لڑتا رہتا ہے۔ اللہ کی ہدایت ہر شخصی پہلو اور ہر طرح کے انسانی تعلقات کو واجب اہمیت دیتی ہے، بغیر کسی کمی بیشی کے، کیوں کہ یہ رہنمائی انصاف کے سرچشمے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور ہر عیب سے پاک ہے اور کسی کے ساتھ بھی کوئی ناانصافی نہیں کرتا: '' اللہ ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی اور (عدل و انصاف کی) ترازو اور تم کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی آ پہنچی ہو''[۴۲:۱۷؛ نیز دیکھیں ۵۷:۲۵]۔ دوسروں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے لئے اگرچہ امن ایک عام اصولی بنیاد ہے، لیکن جو ظالم و جابر مسلمانوں کے انسانی حقوق سلب کرنے اور ان کے وطن کا امن برباد کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کرے ان کے خلاف کھڑا ہونا اور ان سے جنگ کرنا ضروری مسلمانوں کے لئے ضروری ہے[۲:۱۹۰]۔ اس طرح کے جائز اور ضروری مقابلے کے لئے قرآن مسلمانوں کو ابھارتا ہے اور اس مقابلے میں کوئی کمزوری دکھانے یا مقابلے سے جان چرانے کے خلاف انہیں متنبہ کرتا ہے۔

البتہ امن اور جنگ کی اپنی مشکلات ہیں، اور استقامت اور عزم و ہمت سے ان پر کاربند ہوئے بغیر ان کے مقاصد حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ چوں کہ مسلمان آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے قرآن بار بار ان کی توجہ آخرت میں ملنے والے مستقل اجر کی طرف دلاتا ہے، اور نہیں اس زندگی کی عارضی سہولتوں یا وقتی لذتوں کی ہی فکر میں لگے رہنے سے منع کرتا ہے۔ اور یہ بات قرآن میں جگہ جگہ کہی گئی ہے۔

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۱ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۲

اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اُس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو کچھ شک نہیں کہ وہ سب کچھ سنتا (اور) جانتا ہے۔ اور اگر یہ چاہیں کہ تمہیں فریب دیں تو اللہ تمہیں کفایت کرے گا وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی مدد سے اور مسلمانوں (کی جمعیت) سے تقویت بخشی۔ (۸:۶۱ تا ۶۲)

ان قائم کرنے کے لئے ان دونوں فریقوں کی کوشش ضروری ہے جو تنازعہ میں ملوث ہوں، اور کسی طرف سے اگر امن کی طرف میلان کا معمولی سا بھی اظہار ہو تو دوسرے فریق کو اس پر مثبت ردعمل دینا چاہئے۔ چوں کہ مسلمانوں کو ایک عام قاعدے کے طور پر امن کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ کہ جنگ ایک عارضی اور استثنائی حالت ہے جس میں انہیں جبر وظلم کا مقابلہ کرنے کی خاطر جانا پڑتا ہے وہ بھی تب جب کوئی دوسرا پر امن طریقہ کارگر نہ ہو رہا ہو، اس لئے وہ فریق مخالف کی طرف سے امن کی طرف میلان کسی بھی اظہار کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ فریق مخالف کا اظہار امن چاہے محض ایک فریب اور دکھاوا ہو تب بھی مسلمانوں کو ٹھوس ظاہری ثبوتوں کی بنیاد پر اپنے عام قانونی اصولوں کے مطابق اپنا موقف طے کرنا ہوتا ہے اور وہ امن کے موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ جب فریق مخالف قیام امن کا خوش گوار اظہار کرنے کے بعد پلٹ جائے اور اپنے خفیہ منصوبوں کو پورا کرنے میں لگ جائے تو اس کی بھاری قیمت پہلے فریق کو اٹھانی پڑ سکتی ہے، لیکن اخلاقی اور قانونی جیت ہر حال میں انصاف اور امن کے اصولوں کی ہی ہوگی۔ مذکورہ بالا آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک انسانی تعلقات کی مستقل بنیاد امن ہے اور اسے ہر مناسب طریقے سے برقرار رکھا جانا چاہئے، اور امن کے قیام کی خاطر کوئی جوکھم اٹھانا اگرچہ بہت بھاری ہو سکتا ہے لیکن یہ جنگ کی مصیبتوں کے مقابلے کم نقصان دہ ہے اور امن کی کوشش زیادہ قیمتی بات ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۸۳

وہ (جو) آخرت کا گھر (ہے) ہم نے اُسے اُن لوگوں کیلئے (تیار) کر رکھا ہے جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور (نیک) انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔ (۲۸:۸۳)

اس آیت میں ایک لازمی اصول پر زور دیا گیا ہے جو ملک کے اندر عوام کے ساتھ سلوک کرنے میں، اور دنیا میں دوسرے لوگ کے ساتھ معاملہ کرنے میں سیاسی طاقت کے استعمال پر بندش لگاتا ہے اور اس سلسلے میں رہنمائی کرتا ہے۔ جیسا کہ معروف ابن تیمیہ نے لکھا ہے، زمین پر خود کو خدا کی طرح مطلق العنان بنانا ممنوع ہے چاہے اس طاقت کے حصول کی نیت کچھ بھی ہو، کیوں کہ طاقت کے زور پر اپنے آپ کو منوانے سے طاقت کے غلط استعمال اور ظلم وزیادتی کی طرف لے جاتا ہے، جس سے داخلی سیاسی نظام چلانے میں ناانصافی اور جبر کا راستہ کھلتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ملک کے تعلقات میں ظلم وزیادتی، استحصال اور غرور وتکبر جنم لیتا ہے۔ اگر زمین پر اپنی ملوکیت قائم کرنے میں یہ جذبات کارفرما ہوتے ہیں تو یقینی طور سے یہ طاقت حاصل کرنے والا زمین میں فساد پھیلائے گا اور اپنے واپنے چاہنے والوں کو

فائدہ پہنچائے گا جب کہ دوسروں کو دبائے گا اور محروم کرے گا۔ اللہ پر ایمان اور آخرت کا یقین مومن کو دنیاوی عیش اور خود پسندی میں مبتلا ہونے سے روکتا ہے، اور انصاف سے کام لینے کی اللہ کی تعلیمات کو، نیز آخرت میں اللہ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی، نظر انداز کرنے بچاتا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اور اخلاقی قدریں داخلی اور عالمی سطح پر انصاف قائم کرنے کے لئے قانونی اقدامات کے واسطے ----------فراہم کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝۱۳

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔ (۴۹:۱۳)

یہ آیت انسانوں کے درمیان مساوات پر زور دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ لوگوں کے درمیان فرق اور ان کے الگ الگ قبائل و برادریوں کا وجود ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے جذبے کو بڑھانے والا ایک عالم گیر ڈائنامزم ہے۔ جغرافیائی اور نسلی فرق و اختلاف کو تسلیم کرنا ایک دوسرے سے مادی اور ثقافتی ادل بدل کو بڑھاوا دینے کے لئے ہونا چاہئے اور یہ عالم گیر تعاون لوگوں کے درمیان سے رکاوٹوں اور مزاحمتوں کو ہٹانے کا کام کرے گا اور انسانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور مساوات کو مضبوط کرے گا۔ قرآن انسانوں کو ''الناس'' (انسان) اور بنی آدم (آدم کی اولاد) کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور کسی خاص نسل یا ذات کی بات نہیں کرتا ہے۔ یہ انسانوں کو ایک چلتی پھرتی مخلوق کے طور پر کیریکٹرائز کرتا ہے جسے اللہ نے اپنے فضل سے ''خشکی اور تری میں سواری دی'' [۱۷:۷۰]، اور ہواؤں اور فضا کو انسان کے لئے مسخر کر دینے کو یہ اللہ کا فضل کہتا ہے [۴۵:۱۲ تا ۱۳]۔ اس کے علاوہ شریعت افراد اور حکومت کی مدد سے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کا نظم کرتی ہے جو ایک نئی زمین پر آ کر بستے ہوں اور کچھ عرصے کے لئے اپنا روزگار خود کمانے کی حالت میں نہ ہوں [۲:۱۷۷، ۲۱۵؛ ۳۶:۴؛ ۴۱:۸؛ ۲۶:۱۷؛ ۳۰:۳۸]۔ ایسے عالم گیر انسانی کنبہ میں مرد اور عورت برابر ہیں اور انسانیت مختلف سلسلوں----------

عہد کو پورا کرنا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَآ آٰمِّيْنَ

اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو تمہارے لئے چار پائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں بجز اُن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا اللہ تعالیٰ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ ا۔ مومنو! اللہ کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ ادب کے مہینے کی اور نہ قربانی کے جانوروں کی اور نہ اُن جانوروں کی (جو اللہ کی نذر کر دیئے گئے ہوں

الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

اور) جن کے گلوں میں پٹے بندھے ہوں اور نہ اُن لوگوں کی جو عزت کے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں (اور) اپنے رب کے فضل اور اُس کی خوشنودی کے طلبگار ہوں اور جب احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو اور لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تمہیں عزت والی مسجد سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اُن پر زیادتی کرنے لگو اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (۵:۱ تا ۲)

ان آیات میں سے پہلی آیت زور دے کر یہ بات کہتی ہے کہ کسی سے کئے وعدے یا عہد کو پورا کرنا قانونی اور اخلاقی طور سے لازمی ہے۔ یہ حکم افراد اور کسی بھی مسلم قانونی ادارے پر عائد ہوتا ہے جس میں اسلامی ریاست بھی شامل ہے؛ چاہے اس نے وعدے داخلی طور پر اپنے عوام سے کئے ہوں یا خارجی سطح پر دوسرے ملکوں اور بین الاقوامی اداروں سے کئے ہوں، یا پرائیوٹ کمپنیوں سے اور افراد سے نجی طور پر کئے ہوں۔ یہ فرمان باری تعالیٰ کسی سے کوئی وعدہ یا عہد کرنے والے مسلمان فرد یا گروہ یا ادارے کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری کے لئے دینی بنیاد فراہم کرتی ہے، کیوں کہ وعدے کو پورا کرنا اب اللہ پر مومن کے ایمان کا تقاضا بن جاتا ہے جو کہ علیم وخبیر ہے اور یوم محشر تن تنہا سارے معاملات کا فیصلہ کرے گا۔

دوسری آیت میں مسلمان افراد اور مسلمان قانونی اداروں اور مسلم حکومتوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے تعلقات میں انصاف پر عمل کریں ان لوگوں کے ساتھ بھی جو دشمنی کریں اور مسلمانوں کو مسجد حرام میں اللہ کی عبادت سے روکیں جو کہ ان کا قبلہ ہے اور جس کی زیارت وطواف کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ کیوں انصاف کرنا مسلمان کا کردار ہے، ان کا اتحاد و یکجہتی راست روی اور نیکی کی حمایت کرنے کے لئے ہے اور وہ کسی برائی یا ناانصافی کی حمایت اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ وہ کسی مسلمان کی طرف سے کی گئی ہو۔ انصاف کے تئیں یہ اخلاقی اور قانونی عہد بندی انفرادی اور عوامی تعلقات پر اثرات رکھتی ہے۔ کوئی مسلم یا اسلامی حکومت اگر کسی معاملے میں ناانصافی کرتی ہے تو کوئی مسلمان فرد یا جماعت اپنی اس حکومت کی حمایت محض اس بنا پر نہیں کر سکتا ہے کہ یہ ایک مسلم یا اسلامی حکومت ہے، نہ کسی اسلامی ریاست کو کسی دوسری اسلامی یا مسلم ریاست کی جو کہ ناانصافی پر آمادہ ہو محض اپنا ہم عقیدہ ہونے کی بنیاد پر حمایت نہیں دینی چاہئے۔ اللہ پر ایمان کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کے سیاسی، سماجی واقتصادی اور قانونی معاملوں میں انصاف پر کاربند رہنے کے عزم کو تقویت بخشیں، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔ علاوہ ازیں کسی بھی داخلی یا خارجی فریق کے ساتھ تعاون ہمیشہ مطلوب ہے اگر وہ انصاف پر مبنی ہو اور اس کا مقصد بھلائیوں کو فروغ دینا ہو۔

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى

اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اُس کو پناہ دو یہاں تک

يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

کہ کلامِ الٰہی سننے لگے پھر اُس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو اس لئے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں۔ (۶:۹)

یہ آیت سیاسی پناہ گزینی حاصل کرنے کے حق کو اولین منظوری پتہ دیتی ہے۔ مسلمانوں کا کوئی بھی دشمن مسلمانوں سے ان کی زمین پر اور ان کے خیمے (چھاؤنی یا قلعہ) میں پناہ مانگ سکتا ہے اور ان پر یہ لازم ہے کہ وہ اس پناہ چاہنے والے کو پناہ اور تحفظ فراہم کریں اور اس کو یہ موقع دیں کہ وہ مسلمانوں کے دین کو قریب سے اپ آپ سمجھے اور دیکھے، کسی دشمن ذریعے سے نہ سمجھے۔ ایسے شخص کو پناہ دی جائے گی اور اس کی حفاظت کی جائے گی اور اسے وہاں پہنچایا جائے جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھے چاہے وہ اپنے لوگوں اور اپنے وطن میں واپس جانا چاہے، یا مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہے۔ ایسے شخص کا فیصلہ جو کچھ بھی ہو، اس پر اسلام کو قبول کرنے کے لئے کوئی دباؤ نہیں بنایا جائے گا؛ مسلمانوں کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے، لوگوں کے مذہب کو از خود بدل دینا نہیں ہے، کیوں کہ ایمان اور عقیدے کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے [۲۵۶:۲]، اور ہر شخص کو اپنا عقیدہ پوری آزادی کے ساتھ منتخب کرنے کا حق ہے۔ جو لوگ اپنے وطن سے دور سیاسی پناہ کی ایسی حالت میں رہتے ہیں ان کی مدد بیت المال سے کی جاتی ہے اگر وہ اس نئی جگہ پر اپنا روزگار آسانی سے حاصل نہیں کر پاتے [۴۱:۸؛ ۶۰:۹؛ ۷:۵۹]۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۹۱ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۲ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳ وَ لَا

اللہ تمہیں انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ اور جب اللہ سے پختہ عہد کرو تو اُس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو اُن کو مت توڑو کہ تم اللہ کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے توسوت کاتا پھر اُس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ بنا لو گے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ غالب رہے، بات یہ ہے کہ اللہ تمہیں اس سے آزماتا ہے اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اُس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو عمل تم کرتے ہو (اس دن) اُن کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔ اور اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ نہ بناؤ

تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

کہ (لوگوں کے) قدم جم چکنے کے بعد لڑکھڑا جائیں اور اس وجہ سے کہ تم نے لوگوں کو اللہ کے رستے سے روکا، تم کو عقوبت کا مزہ چکھنا پڑے اور بڑا سخت عذاب ملے۔ اور اللہ سے جو تم نے عہد کیا ہے (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو (کیونکہ ایفائے عہد کا) جو (صلہ) اللہ کے ہاں مقرر ہے وہ اگر سمجھو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ (۱۶:۹۰ تا ۹۵)

ان میں سے پہلی آیت میں پیغام اسلام کی بنیادی تعلیمات کو سمیت دیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ تمام معاملوں میں انصاف اور احسان سے کام لینے کا حکم دیتا ہے چاہے سیاسی معاملہ ہو، انتظامی معاملہ ہو، قانونی ہو، سماجی و اقتصادی ہو، یا عالم گیر معاملات ہوں، اور ان سب سے پہلے گھر اور خاندان میں برتنا چاہئے تا کہ اس سے سماج کو اور پوری دنیا کو روشنی ملے اور وہاں بھی یہ اسی معیار کو اختیار کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ ناانصافی اور ظلم و زیادتی کو منع کرتا ہے اور ان تمام باتوں کو جو فحش وار بے حیائی والی ہیں اور ان تمام باتوں سے جو نامعقول اور لغو ہیں۔ یہ بنیادی باتیں مسلمانوں کو اپنے داخلی معاملات میں بھی اور دوسری قوموں وملکوں کے ساتھ تعلقات میں راہ دکھاتی ہیں۔ اس کے بعد والی آیات عہد کو پورا کرنے پر زور دیتی ہے جو مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے کریں یا کسی دوسری قوم یا ملک کے فرد سے پوری قوم اور پورے ملک سے کریں۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر نگراں ہے کہ ایک مومن دوسروں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے، اور وہ اپنے عہد اور وعدے پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں۔ لوگ اکثر اوقات کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے، اور دوسروں پر اپنا زور قائم کرنے کے لئے اپنے عہد اور ذمہ داریوں سے منھ موڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن ایسے لوگوں کا عالم گیر تعلقات میں کوئی اعتبار نہیں رہتا جو کہ بہت مشکل سے اور بہت زمانے میں لگا تار ثابت قدم رہنے سے قائم ہوتا ہے، ٹھیک اس بے وقوف عورت کی طرح جو بہت وقت لگا کر اور بہت محنت سے سوت کاتے اور بعد اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ مسلمان اس طرح آزمائے جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات میں اخلاقی قدروں پر قائم رہتے ہیں، یا ان کا مقصد دوسروں کی طرح زیادہ سے زیادہ طاقت وقوت حاصل کرنا ہے۔ جو لوگ اللہ کے سامنے جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں انہیں اس بات سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہر ایک کی جواب دہی ہوگی اور دوسروں سے ساتھ کسی بھی قسم کے اختلاف کی صداقت ہر ایک کے سامنے لائی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا سارے انسانوں کو ایک ہی جیسا بنا دیتا لیکن اس نے انسانوں کے درمیان فرق رکھا ہے تا کہ وہ ہر ایک کو دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں آزمائے۔ اس دنیا میں انسانوں کا آپس میں تعلقات رکھنا انسان کی خاص ذمہ داری ہے، اور آپسی تعلقات ہی دوسروں کے ساتھ سلوک کرنے انسان کے داخلی ارتقاء کی عکاسی کرتے ہیں۔ مسلمان اگر اپنے انسانی تعلقات میں اپنی اخلاقی قدروں کو نہیں برتیں گے، اپنے ملک میں بھی اور ملک کے باہر بھی، ان کے قدم طاقت کے زعم میں پھسل پھسل جائیں گے، اور وہ دنیاوی فائدوں کے لئے اللہ سے کئے ہوئے اپنے اس عہد کو بھول جائیں گے اور ان کی اس کوتاہی سے ساری دنیا میں اسلام کی شبیہ خراب ہوگی اور دوسرے لوگ اسلام کے پیغام کا احترام کرنے سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی ناکام ہوں گے اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اسلام عالمی تعلقات کے لئے کتنی گہری بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ایمان اور اخلاق سے شخصیت اور کردار کی تعمیر کرتا ہے صرف قانون سے ہی انہیں نہیں باندھتا، جیسا کہ خود شریعت اسلامیہ کا معاملہ بھی ہے۔

اتحاد المسلمین

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۷۱:۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بُری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

مومنوں کی داخلی اور عالمی ذمہ داریوں میں مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں شامل ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں کے عالم گیر اتحاد کے لئے مسلم مردوں اور عورتوں دونوں کو مل جل کر کام کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ، دونوں کو ہی پوری دنیا میں انصاف اور امن کی بات کرنی چاہئے جس سے ساری انسانیت فائدہ اٹھائے۔ مسلم عورتیں مسلم مردوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ایک زبردست طاقت بن سکتی ہیں اور اچھے کاموں کو بڑھاوا دینے، برے کاموں سے روکنے کے جدوجہد کر سکتی ہیں، مسلمانوں کے درمیان میں بھی اور دنیا میں بھی۔ مسلمانوں کا عالم گیر اتحاد کے لئے کوئی خاص سیاسی شکل یا ڈھانچہ نہیں ہے، اور خلافت صرف ایک تاریخی تجربہ تھی۔ باہمی تعاون اور اتحادِ عمل کے لئے آج کی دنیا میں وفاق بنانے، کنفیڈریشن قائم کرنے یا کامن ویلتھ جیسے پلیٹ فارم تشکیل دینے کا جو تجربہ کیا گیا ہے اس سے مسلمان اس معاملے میں رہنمائی لے سکتے ہیں۔ قدیم علماء اور فقہاء جیسے بغدادی [م۔ ۴۲۹ ہجری بمطابق ۱۰۳۷] اور الجوائنی [۴۷۸ ہجری بمطابق ۱۰۸۵ء] فزیکل ضرورتوں کے لئے متعدد مسلم سیاسی اینٹیٹیز کے موجود ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری انسانی ضرورتوں کے لئے بھی اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے جیسے نسلی، ثقافتی، نظریاتی، تنظیمی وغیرہ [اس پیراگراف کو دوبارہ ٹھیک سے لکھنا ہے]۔ مسلمانوں کا اتحاد قائم کرنے کا مطلب دنیا میں دوسروں کے خلاف کھڑا ہونا نہیں ہے، نہ کسی معاملے میں کسی مسلم اینٹٹی کی حمایت کرنا ہے، بلکہ صرف دنیا میں امن اور انصاف کی تائید و حمایت کرنا ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کا تعاون خیر و فلاح کے کاموں کو بڑھا دینے کے لئے کرنا ہوتا ہے، برائی یا ظلم و جبر میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہونے کے لئے نہیں ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ

مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔ اور جان رکھو کہ تم میں اللہ کے پیغمبر ہیں اگر بہت سی باتوں میں وہ تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا یہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں۔ (یعنی) اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ جاننے والا (اور)

الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

حکمت والا ہے۔ اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادہ کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پس جب وہ رجوع کرے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔
(۴۹:۶ تا ۱۰)

یہ آیات جس طرح سماج میں افراد کو اپنے باہمی تعلقات میں اخلاقی اقدار پر قائم ہونے کی تعلیم دیتی ہیں اسی طرح یہ مختلف مسلم اینٹیٹیز کے درمیان عالمی تعلقات میں رہنمائی دیتی ہیں اور مجموعی طور پر مسلمانوں و دنیا کے دیگر ملکوں کے درمیان تعلقات میں بھی رہنمائی دیتی ہیں، کیوں کہ مسلمان برائیوں کو اور دشمنیوں کو بڑھاوا دینے کے لئے آپس میں اتحاد نہیں کر سکتے، بلکہ امن قائم کرنے اور انصاف کے لئے ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے متحد ہو سکتے ہیں۔[۲:۵]۔ کسی بھی اطلاع پر کوئی عاجلانہ ردعمل دنیا میں کشیدگی پیدا کرے گا اور امن کو تباہ کرے گا، اور اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی تلافی ایک بارگی ہی آسانی سے نہیں کی جا سکتی، اور جلد بازی کرنے والا فریق بعد میں اپنی عجلت پسندی پر شرمندہ ہوگا۔ اللہ پر ایمان اور اللہ کی پکڑ کے ڈر سے اخلاقی حساسیت پیدا ہونا چاہئے، اور بغیر کافی ثبوت کے دوسروں کو نقصان پہنچا دینا یا کوئی غلط اور غیر منصفانہ قدم اٹھانے کی اجازت پہلی فرصت میں نہیں دی جا سکتی، اور اگر ایسا ہوتا ہے تو اسے پھیلنے نہیں دینا چاہئے۔ کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجنے کا اصل مقصد اللہ کے پیغام کا عملی نمونہ لوگوں کے سامنے لانا اور انہیں اور روزمرہ کے معاملات میں صحیح راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس طرح اللہ کا تقویٰ اور اخلاق پر کاربند رہنے کا عزم عالمی امن اور عالم گیر تعاون باہمی کے لئے ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے۔

لیکن، اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان کبھی کوئی تنازعہ پید ہو جائے، تو دوسرے مسلمانوں کو بے حس و حرکت نہیں رہنا چاہئے، بلکہ ثالثی کے ذریعہ مصالحت کرا کے یا پھر عدالتی عمل کے ذریعے اس تنازعہ کا حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر دونوں میں کوئی فریق جھگڑے کو اور بڑھاتا ہے اور زیادتی پر اتر آتا ہے، تو دیگر تمام مسلمانوں کو مل کا اس کا مقابلہ کرنا چاہئے اور طاقت کا استعمال کر کے امن قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے تا کہ انصاف اور انصاف کے اصول پر زور دیا جا سکے اور وہ یہ کہ ظلم اور زیادتی کو کسی بھی طرح برداشت نہیں کیا جائے۔ دنیا کے معاملات میں بے نیازی یا بے حسی برتنا اتنا ہی تباہ کن ہے جتنا داخلی سیاسی معاملات میں بے نیازی برتنا، اس سے زیادتی کرنے والوں اور جابروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ داخلی اور عالمی سطح پر بے انصافی کے لئے اور زیادہ جری ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن زیادتی کرنے والا فریق جیسے ہی ہتھیار ڈال دے اور انصاف و امن کی طرف مائل ہو جائے تو تنازعہ کے حل کے لئے اس کے ساتھ بات چیت شروع کر دینی چاہئے اور اس کے تئیں کوئی مخاصمت یا تعصب نہیں برتنا چاہئے، کیوں کہ دو غلطیاں مل کر کوئی درست بات نہیں بن

جاتیں۔ ناانصافی کا رویہ جب تک ایک فریق سے دوسرے فریق اور پھر تیسرے فریق تک منتقل ہوتا رہے گا تب تک دنیا سے ناانصافی ختم نہیں ہوگی اور امن قائم نہیں ہوگا، اور دنیا بدامنی کے ہچکولے کھاتی رہے گی۔ یہ آیات عالمی انصاف اور امن کی برقرار کے ایسے اصول پیش کرتی ہیں جن سے نہ صرف مسلمانوں کے درمیان بلکہ پوری دنیا میں انصاف اور امن کی حفاظت ہوتی ہے۔ البتہ ان اصولوں کی عملی شکل کے لئے کسی بھی انسانی تجربہ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے چاہے وہ تجربہ خود مسلمانوں نے کیا ہو یا غیر مسلموں نے۔ اقوام متحدہ اور عالمی عدالت انصاف مسلمانوں کو خود اپنے اداروں سے مستفید ہونے اور ان اداروں کو فروغ دینے میں یا عالمی اداروں کو ترقی دینے میں اپنا رول ادا کرنے کے لئے ان کی مدد کرسکتی ہیں۔

دوسروں کے ساتھ تعلقات

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

عجب نہیں کہ اللہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تم دشمنی رکھتے ہو دوستی پیدا کردے اور اللہ قادر ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۷۔ جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۸۔ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ تم کو دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی تو جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے وہی ظالم ہیں۔ (۶۰: ۷ تا ۹)

قرآن تمام قوموں، نسلوں اور قبیلوں کے درمیان باہمی تعاون پر بار بار زور دیتا ہے اور مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان تمام لوگوں سے مروت و انصاف کا معاملہ کریں جن کا دین و عقیدہ مسلمانوں سے مختلف ہے، جب تک ان میں سے کوئی مسلمانوں کے خلاف ان کے دین کی وجہ سے جنگ نہ چھیڑے، نہ انہیں ان کے گھروں سے نکالے۔ مسلمانوں کو اپنے بین الاقوامی تعلقات میں اللہ کے دین اور اس کی اخلاقی قدروں کی نمائندگی کرنی چاہئے اور ان کا یہ سلوک دشمنوں کو دوستی کی طرف مائل کرسکتا ہے، اور کوئی بھی دشمنی وقت بدلنے کے ساتھ دوستی میں بدل سکتی ہے [نیز دیکھیں ۲۳: ۹۶؛ ۴۱: ۳۴]۔ مسلمانوں کو کچھ لوگوں سے دوستانہ تعلقات نہ رکھنے کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ مذہبی اختلاف کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے ظلم و زیادتی یا ظلم و زیادتی میں ساتھ دینے کی بنیاد پر ہے۔ ظلم و زیادتی میں معاون بننے والے لوگ اس دنیا میں بھی اپنی بدعملی کے نتائج بھگتیں گے اور آخرت میں بھی [۱۱: ۱۱۳]۔

یہ آیات انصاف کے مطابق عالمی تعاون باہمی کے اصول پیش کرتی ہیں۔ مختلف نسلوں اور قوموں، مذہبوں و ثقافتوں کے درمیان تعمیری و مثبت تعلقات مسلمانوں اور ان کے دین کو عالم گیر تنوع کا حصہ بننے کا موقع دیتے ہیں، اور یہ نہ صرف مسلمانوں و اسلام کے لئے مفید ہے بلکہ ساری دنیا کے لئے فائدے مند ہے۔ موجود دشمنی کا ماحول مسلمانوں کو ایک بہتر تبدیلی کی طرف دیکھنے سے اور امن، خیر سگالی اور

تعاون کو فروغ دینے سے روکنے کا سبب نہ بنے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں ان لوگوں کے ساتھ تعمیری تعلقات اور امن کی توقع رکھنے کی مثال فراہم کی ہے جنھوں نے رسول اللہ کے پیغام کی مخالفت کی، دین قبول کرنے والوں کو ستایا، خود آپ ﷺ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی، اور جب اہل ایمان ہجرت کر کے ایک دوسرے مقام پر پہنچ گئے تو وہاں ان پر لگاتار چڑھائیاں کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دشمنوں کو بددعا دینے سے احتراز کیا اور فرمایا: ''میں اہل دنیا کے لئے زحمت بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کی اولاد میں سے ان لوگوں کو اٹھائے جو صرف اللہ کی عبادت کرنے والے ہوں۔ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے، یہ جانتے نہیں ہیں'' [بہ روایت مسلم]۔ جب آپ ﷺ کو حدیبیہ کے مقام پر دشمنوں نے روک دیا اور کعبہ کی زیارت و طواف کے لئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''قریش نے آج مجھے اللہ کے حکم کو پورا کرنے ----------(حدیث کے الفاظ)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

مومنوں کو چاہئے کہ مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریگا اُس سے اللہ کا کچھ (عہد) نہیں ہاں اگر اس طریق سے تم اُن (کے شر) سے بچاؤ کی صورت پیدا کرو (تو مضائقہ نہیں) اور اللہ تم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (۲۸:۳)

یہ آیت مومنوں کو اس بات سے منع کرتی ہیں کہ جن لوگوں نے تکبر کے ساتھ حق کو جھٹلا دیا ہے انہیں اپنا ''اولیاء'' (سرپرست یا ضامن) بنائیں، ان لوگوں کو چھوڑ کر جو ان کے دینی بھائی ہیں یعنی دین میں ان کے ساتھ اور مددگار ہیں۔ لیکن یہ حکم اس عام اصول کے خلاف نہیں ہے کہ تمام انسانوں کے ساتھ تعلقات رکھے جائیں اور ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائیں اور ان کے ساتھ مروت و انصاف کا معاملہ کیا جائے جب تک کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحیت نہ کریں یا ان کے دین اور وطن کے تعلق سے ان کے انسانی حقوق پر دست درازی نہ کریں۔ قرآن کے پیغام ہدایت کو مجموعی طور پر ہی سمجھنا ہوگا؛ جو تعلقات رکھنا منع ہیں وہ ولی (سرپرست یا بڑا) بنانے کے تعلقات ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ممانعت ان لوگوں کے بارے میں ہے جنھوں نے تکبر کے ساتھ کھل کر حق کا انکار کر دیا ہو جب کہ حق ان کے سامنے کھل کر آ گیا ہو، اور وہ لوگ '' جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی'' [۹:۶۰]۔ مزید برآں ایسے ظالموں کے ساتھ تعلقات اس لحاظ سے ممنوع ہیں کہ مومنوں کو چھوڑ کر، جن کو اپنا مددگار اور سرپرست بنانا فطری طور سے مفید ہے، یہ تعلقات بنائیں جائیں۔ اگر مسلمانوں کے لئے دوسروں کے ساتھ تعلقات سے یہ فائدے لازمی طور سے ملتے ہوں، اور اس کے مقاصد کچھ اور نہ ہوں تو ضرورت کے وقت اجازت کا اصول یہاں عائد ہوسکتا ہے'' جو چیزیں اُس نے تمہارے لئے حرام ٹھہرادی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں (بیشک اُن کو نہیں کھانا چاہئیے) مگر اس صورت میں کہ اُن کے (کھانے کے) لئے ناچار ہو جاؤ'' [۱۱۹:۶]؛ ''ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اُس پر کچھ گناہ نہیں'' [۲:۱۷۳]؛ ''اللہ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا'' [۲۸۶:۲]۔ تاہم مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ

وہ آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کریں اور مشترک فائدوں کے لئے ایک دوسرے کو سہارا دیں [۵:۲]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۴۴

اے اہلِ ایمان! مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام لو؟ (۴:۱۴۴)

قرآن میں یہ جو لفظ ''اولیاء'' استعمال کیا گیا ہے اس کا ترجمہ سہولت کے ساتھ ''سرپرست'' اور ''حمایتی'' نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کا مطلب قوت حاصل کرنے سے ہے اور اس کے معنیٰ سے قریب تر مفہوم برتری کی کیفیت ہے۔ یہ تعلقات کی ایسی نوعیت ہے جو محض دوستی یا برابر کے کسی شخص سے مدد یا سہارا لینے سے آگے کی نوعیت ہے، اس میں مکمل وفاداری اور ہر وقت و ہر حالت میں اس کے موافق سلوک اختیار کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ انگریزی کا لفظ ''پیٹرون'' (سرپرست) قدیم زمانے میں اس شخص کے لئے بولا جاتا تھا جو اپنے کسی غلام کو آزاد کر دیتا تھا لیکن اس پر اپنا حق برقرار رکھتا تھا، اور اسی تعلق کے لئے عربی میں ولی اور اولیاء کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ان آیات میں جس تعلق کو ممنوع کیا گیا ہے وہ منکرین حق سے سیاسی، فوجی یا تکنیکی مدد حاصل کرنے کی جستجو پر صادق نہیں آتا کیوں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے وقتی تجربات کئے جب مسلمانوں کو اس کی ضرورت پڑی اور یہ مدد اس وقت صرف انہیں سے مل سکتی تھی جو دشمنوں کے عقیدے پر قائم تھے۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی پوری کوشش کی جو آپ پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں تھے، اور آپ نے یہ معاملہ مکہ میں بھی کیا اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے بعد وہاں بھی کیا۔ رسول کریم ﷺ کی وفات سے کچھ ہی سال پہلے حدیبیہ میں آپ نے کفار مکہ کے ساتھ جو صلح کی اس سے عرب قبیلوں کو یہ موقع ملا کہ وہ یا آپ کے حلیف و اتحادی بنیں یا آپ کے دشمنوں کا ساتھ دیں۔ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کا حلیف اور اتحادی بننا پسند کیا ان کے لئے آپ نے اسلام قبول کرنے کی شرط نہیں رکھی۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے وقت آپ ﷺ نے راستہ دکھانے کے لئے ایک ایسے شخص کو لیا جو ایمان نہیں لایا تھا اور دشمنوں کے دین پر ہی تھا۔ طائف میں دشمنوں سے گھر جانے کے موقع پر آپ نے منجنیق استعمال کرنے کا طریقہ دیکھا اور بعد میں اس سے فائدہ اٹھایا۔

علاوہ ازیں، تعلق کی اس ممانعت کو قرآنی اور تاریخی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ جن آیات میں یہ ممانعت آئی ہے وہ عام طور سے منافقین کی مذمت میں آئی ہیں، جو ظاہر میں تو اسلام پر ایمان رکھتے تھے لیکن اطاعت کفار کی کرتے تھے [۴:۱۳۷ تا ۱۴۶]۔ چنانچہ کفار کے ساتھ ان کے تعلقات ان کے ساتھ پوری وفاداری والے تھے، اور عقیدے طریقہ زندگی کے اعتبار سے بھی ان کا میلان انہی کی طرف تھا۔ آیت ۹:۶۰ میں ان لوگوں پر واضح کیا گیا کہ جو مسلمان اور مومن ہیں انہیں کافروں کو اپنا اولیاء نہ بنانا چاہئے: '' اللہ انہی لوگوں کے ساتھ تم کو دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی''۔

یہ اصول اہل کتاب کے بارے میں بھی عائد ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ پوری طرح وفاداری کا تعلق قائم کرنا، ان کی موافقت کرنا اور ان کے عقائد اور طرز زندگی کو اپنانا منع ہے، کچھ خاص معاملوں میں قسم طرح سے کوئی مدد لینا منع نہیں ہے خاص طور سے ان سے ''جو تمھارے دین کی وجہ سے تم سے لڑتے نہیں ہیں، نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالتے ہیں'' [۸:۶۰]۔ دین اور عقیدے میں جو بھی

اختلاف ہو، اسلام انسانی تعلقات قائم کرنے اور بین الاقوامی باہمی تعاون اور باہمی افہام وتفہیم پر زور دیتا ہے، جب تک کہ یہ تعلقات انصاف اور باہمی مفاد پر مبنی ہوں، ''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''[۸:۶۰]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ
اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا
جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ
سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۚ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ
بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ
مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۱ اِنْ
يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ
اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ
تَكْفُرُوْنَ ۝۲ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ۝۳ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ
مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا
بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ
لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ
رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۴
رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا
رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ

مومنو! اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی طلب کرنے کے لئے (مکہ سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ (دینِ) حق سے جو تمہارے پاس آیا ہے منکر ہیں اور اس باعث سے کہ تم اپنے پروردگار اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو پیغمبر کو اور تم کو جلاوطن کرتے ہیں تم ان کی طرف پوشیدہ پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے اور جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا وہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا۔ اگر یہ کافر تم پر قدرت پا لیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں اور ایذا کے لئے تم پر ہاتھ (بھی) چلائیں اور زبانیں (بھی) اور چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔ قیامت کے دن نہ تمہارے رشتے ناتے کام آئیں گے اور نہ اولاد اس روز وہی تم میں فیصلہ کرے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔ تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں (اور) تمہارے (معبودوں کے کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کھلم کھلی عداوت اور دشمنی رہے گی ہاں ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لئے مغفرت مانگوں گا اور میں اللہ کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا کچھ اختیار نہیں رکھتا اے ہمارے پروردگار! تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ کر جانا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں کے ہاتھ سے عذاب نہ دلانا اور اے ہمارے پروردگار! ہمیں معاف فرما بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔ تم (مسلمانوں) کو یعنی جو کوئی اللہ

فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

(کے سامنے جانے) اور روزِ خرت (کے آنے) کی امید رکھتا ہو اسے ان لوگوں کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے اور جو روگردانی کرے تو اللہ بھی بے پروا اور سزاوارِ حمد (وثنا) ہے۔ (۶۰:۱ تا ۶)

یہ، ایک طرف دشمن کا سامنا کرنے اور دوسری طرف اس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کے متضاد رویے پر ایک تنبیہ ہے۔ یہ رویہ مومنوں کی اجتماعی سلامتی کے لئے خطرناک ہے اور افراد کے اخلاق کے لئے تباہ کن ہے اور مومنوں کے آپسی اعتماد کو ختم کرنے والا ہے۔ جن لوگوں سے مومنوں کو پوشیدہ مراسم رکھنے کے خلاف متنبہ کیا گیا وہ دشمن تھے اور انھوں نے نہ صرف حق کو جھٹلا کر اپنی دشمنی ظاہر کر دی تھی ''بلکہ اللہ کے رسول کو اور تمھیں اس وجہ سے گھروں سے نکالا کہ تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو''۔ اس کے علاوہ آئندہ کی کسی بھی جنگ میں یہ دشمن یقینی طور سے مومنوں کے خلاف کھڑے ہوں گے اور انہیں ہر ممکن نقصان پہنچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اگر ہاتھوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے تو زبانوں سے نقصان پہنچائیں گے۔ دین و ایمان کے دشمنوں سے اتحاد قائم کرنے کے عذر کے طور پر کسی رشتہ داری اور تعلق کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ مومنوں اور ان کے مقصد کسی بھی طرح کے مادی یا اخلاقی نقصان جو اس رشتہ داری یا تعلق کی وجہ سے ہو سکتا ہو، وہ رشتہ داری کے تقاضوں کو نبھانے سے زیادہ سنگین ہوگا۔ نہ صرف کسی کے رشتہ داروں کے لئے، بلکہ اس کے بچوں کے لئے بھی، اور فیصلے کے دن کوئی رشتے داری کام نہ آئے گی اور اولاد والدین کے لئے اور والدین اولاد کے لئے کوئی مددگار بن سکیں گے۔

الٰہی تعلیمات میں ہر انسان کے ساتھ خواہ اس کا مذہب کچھ بھی عام طور سے اچھے تعلقات رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے اس حد تک کہ اس تعلق کے رکھنے یا نبھانے میں عقیدے اور ایمان سے کوئی سمجھوتہ نہ کرنا پڑے یا دین و ایمان کے لئے یہ تعلق نقصان دہ نہ بنے۔ البتہ دشمنی یا ناپسندیدگی کا معاملہ کوئی مستقل معاملہ نہیں ہے جیسا کہ اگلی آیت [۶۰:۷] سے واضح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ دشمنی اور ناپسندیدگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن دشمن فریق سے کوئی زور زبردستی کریں یا دوسروں کے ساتھ مروت کا سلوک کرنے سے بچیں جب تک کہ ان کی طرف سے مومنوں کے خلاف کوئی جارحانہ حرکت نہیں ہوتی، ایسی صورت میں مومن اپنا دفاع کرنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ اگلی آیات ۶۰:۸ تا ۹ ان دونوں صورتوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مسلمانوں کو محض مذہب و عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے طاقت کا استعمال کرنے کی ہرگز کوئی اجازت نہیں ہے اگر اس اختلاف کا تعلق کسی زیادتی یا ایسی حق تلفی سے نہیں ہے جو اپنے دین پر چلنے اور اپنے وطن میں آزادانہ رہنے کے حق کو پامال کرنے کے لئے ہو۔

ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جن سے دوسروں کے ساتھ اپنے موقف کے مطابق تعلق قائم کرنے کے لئے رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپن بت پرست قوم کے خلاف کوئی پرتشدد حرکت نہیں بلکہ اس کے برعکس انھوں نے دراصل اپنے والد کی طرف سے طاقت کے استعمال اور سزا کی دھمکی کے جواب میں والد کے لئے ایمان اور مغفرت کی دعا کا وعدہ کیا: ''اس نے کہا کہ ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہے اگر تو باز نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو ہمیشہ کیلئے مجھ سے دُور ہو جا۔ ۴۶۔ ابراہیم نے سلام علیک کہا (اور کہا کہ) میں آپ کیلئے اپنے رب سے بخشش مانگوں گا بیشک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔ ۴۷۔ اور میں آپ لوگوں سے اور جن کو آپ اللہ کے سوا پکارتے ہیں اُن سے کنارہ کرتا ہوں اور اپنے رب ہی کو پکاروں گا امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا'' [۱۹:۴۶ تا ۴۸]۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو جو توڑا جن کی

پوجا ان کی قوم کے لوگ کرتے تھے تو ان کا مقصد ان جھوٹے خداؤں کو مٹا دینا اور ان کے وجود کو ختم کر دینا نہیں تھا، بلکہ ایک عملی دلیل پیش کرنا تھا کہ یہ بت خود اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے تو ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے پوجنے والوں کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔[دیکھیں ۲۱:۵۱ تا ۷۰؛ ۳۷: ۸۳ تا ۹۸]۔ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکا جا رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا کر یہ دکھایا کہ حقیقی خدا اور مارنے و بچانے والا خدا کون ہے اور کون اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور بندوں کو کس مدد اور سہارے کی امید کرنی چاہئے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝۲۹

جو لوگ اہلِ کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روزِ آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔ (۹:۲۹)

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کو صرف اپنا اور اپنے دین کا دفاع کرنے کے لئے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ان لوگوں کے خلاف جو ان کے خلاف جنگ چھیڑی[۲:۱۹۰، ۱۹۳؛ ۹:۶۰]، ان لوگوں کے خلاف نہیں جو پر امن ہوں چاہے ان کا عقیدہ جو کچھ بھی ہو[۸:۶۰]۔ اس کے علاوہ، جن لوگوں کے خلاف اوپر کی آیت میں مسلمانوں سے جنگ کرنے کو کہا گیا ہے وہ واقعتاً اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے تھے، نہ اس چیز کو حرام کرتے تھے جسے اللہ نے اور اللہ کے نبیوں نے حرام کیا تھا، حالانکہ وہ کتاب رکھتے تھے جس میں اس تعلق سے انہیں تعلیم دی گئی تھی اور ان سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں اور اس کی ہدایت کو اپناتے ہیں۔ معروف مفسر قرآن فخر الدین رازی کے مطابق یہ منفی خصوصیات ہونا ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے شرط ہیں۔ جب کہ لوگوں کے کسی بھی گروہ کی طرف سے جنگ چھیڑنا اپنے آپ میں خود اس بات کی معقول وجہ ہے کہ جواب میں ان سے لڑا جائے چاہے وہ مسلمان ہی ہوں[۹:۴۹]۔ جو غیر کسی مسلم اقتدار کے تحت رہتے ہیں انہیں اپنی حفاظت و تحفظ کے بدلے جزیہ دینا ہوتا ہے جو اقتدار کو تسلیم کرنے کی ایک علامت بھی ہوتی ہے۔ جزی دینے والا ایک مضبوط آدمی ہونا چاہئے، جب کہ بزرگوں، عورتوں اور بچوں کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ درج بالا آیت غیر مسلموں کے ایسے معاملے کو پیش کرتی ہے جو اہل کتاب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ ان کے عقائد اور ان کا عمل اس تعلیم کے خلاف ہیں، اور جو مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی جگہ رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے مسلمانوں کے خلاف لڑائی چھیڑی۔ ان لوگوں کی اس جارحانہ روش کا مقابلہ تب تک کرنا ضروری ہے جب تک یہ اسلامی ریاست کے اختیار اور اقتدار کو تسلیم نہ کریں، اور جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حرام تسلیم نہ کریں، لیکن ان کے عقیدے اور مذہب کی آزادی برقرار رہے گی ان کے مخاصمانہ رویے اور ٹکراؤ کے باوجود۔

ان آیات کو ان لوگوں کے خلاف لڑنے کا ایک لائسنس نہیں سمجھا جا سکتا جو ایسا کردار رکھتے ہوں جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور دنیا میں کہیں بھی بستے ہوں، یہ صرف جزیرۃ العرب میں اور رسول اللہ ﷺ کی حیات میں لاگو ہوا۔ اسے ایک عام اصول کے طور پر لینا کہ مسلمانوں کو دنیا کے ان تمام لوگوں کے خلاف لڑنے کا اختیار دیا گیا ہے جو اسلام قبول نہ کریں یا جزیہ ادا کریں قرآن کی تعلیم اور منشاء

کے مطابق نہیں ہے۔ یہ ایک خاص طرح کے حالات میں ایک خاص طرح کا معاملہ تھا جو تاریخ کا حصہ ہے، یہ قرآن کی بنیاد پر کوئی مستقل قانون نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک جزیہ کی ادائیگی کی بات ہے تو قرن اول کی تمام مسلم دستاویزات اور عملی مثالیں واضح طور سے بتاتی ہیں کہ یہ حفاظت کی ضمانت کے طور پر لیا گیا۔ ایک اسلامی ریاست کے دفاع وتحفظ سے متعلق فوجی ذمہ داری میں شریک ہونے سے غیر مسلم شہری گریز کر سکتے ہیں، اس لئے، جیسا کہ معتبر مورخ بلاذری [۲۷۹ ہجری بمطابق ۸۹۲ عیسوی] اور الطبری [م۔ ۳۱۰ ہجری بمطابق ۹۲۲ عیسوی] نے لکھا ہے، جب کبھی غیر مسلم شہریوں نے فوجی ذمہ داریوں کو تسلیم کیا تو ان پر جزیہ ساقط کر دیا گیا۔ جو لوگ جنگ میں شامل ہونے کے اہل نہ ہوں انہیں جزیہ سے مستثنیٰ کرنے کی مثال خلافت راشدہ میں موجود ہے جس سے اس سچائی کی تائید ہوتی ہے کہ جزیہ دشمن سے جنگ کی حالت میں حفاظت کرنے کی ایک قیمت تھی جو ان لوگوں سے لی جاتی تھی جو جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتے تھے۔ آج کی جدید ریاست میں، مساوی شہری حقوق کے تصور کے مطابق۔۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہری اپنے حقوق اور ذمہ داریوں میں مسلمانوں کے برابر ہیں، اور ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داریوں میں دل وجان سے حصہ لیں، جہاں انہیں پورے انسانی حقوق حاصل ہیں۔

دنیا کے واقعات ومعاملات سے باخبری

غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۲﴾ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ بِنَصۡرِ اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۵﴾ وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾ یَعۡلَمُوۡنَ ظَاہِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚۖ وَ ہُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۷﴾

(اہلِ) روم مغلوب ہو گئے۔ اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے۔ چند ہی سال میں۔ پہلے بھی اور پیچھے بھی اللہ ہی کا حکم ہے اور اس روز مومن خوش ہوجائیں گے۔ (یعنی) اللہ کی مدد سے وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ غالب (اور) مہربان ہے۔ (یہ) اللہ کا وعدہ (ہے) اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یہ تو دنیا کی ظاہر زندگی ہی کو جانتے ہیں اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔ (۳۰:۲ تا ۷)

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے ذہن میں عالمی تعلق کو فروغ دینے کی فکر پروان چڑھاتا ہے، کیوں کہ مسلمان دنیا کا ایک لاینفک حصہ ہیں اور ان سے الگ تھلگ ہوکر نہیں رہ سکتے، اور دنیا کے کسی بھی حصہ میں کچھ ہوتا تو اس کا اثر ان پر بھی پڑے گا۔ بازنطینی قوم عیسائی تھی، لیکن وہ بھی مسلمانوں کی طرح اللہ پر ایمان اور اللہ کے سامنے انسانوں کی جواب دہی کا عقیدہ رکھتے تھے اس لئے ان لوگوں کے مقابلے پر جن کا عقیدہ مختلف تھا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوسکتے تھے۔ لیکن زمانہ وسطیٰ کی دو بڑی طاقتوں یعنی ساسانی مجوسیوں اور بازنطینوں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں دونوں سلطنتیں کمزور ہوئیں اور اس کمزوری سے اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں اپنا مقام بنانے میں مدد ملی۔ لیکن مسلمان اتنے تنگ ذہن اور خود پسند نہیں تھے۔ وہ بازنطیوں کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اپنے سے قریب

تر سمجھتے تھے اور اس وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ پارسیوں پر بازنطینی غالب آجائیں۔

ان آیات میں ان دونوں سلطنتوں کے درمیان لگاتار ہونے والی جنگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا نتیجہ آخر میں بازنطینیوں کے حق میں نکلا جب انھوں نے ۶۱۳ میں دمشق پر اور پھر اگلے سال یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ ان آیات میں یہ پیش گوئی کی گئی کہ بازنطینی (رومی) لوگ جو اس وقت چل رہی جنگ میں شکست کھا گئے تھے، عنقریب پھر غالب آجائیں گے۔ یہ پیش گوئی ہو بہو پوری ہوئی اور بازنطینی شہنشہا ہراقل نے ۶۲۲ سے ۶۲۶ تک ایرانیوں سے لگاتار جنگ کرنے کے بعد آخر کار انہیں ہرادیا اور اپنے پرانے علاقے واپس لے لئے اور ایرانی پارسیوں پر زبردست دباؤ بنادیا۔ قرآن نے بازنطینیوں کے حق میں مسلمانوں کے رجحان اور میلان کی تائید کی: ''اس روز مومن خوش ہوجائیں گے، اللہ کی مدد سے۔۔۔۔''

ماضی کے ان مخصوص واقعات سے قطع نظر، قرآن کا یہ پیغام جو مسلمانوں کو دنیا میں ہونے والے واقعات میں شامل ہونے کی تاکید کرتا ہے ہر زمانے میں اپنی معنویت رکھتا ہے۔ یہ آیات مومنوں کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوتا وہ پورا ہوکر ہی رہتا ہے جب کہ لوگ صرف سامنے سے نظر آنے والی چیز کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور کسی وقتی کمزوری یا طاقت کو مستقل سمجھنے لگتے ہیں۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی میں نشیب وفراز اور نئے نئے موڑ آتے رہتے ہیں، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہر انسان کی نیت اور اعمال کا فیصلہ کرے گا اور ان کے مطابق ہر انسان کو جزا یا سزا دے گا، چاہے اس دنیا میں انہیں جو بھی راحتیں یا دقتیں ملی ہوں۔ عارضی خوشی یا عارضی غم میں انسان کو اتنا زیادہ مبتلا نہیں ہوجانا چاہئے کہ وہ آخرت کو بھول ہی جائے۔

جنگ: جبر وستم کا مقابلہ کرنے اور انسانی حقوق کے دفاع کے لئے ایک استثنائی ضرورت ہے

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۳۹﴾ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

اللہ تو مومنوں سے اُن کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے بیشک اللہ کسی خیانت کرنے والے اور کفرانِ نعمت کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے اُن کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ اُن پر ظلم ہورہا ہے اور اللہ (اُن کی مدد کرے گا وہ) یقینا اُن کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب، اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) خلوت خانے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں اللہ کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے ویران ہوچکی ہوتیں اور جو شخص اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اُس کی ضرور مدد کرتا ہے بیشک اللہ توانا اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور

بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ (۲۲:۳۸تا۴۱)

ان آیات سے پہلی آیت کو جنگ سے متعلق سب سے پہلی آیت بتایا گیا ہے۔ اس آیت میں صاف طور سے کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے جنھوں نے ''انہیں ان کے گھروں سے نکالا اور ان کے حقوق پامال کئے صرف اس لئے وہ کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے''۔ لفظ اجازت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جنگ ایک مجبوری اور استثنائی حالت ہے اس عام اصول کی نسبت کہ دوسروں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات امن پر مبنی ہیں، اور اجازت صرف صرف اپنا دفاع کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ یہ بات دوسری آیات میں بھی کہی گئی جو بعد میں نازل ہوئیں [جیسے ۲:۱۹۰، ۱۹۳ تا ۱۹۴؛ ۴:۷۵]۔ یہ آیات یہ بتاتی ہیں کہ اپنا دفاع کرنے کے لئے جنگ کی یہ استثنائی اجازت اللہ نے اس لئے دی ہے کہ لوگ جارحیت اور ظلم کا مقابلہ کرنے کے اہل بنیں جو کہ انسانی فطرت کی وجہ سے کوئی بعید بات نہیں ہے۔ اگر اپنا دفاع کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو ظلم وزیادتی کو ایک کھلی چھوٹ مل جاتی ہے اور ظالموں کی دست درازی سے عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہتیں جو صرف اللہ کی عبادت اور حمد وثناء کے لئے بنائی گئی ہیں [۲۲:۴۰]: ''زمین پر یقینی طور سے فساد پھیل جاتا'' [۲:۲۵۱]۔ اللہ ان لوگوں سے مدد کا وعدہ کرتا ہے جو اس کے کاز کی مدد کرتے ہیں، اور جو ظلم کی مزاحمت کرتے ہیں تاکہ انصاف قائم ہو چاہے وہ ابتداء میں کمزور اور دبے ہوئے ہی ہوں۔ آخر کار ان ایمان والوں کو ہی فتح ہوگی، اور پھر انہیں آزمایا جائے گا کہ وہ اپنی طاقت واقتدار کو کیسے برتتے ہیں، جب کہ وہ محکومی اور مجبوری کی حالت میں پہلے آزمائے جا چکے ہیں۔ انہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اپنے ایمان پر قائم رہیں اور ایمان کے تقاضوں کو نیز اخلاقی قدروں کو پورا کریں گے، ہر حال میں چاہے مجبوری ومحکومی کی حالت میں ہوں یا طاقت واقتدار کی حالت میں ہوں۔ مومنوں کی فتح اور غلبہ کا مطلب ہے انصاف اور اخلاقیات کا قیام: ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے''۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝۱۹۰

اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (۲:۱۹۰)

اللہ کے راستے میں لڑنا یعنی جہاد اور اس کی منشاء پوری کرنا یعنی سب کے لئے انصاف اور امن کو یقینی بنانا انسانوں کے حقوق کے دفاع کے لئے ہے، چاہے یہ انسانی زندگی کا حق ہو یا وطن میں رہنے کا حق ہو، یا رائے، عقیدے اور اظہار کی آزادی کا حق ہو۔ اس بات کو پچھلی آیت میں دیکھا جاسکتا ہے ''جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے اُن کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ (اُن کی مدد کرے گا وہ) یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے'' [۲۲:۳۹]، اور بعد میں آیت ۴:۹۰ میں بھی کہا گیا کہ ''مگر جو لوگ ایسے لوگوں سے جا ملے ہوں جن میں اور تم میں (صلح کا) عہد ہو یا اس حال میں کہ اُن کے دل تمہارے ساتھ یا اپنی قوم کیساتھ لڑنے سے رک گئے ہوں، تمہارے پاس

آ جائیں (تو احتراز ضرور نہیں) اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کو تم پر غالب کر دیتا تو وہ تم سے ضرور لڑتے پھر اگر وہ تم سے (جنگ کرنے سے) کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں اور تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں تو اللہ نے تمہارے لئے اُن پر (زبردستی کرنے کی) کوئی سبیل مقرر نہیں کی ''۔اس کے بھی بعد نازل ہونے والی ایک اور آیت بھی مسلمانوں کا یہ یاد دلاتی ہے اللہ تعالیٰ مومنوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان مستقبل میں اچھا تعلق بھی پیدا کر سکتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے ان سے ان کے دین کی وجہ سے لڑائی نہیں کی، نہ انہیں ان کے گھروں سے نکالا، انصاف اور مہربانی پر مبنی اچھے تعلقات کو فروغ دینے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ ''اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''[۶۰ تا ۸]۔طاقت کا استعمال انہی تک محدود رہنا چاہئے جو جنگ جارحیت کریں اور مستقل طور سے ظلم وزیادتی پر آمادہ رہیں اور'' تم سے (لڑنے سے) کنارہ کشی نہ کریں اور نہ تمہاری طرف (پیغامِ) صلح بھیجیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں''[۹۱:۴]؛ جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی''[۹:۶۰]۔ایسے ہی معاملوں میں مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لئے لڑنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

اور اُن سے اُس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے اور (ملک میں) اللہ ہی کا دین ہو جائے اور اگر وہ (فساد سے) باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں (کرنی چاہئیے)۔ادب کا مہینہ ادب کے مہینے کے مقابل ہے اور ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلا ہیں۔پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اُس پر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈرنے والوں کیساتھ ہے۔ (۲:۱۹۳ تا ۱۹۴)

جس طرح زندگی کی حفاظت کے لئے جارحیت کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے اسی طرح انسانوں کے اخلاقی حقوق کی حفاظت کے لئے بھی اس کی اجازت دی گئی ہے، خاص طور سے عقیدے اور دین کی آزادی، اظہار کی آزادی اور دین پر عمل کرنے کی آزادی کے لئے کیوں کہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے[۱۹۱:۲، ۲۱۷]۔اسلام مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ اپنا دین یا عقیدہ کسی پر تھوپنے کے لئے اس سے جنگ کریں، جیسا کہ جہاد کے بارے میں گمراہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔بلکہ مسلمانوں کو صرف عقیدے و دین کی آزادی کو یقینی بنانے کے لئے اور انسان و خدا کے درمیان حائل رکاوٹوں کو ہٹانے کے لئے جہاد کرنے کو کہا گیا ہے[نیز دیکھیں ۳۹:۸]۔

جب تک یہ راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے اور یہ حقوق لوگوں کو حاصل ہیں تب تک نہ مسلمانوں کو جنگ کی ضرورت ہے، نہ اس کی اجازت، چاہے وہ لوگ جن کو یہ آزادی ملی ہوئی ہے اسلام میں آنا اور مسلمان بننا پسند نہ کریں، کیوں کہ جنگ صرف ظلم و جبر کے خلاف ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں نے یہ ایک اچھا انتظام کر رکھا تھا کہ کچھ مہینوں کو مقرر کر لیا تھا جن میں وہ لڑائی نہیں کرتے تھے اور امن بنائے رکھتے تھے۔اس سے یہ فائدہ تھا کہ ایک دوسرے سے لڑتے رہنے والے قبیلے ان مہینوں میں کعبہ اقدس کی زیارت وطواف کے لئے مکہ جانے کا

سفر بے خوف وخطر کر سکتے تھے اور سالانہ جمگھٹ کے اس موقع پر تجارتی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی انجام دے سکتے تھے۔ لیکن اسلام سے پہلے باشندگان عرب ان مہینوں کا جتنا احترام کرتے تھے، اسلام قبول کر کے مسلمان بن جانے والے لوگ ان سے بھی زیادہ ان مقدس مہینوں کا احترام کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ تاہم انہیں یہ تعلیم دی گئی کہ اگر دشمن ان مقدس مہینوں کی احترام شکنی کرتے ہوئے ان پر حملہ کریں اور ان سے جنگ کریں تو انہیں بھی اجازت ہے کہ وہ ان سے لڑیں لیکن اللہ کی طے کی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اور اپنی طرف سے کوئی زیادتی اور جارحیت نہ کریں: ''ادب کا مہینہ ادب کے مہینے کے مقابل ہے اور ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلا ہیں۔ پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اُس پر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو'' [۲:۱۹۴]۔ چنانچہ، محض لڑنے کے لئے لڑنا یا اپنی سرحدوں کی توسیع کے لئے لڑنا یا اپنا دین تھوپنے کے لئے لڑنا اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، اور جب کبھی بھی اپنے دفاع کے لئے لڑائی کرنا ایک لازمی ضرورت بن جائے تو یہ لڑائی صرف انہیں لوگوں کے ساتھ ہے جو دوسری طرف سے لڑ رہے ہوں۔ لہذا، عام تباہی اور بلا امتیاز قتل و ہلاکت کے ہتھیاروں کا استعمال اور جنگ نہ کرنے والے لوگوں کو نقصان پہنچانا بھی اسلام کے اخلاقی اور قانونی اصولوں کے مطابق جائز نہیں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۪ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

(مسلمانو) تم پر (اللہ کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو ہو گا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تمہیں بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگی اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور (ان باتوں کو) اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (اے محمد ﷺ!) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہلِ مسجد کو اُس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر مقدور رکھیں تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر (کافر ہو) جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۲:۲۱۶ تا ۲۱۷)

یہ آیات صاف طور سے یہ بتاتی ہیں کہ لڑائی انسانی فطرت کے لئے کوئی خوشی اور راحت کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ انسانوں کو نفرت انگیزی اور نقصان سے بچانے کے لئے ایک آخری چارہ کار ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مادی یا اخلاقی نقصان سے بچانے کے لئے اپنے دفاع میں جنگ کرنے کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح، مقدس مہینوں میں جنگ کرنا جب ہر کوئی امن چاہتا ہو صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ زندگی، گھر اور دین کی آزادی کے احترام کے خلاف کوئی جارحانہ حرکت اور ظلم و زیادتی کو روکنا مقصود ہو۔ انسانی جان کا احترام کسی خاص وقت یا مقام کے احترام سے زیادہ اہم ہے اور ظلم و جارحیت کا جواب دفاعی اقدام سے دینا ضروری ہے کیوں کہ افراد اور سماج پر مستقل دہشت طاری رہنا وقتی اور فوری قتل سے زیادہ بڑی اور بری بات ہے۔ بے عملی اور کمزوری دکھانے سے ظالموں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ اسی لئے جنگ اگرچہ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ عمل ہے لیکن ایسی حالت کو بدلنے کے لئے جو اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور ناپسندیدہ ہو جنگ کرنا ضروری اور جائز ہوتا ہے۔ تاہم ایک جائز اور ضروری جنگ بھی عملاً جائز طریقے سے ہو، اور جنگ کا نشانہ صرف وہی لوگ بنیں جنھوں نے ظلم اور جارحیت کا ارتکاب کیا ہو اور جنگ نہ کرنے والے لوگ اس کی زد میں نہ آئیں۔ ایک جائز جدوجہد، استقامت اور پامردی کے ذریعے مومن دشمن پر جلد ہی غالب آجائیں گے اور ظالم حملہ آور اس دنیا میں بھی شکست کھائیں گے اور آخرت میں بھی نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۷۴ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝۷۵ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝۷۶ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ

اور تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور اُن بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس شہر سے، جس کے رہنے والے ظالم ہیں، نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔ جو مومن ہیں وہ تو اللہ کیلئے لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ بتوں کیلئے لڑتے ہیں سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو (اور ڈرو مت) کیونکہ شیطان کا داؤ بودا ہوتا ہے۔ بھلا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو (پہلے یہ) حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو (جنگ سے) روکے رہو اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو پھر جب اُن پر جہاد فرض کر دیا گیا تو بعض لوگ اُن میں سے لوگوں سے یوں ڈرنے لگے جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بڑبڑانے لگے کہ اے اللہ! تو نے ہم پر جہاد (جلد) کیوں فرض کر دیا تھوڑی مدت اور ہمیں کیوں مہلت نہ دی (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے اور بہت اچھی چیز تو پرہیزگار کیلئے (نجاتِ) آخرت ہے۔ اور تم پر دھاگے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (اے جہاد سے ڈرنے والو!) تم کہیں رہو موت تو تمہیں آ کر

لَوْ لَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۠ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۠ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

رہے گی خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو اور اُن لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تم سے) کہتے ہیں کہ یہ آپ کی وجہ سے (ہمیں پہنچی) ہے، کہہ دو کہ (رنج و راحت) سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟ (اے آدم زاد!) تمہیں جو فائدہ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامتِ اعمال کی) وجہ سے ہے اور (اے محمد!) ہم نے تمہیں لوگوں (کی ہدایت) کیلئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور (اس بات کا) اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بیشک اُس نے اللہ کی فرمانبرداری کی اور جو نافرمانی کرے تو اے پیغمبر تمہیں ہم نے اُن کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ اور یہ لوگ منہ سے تو کہتے ہیں کہ (آپ کی) فرمانبرداری (دل سے) منظور ہے لیکن جب تمہارے پاس سے چلے جاتے ہیں تو ان میں سے بعض لوگ رات کو تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور جو مشورے یہ کرتے ہیں اللہ اُن کو لکھ لیتا ہے، تو ان کا کچھ خیال نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی کارساز کافی ہے۔ (۴:۷۴ تا ۸۱)

ان سے پہلے جو آیات نقل کی گئی تھیں یعنی آیت ۲:۱۹۰ اور ۹۴ وہ اس بات کو وضاحت سے بتاتی ہیں کہ مسلمانوں کو صرف زیادتی کرنے والوں کے ساتھ لڑنا چاہئے اور ان لوگوں سے اپنا دفاع کرنا چاہئے جو ان کے خلاف ناحق جنگ چھیڑتے ہیں۔ درج بالا آیات یہ بتاتی ہیں کہ مسلمان اپنے دین وعقیدے اور اس کے اظہار کے حق کی حفاظت کے لئے بھی ظلم وزیادتی کرنے والوں سے لڑ سکتے ہیں۔ اگر قتل وخوں ریزی کا نشانہ بنائے جانے والوں کے لئے اپنا دفاع کرنا برحق ہے تو ظلم و جبر سے اپنا دفاع بھی جائز ہے کیوں کہ یہ وقتی طور پر کسی کے مارے جانے سے زیادہ بدتر حالت ہے کیوں کہ یہ انسانوں پر ایک مستقل حملہ اور جارحیت ہے اور انسانوں کے حقوق کو تلف کرنا ہے [۲:۹۱، ۲۱۷]۔ لہذا، ظلم و جبر کے خلاف لڑنا جارحیت سے اپنا دفاع کرنے کی نسبت کم اہم نہیں ہے [۲:۱۹۳؛ ۸:۳۹]، اور مجبور و بے کس مرد، عورتیں اور بچے اپنا دفاع کرنے کا حق رکھتے ہیں اور ایسے مجبوروں کی مدد ان لوگوں کو کرنا چاہئے جو ان کی مدد وحمایت کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ ان مددگاروں وحمایتوں کو جو بھی خطرہ مول لینا پڑے لیکن ان کا مقصد اور ان کی اخلاقی فضیلت برائی کی طاقت پر حاوی ہو جائے گی اور آخر کار انہیں ہی کامرانی ملے گی۔

انسان کی فطرت تو یہ ہے کہ وہ امن اور سلامتی چاہتا ہے، لیکن بعض اوقات سماج کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انصاف کے لئے جدوجہد میں لگ جائے جب دیکھے کہ انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں، اور اس صورت میں امن اور سلامتی کو ترجیح دینے کا مطلب ہوگا ذلت

وخواری اور جبر وستم کو قبول کرنا۔ قرآن اگرچہ اصولی طور پر امن پر زور دیتا ہے لیکن یہ کبھی ناانصافی یا ظلم و جبر کو گوارا نہیں کرتا اور لوگوں کو تحریک دیتا ہے کہ بزرگ، کمزور اور دیگر ان تمام لوگوں کا دفاع کریں جو ظلم و جبر کا نشانہ بن رہے ہوں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انصاف کی جدوجہد کرنے والوں کی مدد کی جائے اور اس لئے مومنوں کو ہمیشہ اپنے ایمان کے تقاضوں کے تئیں حساس و بیدار رہنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کا ایمان ظلم و ناانصافی کے وقت اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے نماز اور صدقات کی ادائیگی کو نہیں کہتا۔ اللہ کے راستے میں جدوجہد کرنا یعنی جہاد کا مطلب دراصل ''انسانی حقوق کی حفاظت اور کمزور و مجبور لوگوں کی مدد وحمایت'' کرنا ہے اور اس کا مطلب کسی بھی دوسروں پر اپنا دین تھوپنا نہیں ہے، کیوں کہ قرآن کا اصول یہ ہے کہ ''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے''[۲۵۶:۲]۔ جہاد کا ترجمہ ''مقدس جنگ'' سے نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ''مقدس جنگ'' کا تصور ''جہاد'' کے تصور سے الگ ہے، محض زمین کی توسیع کے لئے جنگ کرنا اور لوگوں کا غلام بنانا اسلامی قانون (شریعت) میں جائز نہیں ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝۸۸ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۝۸۹ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝۹۰ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ

تو کیا سبب ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو حالانکہ اللہ نے ان کو ان کے کرتوتوں کے سبب اوندھا کر دیا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اُس کو رستے پر لے آؤ؟ اور جس شخص کو اللہ گمراہ کر دے تم اُس کیلئے کبھی راستہ نہیں پاؤ گے۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں (اسی طرح) تم بھی کافر ہو کر (سب) برابر ہو جاؤ۔ تو جب تک وہ اللہ کی راہ میں وطن نہ چھوڑ جائیں اُن میں سے کسی کو دوست نہ بنانا اگر (ترکِ وطن کو) قبول نہ کریں تو اُن کو پکڑ لو اور جہاں پاؤ قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو اپنا رفیق اور مددگار نہ بناؤ۔ مگر جو لوگ ایسے لوگوں سے جا ملے ہوں جن میں اور تم میں (صلح کا) عہد ہو یا اس حال میں کہ اُن کے دل تمہارے ساتھ یا اپنی قوم کیساتھ لڑنے سے رک گئے ہوں، تمہارے پاس آ جائیں (تو احتراز ضرور نہیں) اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کو تم پر غالب کر دیتا تو وہ تم سے ضرور لڑتے پھر اگر وہ تم سے (جنگ کرنے سے) کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں اور تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں تو اللہ نے تمہارے لئے اُن پر (زبردستی کرنے کی) کوئی سبیل مقرر نہیں کی۔ تم کچھ اور لوگ ایسے بھی پاؤ گے جو یہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں لیکن جب فتنہ انگیزی کو بلائے جائیں تو اُس میں اوندھے منہ گر پڑیں تو ایسے لوگ اگر تم سے (لڑنے سے) کنارہ کشی نہ کریں اور نہ تمہاری طرف

عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾

(پیغام) صلح بھیجیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو ان کو پکڑ لو اور جہاں پاؤ قتل کر دو ان لوگوں کے مقابلے میں ہم نے تمہارے لئے سند صریح مقرر کر دی ہے۔(۴:۸۸ تا ۹۱)

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٩٢﴾ وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿٩٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

اور کسی مومن کو شایاں نہیں کہ مومن کو مار ڈالے مگر بھول کر اور جو بھول کر بھی مومن کو مار ڈالے تو (ایک تو) ایک مسلمان غلام آزاد کر دے اور (دوسرے) مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے ہاں اگر وہ معاف کر دیں (تو اُن کو اختیار ہے) اگر مقتول تمہارے دشمنوں کی جماعت میں سے ہو اور وہ خود مومن ہو تو صرف ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو تو وارثانِ مقتول کو خون بہا دینا اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھے یہ (کفارہ) اللہ کی طرف سے (قبول) توبہ (کیلئے) ہے اور اللہ (سب کچھ) جانتا (اور) بڑی حکمت والا ہے۔ اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کیلئے اُس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مومنو! جب تم اللہ کی راہ میں باہر نکلا کرو تو تحقیق سے کام لیا کرو اور جو شخص تم سے سلام علیک کرے اُس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو اور اس سے تمہاری غرض یہ ہو کہ دنیا کی زندگی کا فائدہ حاصل کرو، پس اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔ تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا تو (آئندہ) تحقیق کر لیا کرو اور جو عمل تم کرتے ہو اللہ کو سب کی خبر ہے۔ جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے (اور لڑنے سے جی چراتے) ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے وہ اور جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے اور (گو) نیک وعدہ سب سے ہے لیکن اجرِ عظیم کے لحاظ سے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں فضیلت بخشی ہے۔ (یعنی) اللہ کی طرف سے درجات میں اور

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَ قَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

بخشش میں اور رحمت میں۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا (اور) مہربان ہے۔ جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز و ناتواں تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کا ملک فراخ نہیں تھا کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہی۔ ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔ قریب ہے کہ اللہ ایسوں کو معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا (اور) بخشنے والا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ جائے وہ زمین میں بہت سی جگہ اور وسعت پائے گا اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اس کو موت آ پکڑے تو اُس کا ثواب اللہ کے ذمے ہو چکا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۴:۹۷ تا ۱۰۰)

ان آیات میں پہلی چار آیات مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتی ہیں کہ منافقوں سے کس طرح نمٹیں جو مومن کا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ اصل میں وہ مومن نہیں ہیں، اور یہ منافقت مدینہ میں کھل کر سامنے آئی اور مدینہ کے پاس رہنے والے بدوؤں میں ظاہر ہوئی [۹:۷۵،۱۰۱]، جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ کو اللہ کا نبی ماننے کے ساتھ ساتھ اپنا رہبر و رہنما تسلیم کیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں وہ ایمان لائے جب کہ جھوٹ بول رہے ہیں [۶۳:۱ تا ۵]، اور ''ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے گئے'' [۴:۱۳۷]، ''دیکھتے رہتے ہیں اگر اللہ کی طرف سے تمہیں فتح ملے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو (فتح) نصیب ہو تو (اُن سے) کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے اور تم کو مسلمانوں (کے ہاتھ) سے بچایا نہیں؟ تو اللہ تم میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا'' [۴:۱۴۱]، ''بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ اُن کی طرف'' [۴:۱۴۳]۔

یہ خودغرض موقع پرست لوگ مسلمانوں کے لئے اور مدینہ میں قائم ہونے والی اولین اسلامی ریاست کے لئے بہت خطرناک تھے لیکن وہ اندر سے باغی تھے اور قرآن ان کی غداری کی علامتیں ظاہر کرتا ہے [۳:۱۶۷ تا ۱۶۹؛ ۴:۱۳۸ تا ۱۴۲؛ ۸:۴۹؛ ۹:۴۲ تا ۶۷، ۷۴ تا ۸۸؛ ۷۰۱ تا ۱۱۰؛ ۳۳:۱۲؛ ۴۷:۲۵ تا ۳۲]۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مسلمانوں کا یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کی نیت کا فیصلہ نہ کیا کریں یا ان سے تعلق نبھاتے وقت مبہم غیر واضح ثبوتوں یعنی گمان پر نہ چلیں۔ بلاشبہ انہیں ہوشیار رہنا چاہئے اور ایسے فریبیوں کی مدد پر انحصار نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ منافق جب تک مسلمانوں کے خلاف کھل کر نہ آئیں اور امن کی بات ہی کرتے رہیں اس وقت تک مسلمان بھی ان

کے ساتھ پرامن طریقے سے پیش آئیں، اگرچہ ان کے مقاصد اور ان کے جذبات سے وہ پریشانی محسوس کرتے ہوں۔

ہجرت کے بعد جو لوگ مدینہ میں نہیں رہتے تھے انہیں مدینہ میں آنے کی حاجت تھی۔ یہ ان لوگوں کے لئے خاص طور سے ضروری تھا جن پر منافق ہونے کا شبہ تھا تاکہ وہ اپنا ایمان اور خلوص ثابت کریں اور دشمن سے سازباز کی صورت میں آسانی سے پہچانے جاسکیں۔ اگر مسلمانوں کے خلاف لڑائی کرنے یا ان کو نقصان پہنچانے کے ٹھوس ثبوت فراہم ہوں تو یہ دھوکے باز لوگ نقصان پہنچانے والوں میں شمار ہوں گے اور کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک [۴:۱۴۵] مانے جائیں گے جن کا انھوں نے کسی موقع پر ساتھ دیا [۴:۱۳۹]، اور ان کے ساتھ مل کر انھوں نے مسلمانوں سے لڑائی کی [۹:۳۷]

اگلی دو آیات منافقوں سے لڑتے وقت ایک حقیقی مومن کو غلطی سے قتل کرنے کے متعلق ہیں۔ ایسی غلطی خارج از امکان نہیں خاص طور سے ایک قبائلی سماج میں، جہاں پورا قبیلہ کسی ایک خاص علاقہ میں ہی بستا تھا، اور قبیلہ کا سردار اور قبیلے کے اکثر لوگ مسلمانوں کے مخالف ہوں، جب کہ اس قبیلے میں کچھ افراد ایمان والے ہوں یا لڑائی سے الگ تھلگ ہوں۔ عام اسلامی اصول جنگ یہ ہے کہ لڑائی صرف انہیں لوگوں سے ہوگی جو برسر جنگ ہوں گے اور جو جنگ میں شامل نہ ہوا سے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا [۲:۱۹۰]، اور یہاں منافقوں کے خلاف جنگ کے معاملے میں ایک خاص تنبیہ بھی کی گئی ہے، کیوں کہ ان کے درمیان حقیقی اہل ایمان بھی موجود ہوسکتے ہیں۔ یہ توجہ طلب بات ہے کہ قرآن غلطی سے کسی مومن کے قتل کی سزا کے طور پر ایک غلام آزاد کرنے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دینے کی تاکید کرتا ہے۔ اگر مقتول مومن ایسے قبیلے سے ہو جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہو، تب خوں بہا دینا بے مطلب ہوگا، اور ایسے معاملے میں سزا صرف ایک غلام آزاد کرنا ہوگی۔

معروف مفسر قرآن النصفی [م۔ ۵۳۷ ہجری بمطابق ۱۱۴۲ عیسوی]، آیت ۹۲:۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ایک غلام آزاد کرنے کا مطلب دراصل غلام کے سبب ایک تباہ ہوچکی انسانی شخصیت کو نئی زندگی دینے کے مترادف ہے، اور یہ ایک ممکن طریقہ ہے کسی بے قصور انسان کی ہلاکت کی تلافی کرنے کا، کیوں کہ مقتول کو تو پھر سے زندہ کرنا ممکن ہے نہیں۔ اس بات کی تائید غلام آزاد کرنے کے لئے قرآن میں استعمال کئے الفاظ ''گردن چھڑانا'' سے بھی ہوتی ہے [۲:۱۷۷؛ ۹۲:۴؛ ۸۹:۵؛ ۶۰:۹؛ ۵۸:۳؛ ۹۰:۱۳]، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ غلامی گردن میں پڑا ہوا ایک طوق ہے جو انسان کو اس کی اپنی مرضی اور ارادے وخواہش کی آزادی سے محروم کردیتی ہے۔ عربی میں، خاص طور سے قرآن کی اصطلاح میں گردن کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس لحاظ سے قتل کا مطلب گردن کاٹ دینا یا گلا دبا دینا ہے، جیسے دوسری زبانوں میں اسے گلا کاٹنا کہا جاتا ہے۔ اس طرح گردن چھڑانے سے قرآن کی مراد انسان کی جان بچانا، یا اسے نئی زندگی دینا ہے۔

مفسر موصوف نے غلامی کو عرب کی سماجی زندگی میں کفر وشرک پر مبنی جاہلانہ اور غیر انسانی طور طریقوں کی باقیات قرار دیا ہے۔ یہ چیز ان لوگوں پر بالکل عیاں تھی جو قرآن کا علم رکھتے تھے کہ غلامی کو ایک عارضی اور عبوری حالت کے طور پر ہی قبول کیا گیا تھا جسے ختم کرنے کے لئے عوام کی اجتماعی کوشش اور تعاون ضروری تھا اور اسی لئے انہیں حکم دیا گیا تھا کہ گناہوں کے کفارے کے طور پر یا صدقہ کے طور پر غلام آزاد کریں [۲:۱۷۷؛ ۹۰:۱۳] اور حکام کو یہ ذمہ داری دی گئی ہے کہ وہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے ریاستی خزانے سے خرچ کریں [۹:۶۰]۔ اس عبوری دور کے دوران، ایک حدیث کے مطابق، مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اپنے غلام کو وہی کھلائیں جو خود کھاتے ہیں اور وہی پہنائیں جو خود پہنتے ہیں اور ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیں، اور اگر کوئی مشقت والا کام ان سے کرائیں تو اس میں

ان کی مدد بھی کریں[بہ روایت بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ]۔قرآن نے غلامی کے رواج کی شروعات نہیں کی اور نہ اسے اپنے اصول وقانون کے طور پر طے کیا ہے، قرآن نے ''غلام'' اور غلامی کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا، اس کے بجائے قرآن میں یہ کہا گیا کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر رہا کر دو[۴۷:۴]۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عبدُ'' (غلام) نہ کہا کرو بلکہ میرا لڑکا یا میری لڑکی کہا کرو[بخاری، مسلم، ابن حنبل اور ابوداؤد]۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ مسلمان غلامی کا باقاعدہ خاتمہ کرنے کی ذمہ داری پوری نہیں کر سکے اور غلامی کے مکمل خاتمے کا اعلان کرنے میں پہل کرنے والے نہ بن پائے کہ جو ''ناانصافی اور جاہلیت کی باقیات میں سے تھی''۔

چوں کہ منافقوں کے خلاف جنگ میں شک کی وجہ سے کسی مومن کا قصداً قتل ہوجانا ایک سنگین بات ہے، اور اس کی سزا غلطی سے کسی کو قتل کر دینے سے بھی زیادہ ہے، اس لئے مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ جنگ کے دوران پوری طرح ہوشیار و چوکنا رہیں اور جو کوئی بھی امن کی علامت کا اظہار کرے جس میں سلام کرنا بھی شامل ہے اسے کوئی نقصان پہنچانے سے اپنے آپ کو روکیں۔'' جب مسلمانوں کو منافقوں سے جنگ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس وقت روک لینا ہے جب منافقین خود کوئی جارحیت نہ کر رہے ہوں، اور اگر انہیں دشمن فریق کے ان لوگوں کے خلاف بھی ہاتھ نہیں اٹھانا ہے جو عملا جنگ میں شامل نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ انہیں اس شخص سے بھی اپنا ہاتھ روک لینا ہے جو امن کی علامت دکھائے اور نہ لڑنے کا اشارہ دے۔ مسلمان ڈرانے اور دہشت زدہ کرنے کے لئے یا مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ نہیں کرتے بلکہ ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں اور اپنے انسانی حقوق کے لئے لڑتے ہیں۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ جنگ کے اسباب بہت محدود ہیں، بلکہ جنگ کرنے کے اصول وضوابط بھی سخت ہیں۔ اگرچہ اسلام مومنوں کو ملک گیری کے لئے، اور دوسروں پر اسلام کو تھوپنے کے لئے جنگ کرنے کو نہیں کہتا بلکہ لفظ جہاد سے عام طور سے جو مطلب نکالا جاتا ہے اس کے برعکس یہ ان لوگوں کو اپنے حق کے لئے لڑنے پر ابھارتا ہے جو ناانصافی کا شکار بنائے جاتے ہیں۔ جو لوگ ظلم و جبر کو برداشت کرتے ہیں اور اپنے انسانی حقوق تلف کئے جانے کو قبول کر لیتے ہیں وہ ''خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں'' [۴:۹۷]۔ ایسے لوگوں کو اپنے انسانی وقار کی حفاظت کے لئے، جس سے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو نوازا ہے [۱۷:۷۰]، سخت جدوجہد کرنی چاہئے۔ کسی بھی انسان کے لئے اس کا کوئی عذر نہیں ہے کہ ظلم وستم اور ذلت کو قبول کرے، الا یہ کہ وہ اس سے نکلنے کا کچھ کرنے کے راستہ ہی نہ پاتا ہو اور پوری طرح بے دست و پا ہو، ایسے مجبور و بے کس عورتوں اور بچوں کے لئے بھی یہ ہے کہ ''امید ہے کہ اللہ انہیں معاف کر دے''، کیوں کہ وہ ہر ایک فیصلہ اس کی استعداد کے مطابق کرے گا، اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور ساتھ ہی رحم اور مغفرت کرنے والا ہے۔ چوں کہ اللہ بنی آدم کو خشکی اور تری میں سواری دی ہے [۱۷:۷۰] اس لئے جن لوگوں کو ان کے وطن میں ظلم و جبر کا سامنا ہو اور اپنے حقوق کا دفاع کرنے کی طاقت نہ ہو، تو وہ کم سے کم دوسری جگہ تو جا سکتا ہے، اور زمین کو اللہ نے وسیع کیا ہے اور بہت سے مقامات انسان کی جائے پناہ بن سکتے ہیں، جہاں اسباب زندگی زیادہ فراہم ہوں اور انسانی حقوق زیادہ محفوظ ہوں۔ قرآن میں ظلم کو قبول کرنے کی مذمت کی گئی ہے جس طرح ظلم کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ کیوں کہ ناانصافی کی حالت کو بدلنا چاہئے، اور ظلم و جبر کرنے والوں کو چیلنج کرنا اور ان سے ٹکرانا چاہئے۔ یہ ہے وہ جہاد جس کی قرآن تعلیم دیتا ہے، وہ نہیں جس کا دعویٰ ہوس ملک گیری کو پورا کرنے والے حملہ آور کریں۔ وہ تمام لوگ جو ایسے بے یار و مددگار لوگوں کی مدد کرنے پر قادر ہوں اور انہیں ان کی مصیبت سے نکلنے کا راستہ دکھا سکتے ہوں انہیں یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ جتنی جلد ایسا کر سکتے ہوں کریں [۴:۷۵ تا ۷۶]، کیوں کہ یہ بہت شرم کی بات ہے کہ ایسے بے یار و مددگار لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور انہیں ذلت و مظلومی سے نجات دلانے کے لئے تمام ذرائع سے بھرپور کوشش نہ کی جائے۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

اور اُن لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ ہی کے لئے ہو جائے اور اگر باز آ جائیں تو اللہ اُن کے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر رُوگردانی کریں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے (اور) وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔ اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لُوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہلِ قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے، اگر تم اللہ پر اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن (یعنی جنگ بدر میں)، جس دن دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہو گئی، اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمائی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
(۸:۳۹ تا ۴۱)

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۷﴾

جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجتمندوں کے اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولتمند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۵۹:۷)

مسلمان ظلم و ناانصافی کو روکنے کے لئے اور تمام لوگوں کے لئے عقیدہ و ایمان کی آزادی کی حفاظت کے لئے جنگ کرتے ہیں کیوں کہ ایمان و عقیدے کا معاملہ ہر فرد کے لئے صرف اس کے اور خدا کے درمیان ہے [دیکھیں آیات ۲:۱۹۳ تا ۱۹۴ اور اس کی تشریح]۔ لیکن اپنا دین کسی پر تھوپنے کے لئے کسی بھی طرح سے کوئی لڑائی ان کے لئے نہیں ہے۔ یہ بات درج بالا آیت ۸:۳۹ میں پوری وضاحت اور اصرار سے کہہ دی گئی ہے، جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ دین کا پورا معاملہ ہر ایک کے لئے اس کے اور خدا کے درمیان کا معاملہ بن جائے۔ اگر ظالم لوگ انسان اور خدا کے درمیان راستے میں حائل ہونے پر مصر ہوں اور لوگوں کو اس پر مجبور کریں کہ وہ کیا مانیں اور کیا نہ مانیں تب انسانوں کے واسطے عقیدے کی آزادی کو یقینی بنانے کے لئے جدوجہد کرنا لازمی ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ حائل رکاوٹیں دور ہوں اور فتنہ ختم ہو جائے مسلمانوں کو جنگ روک دینا ہوتی ہے چاہے فریق مخالفت کا آئندہ منصوبہ جو کچھ بھی ہو، کیوں کہ اللہ ان پر نظر رکھے ہوئے ہے کہ آگے وہ کیا کرتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کو جنگ میں دشمنوں کا کچھ مال ہاتھ لگے تو قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اس کا پانچواں حصہ حکومت کو دیا جائے تاکہ وہ سماج

کے ضرورت مندوں لوگوں کے لئے اسے خرچ کرے۔اس سے اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ مسلمان ایک مقصد کے لئے لڑتے ہیں،اور یہ عوام کے لئے ہوتی ہے،مجاہد صرف مال غنیمت حاصل کرنے اور اپنے مفاد کے لئے نہیں لڑتا۔اللہ کے حصے سے مراد ہے سماج کا حصہ،کسی فرد خاص کا حصہ نہیں۔جو لوگ اس پانچویں حصے کے حق دار ہوتے ہیں جو جنگ میں شہید یا زخمی ہونے والے مجاہدین کے گھر والے،قریبی عزیزوں کے علاوہ غریب،مسکین اور اپنے گھروں سے دور لوگ یعنی مسافر ہوتے ہیں۔اور باقی چاروں حصے اکثر فقہاء کی رائے میں مجاہدین (فوجیوں) میں تقسیم کئے جائیں گے،لیکن الماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ امام مالک نے امیر المومنین (حاکم ریاست) کو اس کا مختار مانا ہے کہ وہ ان چاروں حصوں عوام کے مفاد میں کیسے خرچ کریں،اور اس کے لئے آیت ۸:۱ کو دلیل بنایا ہے جس میں مال غنیمت کو اللہ اور اس کے رسول کا حق قرار دیا گیا ہے،اور رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ اختیار آپ کے خلفاء کو یعنی اسلامی ریاست کے امیر کو ملتا ہے۔

اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مجاہدین کسی پیشہ وارانہ فوج کا حصہ نہیں تھے،بلکہ وہ افراد تھے جو عام حالات میں اپنے روزگار کا کوئی نہ کوئی ذریعہ رکھتے تھے،اور جنگ کے وقت رسول اللہؐ کی آواز پر دشمن سے لڑنے کے لئے چلے آتے تھے۔ہر فرد خود اپنے ہتھیار اور گھوڑے (یا اونٹ) لے کر آتا تھا۔اس لحاظ سے یہ پوری طرح مناسب تھا کہ جنگ میں جو مال غنیمت ہاتھ آئے وہ ان لڑنے والوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔جب اسلامی ریاست کی مستقل فوج بن گئی تو اس کے بعد ہم نے مال غنیمت کو لڑنے والوں میں تقسیم کرنے کے بارے میں زیادہ نہیں سنا،اور قرآن میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ یہ عمل جاری رکھا جائے۔کچھ معاصر فقہاء جیسے مصطفیٰ الزرقاء کا خیال ہے کہ پانچ میں سے چار حصے ریاست کے حکام کی صواب دید کے مطابق فوجی اور سول مقاصد کے لئے استعمال کئے جانے چاہئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

مومنو! جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ مراد حاصل کرو۔اور اللہ اور اُس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا اور صبر سے کام لو کہ اللہ صبر کرنے والے کا مددگار ہے۔اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو اِتراتے ہوئے (یعنی حق کا مقابلہ کرنے کیلئے) اور لوگوں کو دکھانے کیلئے گھروں سے نکل آئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو یہ اعمال کرتے ہیں اللہ اُن پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۸:۴۵ تا ۴۷)

جو لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے اور جہاد کرتے ہیں ان کے لئے استقامت،اللہ کا تقویٰ،اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت،صبر، مستقبل مزاجی اور غرور و تکبر سے پرہیز وغیرہ اوصاف ان کے اخلاقی ہتھیار ہیں،جن سے وہ ظلم و ستم کا مقابلہ کرتے ہیں اور مظلوم مردوں وعورتوں اور بچوں کی مدد کرتے ہیں [۴:۷۵]،اور انسانی وقار کی حفاظت کرتے ہیں۔ایسے مومنوں کو یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اپنے دشمنوں کی

اخلاقی ناکامیوں سے بچیں، کیوں کہ یہ اخلاقی فضیلت ہی ان کی جدوجہد اور قربانیوں کا امتیاز ہے اور ان کی جدوجہد کی معنویت ہے۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾

اگر تمہیں کسی قوم سے دغابازی کا خوف ہو تو (اُن کا عہد) انہیں کی طرف پھینک دو (اور) برابر (کا جواب دو) کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ دغابازوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (۵۸:۸)

وعدوں کو پورا کرنا اور صلح کا لحاظ کرنا ضروری ہے جب تک کہ دوسرا فریق بھی اسی پر قائم ہو۔ مسلمانوں کو یہ ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے اور اپنے عہد و پیمان کی جواب دہی کے لئے وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ یہ احساس اور ایمان و یقین ان کے لئے عہد و پیمان کو نبھانے کی ایک ضمانت بن جاتا ہے اور یہ ضمانت کسی بھی دنیاوی بندوبست سے کہیں زیادہ موثر ہے۔ البتہ اگر دوسرا فریق عہد کے خلاف ورزی کرے یا کرتا رہے تو صلح کو اپنی طرف سے قائم رکھنا بے مطلب بات ہوگی، اور خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ دھوکہ اور سازش کے مضبوط شواہد موجود ہوں۔ جب صلح کے خلاف ورزی کے اقدامات ہونے لگیں اور اس کا جواب دینا ضروری ہو جائے تو یہ جوابی کارروائی اعلانیہ ہونی چاہئے اور برابر کے درجے میں ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو نہ تو دھوکہ اور فریب سے کام لینا چاہئے اور نہ زیادتی کرنا چاہئے کیوں کہ دو غلط باتیں مل کر ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ مسلمان ہمیشہ انصاف اور اخلاق پر قائم رہیں دشمنی اور دھوکے کے مقابلے میں بھی ورنہ ان کی جدوجہد اپنے مقصد سے دور چلی جائے گی اور غیر اخلاقی طریقوں سے اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

وَ اَعِدُّوۡا لَہُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّۃٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡہِبُوۡنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَ عَدُوَّکُمۡ وَ اٰخَرِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَہُمۡ ۚ اَللّٰہُ یَعۡلَمُہُمۡ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ یُوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾ وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَہَا وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۱﴾ وَ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡۤا اَنۡ یَّخۡدَعُوۡکَ فَاِنَّ حَسۡبَکَ اللّٰہُ ؕ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۲﴾ۙ وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۳﴾

اور جہاں تک ہو سکے قوت (نشانہ بازی) سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے اُن کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی اور تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا ذرا نقصان نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اُس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو کچھ شک نہیں کہ وہ سب کچھ سنتا (اور) جانتا ہے۔ اور اگر یہ چاہیں کہ تمہیں فریب دیں تو اللہ تمہیں کفایت کرے گا وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی مدد سے اور مسلمانوں (کی جمعیت) سے تقویت بخشی۔ (۶۰:۸ تا ۶۳)

پرامن لوگوں کو کچھ لوگ کمزور سمجھتے ہیں، ایسے معاملے میں ان کے پرامن رویے کا غلط مطلب نکالا جاتا ہے اور اس سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں کی طرف سے ظلم و زیادتی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ مسلمانوں پر جو لوگ حال یا مستقبل میں حملہ کرنے کی سوچیں یا سوچ سکتے ہوں انہیں اس سے باز رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر کے امن کو برقرار رکھنے کی جستجو ہونی چاہئے۔ لیکن امن کی طرف میلان کے کسی بھی اظہار کا جواب بھی ایسا ہی ہونا ضروری ہے، اور مسلمانوں کو اللہ پر توکل کرنا چاہئے، اور اگر انہیں اس میلان کا تھوڑا سا اشارہ بھی ملے، کیوں کہ دوسروں کے بارے میں کوئی فیصلہ ظاہری شہادت کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ کسی دھوکہ فریب کا شبہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو اس کا سامنا کرنے کے لئے اخلاقی، مادی اور انسانی وسائل سے تیار رہنا چاہئے کہ جب کبھی بھی زیادتی کا کوئی اقدام فریق مخالف کی طرف سے ہو تو اس کا سامنا کیا جا سکے۔ لہٰذا امن کی کسی معقول پیش کو مسترد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان اللہ پر اور اس کی مدد نیز اس کی طرف سے ملنے والے اجر وصلہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس لئے انہیں اپنے انسانی وسائل کو ان کی اعلیٰ اخلاقی تربیت، حوصلہ اور اعتماد و اتحاد کے ساتھ نیز تمام ممکن مادی قوت کے ساتھ ہمیشہ تیار رکھنا چاہئے تاکہ ان لوگوں کو جارحیت سے باز رکھ سکیں جو ان کے دشمن بن سکتے ہیں۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝۳۴

اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔ (۲۷:۳۴)

جب حضرت سلیمان علیہ السلام (حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے) جنہیں اللہ نے نبی اور بادشاہ دونوں بنایا کو سبا کی ملکہ اور اس کے عوام کے بارے میں معلوم ہوا جو کہ اللہ کے بجائے سورج کی پوجا کرتے تھے، تو انھوں نے ملکہ کو اللہ رحمان و رحیم کے نام سے ایک خط بھیجا اور ملکہ و اس کے لوگوں کو دعوت دی کہ ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کی ہدایت کے تابع ہو جائیں۔ اس ہوشیار ملکہ نے جب یہ معاملہ اپنے درباریوں کے سامنے رکھا اور ان سے مشورہ طلب کیا تو انھوں نے ملکہ کو بھروسہ دلایا کہ ان کے پاس سلیمان کا مقابلہ کرنے کی بھرپور طاقت ہے لیکن ملکہ جو بھی فیصلہ کریں وہ اسی پر عمل کریں گے۔ عقل مند ملکہ نے اپنے لوگوں کو یہ توجہ دلائی کہ طاقت سے مقابلہ کرنے میں شکست کا بھی امکان ہے اور ایسی صورت میں طاقت جاتی رہے گی، اور فتح مند بادشاہ جب بستیوں میں داخل ہوتے ہیں تو بستیوں کو برباد کر دیتے ہیں اور بستی والوں کو ذلیل کرتے ہیں۔ ملکہ کا جو بیان قرآن نے صاف صاف نقل کیا ہے وہ توسیعی پالیسیوں کی مذمت کو ظاہر کرتا ہے کہ توسیعی جوش و جذبہ ہمیشہ مادی اور اخلاقی تباہ کاری سے جڑا ہوا ہوتا ہے، اور یہ قرآن کے اس اصول کے مطابق ہے کہ اپنے دفاع کے لئے محدود اور جائز حد تک ہی طاقت کا استعمال کرنا چاہئے۔ [۲:۱۹۰، ۱۹۳ تا ۱۹۴؛ ۴:۷۵؛ ۲۲:۳۹ تا ۴۰]۔ یہاں ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن نے ملکہ سبا کو ایک عقل مند اور مدبر قائد کے طور پر پیش کیا ہے اور ایک ملک پر عورت کی قیادت و حکومت پر ڈھکی یا چھپی کوئی بھی تنقید نہیں کی ہے۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ؕ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝

جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہئیے یا کچھ مال لے کر یہاں تک کہ (فریقِ مقابل) لڑائی (کے) ہتھیار (ہاتھ سے) رکھ دے یہ (حکم یاد رکھو) اور اگر اللہ چاہتا تو (اور طرح) ان سے انتقام لے لیتا لیکن اس نے چاہا کہ تمہاری آزمائش ایک (کو) دوسرے سے (لڑوا کر) کرے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ (بلکہ) ان کو سیدھے رستے پر چلائے گا اور ان کی حالت درست کر دے گا۔ اور ان کو بہشت میں جس سے انہیں شناسا کر رکھا ہے داخل کرے گا۔ اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔ (۴۷: ۴ تا ۷)

نبی ﷺ اور اولین مسلمانوں کو اپنے زمانے میں جن حالات کا سامنا تھا ان میں دشمن کو طاقت کو پوری طرح توڑ دینے کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ ضروری ہوتی تھی، کیوں کہ لڑنے والے لوگ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتے تھے اور دوسری طرف یہ بھی آسان نہیں تھا کہ لڑنے والوں کو قید کر کے رکھا جائے اور ان کے رہنے سہنے کا اہتمام کیا جائے کیوں کہ قرآن نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے [۷۶: ۸]۔ اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا کہ لڑنے والوں کو قیدی بنا کر رکھنے کا بوجھ اٹھانے سے پہلے فیصلہ کن فتح حاصل کر لیں [اور آیات ۸: ۷، ۵۷، ۶۷] کو اس روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے]۔ لیکن درج بالا آیات میں ایک اہم بات یہ ہے کہ شریعت جنگی قیدیوں کو آخر کار رہا کرنے کا تقاضا کرتی ہے، چاہے مسلمان احسان کے طور پر خود اپنے آپ ہی انہیں رہا کر دیں یا دشمن فریق کے ساتھ معاملہ کر کے اور فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیں تا کہ قیدیوں کو فطری آزادی حاصل ہو۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلام نے غلامی کا رواج کبھی شروع نہیں کیا نہ غلامی کو کوئی قانونی حیثیت دی، بلکہ اس نے بحالت موجودہ عارضی طور پر اسے تسلیم کیا، جب کہ اپنے عام اصول کے تحت اسلام نے غلامی کے خاتمے کے راستے کھولے اور قرآن وسنت میں غلاموں کو رہا کرنے پر بار بار زور دیا گیا۔ لوگوں کے پاس جو غلام موجود تھے انہیں رہا کرنے کے لئے ہر طریقے سے ابھارا گیا، اور بیت المال سے غلاموں کو رہا کرنے پر مال خرچ کیا گیا [۲: ۱۷۷؛ ۹: ۶۰]۔ اس عارضی و عبوری دور میں جو غلام باقی تھے ان کے مالکوں کو ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی اور کہا گیا کہ جو خود کھائیں وہ انہیں کھلائیں اور جو خود پہنیں وہ انہیں پہنائیں اور زیادہ محنت کے کاموں میں ان کی مدد کیا کریں، چنانچہ اس وقت غلاموں کے مسلم آقاؤں نے یہی کیا، وہ ان کو اپنے کھانے میں شریک کرتے تھے اور ان کی ضروریات پوری کرتے تھے اور مشقت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے [بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ]۔ یہاں تک کہ مالک (آقا) کو اس سے منع کیا گیا کہ وہ اپنا غلام کہہ کر پکارے بلکہ میرا لڑا یا میرا لڑکی کہہ کر بات کیا کرے [بخاری، مسلم، ابن حنبل، ابو داؤد]۔ اس طرح غلام رکھنا ایک بوجھ بن جاتا ہے بجائے کسی شان

اور فائدے کے، کیوں کہ اس طرح اس سے مالکوں کو کوئی معاشی فائدہ نہیں ہوگا اور آخر کار اس کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ان اسلامی احکام وضابطوں کو اور رہنمائی کو نظر انداز کیا گیا، اور بعض مسلمان جنہیں غلاموں کی تجارت میں بہت فائدہ نظر آیا، اس دھندے میں مبتلا ہوئے اور دوسرے ملکوں سے غلاموں کو امپورٹ کرنے کا کاروبار میں لگے جو کہ شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہے کیوں کہ شریعت کسی بھی طرح سے اس کی اجازت نہیں دیتی بلکہ اس پر قدغن لگاتی ہے، شریعت تو جنگ میں بھی ان لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتی جو جنگ میں شامل نہ ہوں۔ جارحانہ جنگوں اور بادشاہی سلطنتوں کی توسیع کا دنیاوی رجحان اور عیش وعشرت کے طور طریقے شریعت سے انحراف کا نتیجہ تھے۔ اسی طرح بادشاہی اور استعماری سلطنتیں اور غلامی کا غیر انسانی وغیر مہذب رواج جدید زمانے تک چلا آیا۔ نئی دنیا یعنی امریکہ کی دریافت ہوئی جسے استعمار نے طاقت کے ذریعہ اپنی نوآبادی بنایا اور وہاں کے قدیم باشندوں کو بے رحمی سے وہاں سے نکال دیا گیا۔ پھر افریقہ سے لوگوں کو پکڑ کر لایا گیا اور انہیں غلام بنا کر رکھا گیا تاکہ ان کے خون اور پسینے سے اس نئی دنیا کی معیشت کو فروغ دیا جائے۔ پھر جب بھاپ کی جگہ توانائی کے نئے وسائل دریافت ہوگئے تو غلامی ایک غیر منافع بخش چیز بن گئی، اس لئے آخر کار اس کا خاتمہ ہوا۔ بدقسمتی سے مسلم حکمرانوں اور فقہاء نے اللہ کے دین کی منشاء مقصد کو سمجھنے کے بجائے اور غلامی کو جلد سے جلد بتدریج طریقے سے مکمل طور پر ختم کرنے کام کرنے کے بجائے صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھا، تاوقت یہ کہ جدید مغرب نے جب اس کا قانونی طریقے سے استیصال کر دیا تو انھوں نے بھی اس کی پیروی کی۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝۲۱ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ۝۲۲

اور مومن لوگ کہتے ہیں کہ (جہاد کی) کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی؟ لیکن جب کوئی صاف معنوں کی سورت نازل ہوا اور اس میں جہاد کا بیان ہو تو جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے تم ان کو دیکھو کہ تمہاری طرف اس طرح دیکھنے لگیں جس طرح کسی پر موت کی بیہوشی (طاری) ہو رہی ہو سو ان کے لئے خرابی ہے۔ (خوب کام تو) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کہنا (ہے) پھر جب (جہاد کی) بات پختہ ہو گئی تو اگر یہ لوگ اللہ سے سچے رہنا چاہتے تو ان کے لئے بہت اچھا ہوتا۔ (اے منافقو!) تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو ملک میں خرابی کرنے لگو اور اپنے رشتہ داروں کو توڑ ڈالو۔

(۴۷: ۲۰ تا ۲۲)

بعض مورخوں، خاص طور سے مغربی مورخین کے خیال کے برعکس، اولین زمانے میں اکثر مسلمان مادی یا روحانی مقاصد سے لڑنے پر کمربستہ نہیں رہتے تھے۔ قرآن بتاتا ہے کہ جب جنگ اپنے دفاع کے لئے ناگزیر ہو گئی تو بہت سے مسلمانوں کو اس طرف رغبت نہیں تھی اور قرآن نے ان لوگوں کو اچھی نیت کے ساتھ جنگ کے اس لازمی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اکسایا اور دلائل سے انہیں قائل کیا، جب کہ کچھ آیات میں بری نیت والوں بے نقاب کیا گیا[جیسے پہلی مثال کے لئے ۲: ۱۹۳، ۲۱۶ تا ۲۱۷ ل ۳: ۱۳۹ تا ۱۴۳، ۱۵۴ تا ۱۵۸؛

۴:۴۷ تا ۸۰، ۹۵ تا ۹۹؛ ۸:۵ تا ۸، ۱۵ تا ۱۶، ۴۵ تا ۴۶، ۶۵ تا ۶۶؛ ۹:۳۸ تا ۴۱، ۱۲۰ تا ۱۲۱؛ دوسری مثال کے لئے ۳:۱۶۷ تا ۱۶۸؛ ۴:۸۱؛ ۸:۴۹؛ ۹:۴۲ تا ۵۲ ۸۱ تا ۸۹، ۹۳ تا ۹۶؛ ۴۷:۲۰ تا ۲۱؛ ۴۸:۱۱ تا ۱۷]۔ درج بالا آیات جنگ سے اس گریز کی کیفیت پر بات کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ ایسا نہ کرنے سے زمین فساد سے بھر جائے گی اور اسلام نے جو نظم وضبط اور اتحاد پیدا کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۟

جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد کی اور ضد بھی جاہلیت کی تو اللہ نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا اور وہ اسی کے مستحق اور اہل تھے اور اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ (۴۸:۲۶)

یہاں اللہ کا تقویٰ رکھنے والے ایک مومن کی عہد برداری اور متوازن رویے کا موازنہ ایسے شخص رویے سے کیا گیا ہے جو خود پسندی میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنی انفرادی خواہشات یا قبیلے وگروہ کے طور طریقوں کی پیروی کرتا ہے۔ اخلاق اور رویے میں یہ فرق ان دونوں کے ایمان وعقیدے کے فرق کا نتیجہ ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والا انسان اللہ کی حکمت اور انصاف کی پابندی کرتا ہے اور اللہ کی حکمت و انصاف ہر ایک کے تعلق سے کسی بھی طرح کے بغض وعناد سے بالاتر ہے، جب کہ اس شخص کا رویہ جو اپنی خواہشات اور اپنے لوگوں کے جذبات کی پیروی کرتا ہے وہ جسے پسند کرتا ہے اس کی حمایت وتائید کرتا ہے اور جس سے بیر رکھتا ہے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ایسا شخص موڈی ہوتا ہے اور حمایت یا مخالفت میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہے، وہ کبھی بہت زیادہ خوش ہوسکتا ہے، کبھی بہت زیادہ غصہ اور غضب میں ہوسکتا ہے، کبھی بہت پر جوش ہوسکتا ہے اور کبھی بہت مایوس اور افسردہ ہوسکتا ہے، کبھی محبت سے سرشار ہوسکتا ہے کبھی نفرت میں بھرا ہوا ہوسکتا ہے۔ وہ کسی معاملے میں سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کے بجائے ایک ہی وقت میں ایک انتہا سے دوسری انتہا پر چلا جاتا ہے۔[اس طرح کے موازنے کی مثالوں کے لئے دیکھیں ایک طرف ۳:۱۵۳؛ ۴:۱۳۵؛ ۵:۲،۸؛ اور دوسری طرف ۳:۱۵۴؛ ۵:۴۹، ۵۰، ۷۷؛ ۱۸:۲۸؛ ۲۳:۷۱؛ ۲۸:۵۰؛ ۴۷:۱۴،۱۶]۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۟

البتہ جن مشرکوں کیساتھ تم نے عہد کیا ہو اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا ہو اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی ہو تو جس مدت تک اُن کیساتھ عہد کیا ہو اُسے پورا کرو (کہ) اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (۹:۴)

مسلمان جب دشمنی کا سامنا کرنے پر مجبور ہوں یا فریب دینے والے فریق کے ساتھ صلح ختم کریں تو ان کا پرامن رویہ اور اخلاقی اقدار انہیں اس سے روکتی ہیں کہ وہ اس معاملے میں بھی سب کو ایک ہی نظر سے دیکھیں اور ہر ایک کو دشمنی کا جواب دیں۔ دشمنی اور مخاصمت کا

دائرہ کم سے کم ہونا چاہئے اور الگ الگ معاملوں کو الگ الگ طریقے سے دیکھیں اور برتیں۔ عرب کے مشرک قبائل سے صلح کا سمجھوتہ اگرچہ اس وجہ سے ختم کر دیا گیا کہ ''کسی مومن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا اور حد سے تجاوز کرتے ہیں''[۹:۱۰]، لیکن جن لوگوں نے اپنا عہد نہیں توڑا اور مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیا ان سے یہ سمجھوتہ ختم نہیں کیا گیا اور کہا گیا کہ ان کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کریں۔ حدیبیہ کی صلح پر عمل کرنے کے لئے مسلمان تبھی تک پابند تھے جب تک دوسرا فریق بھی اس کی پابندی کرے، چنانچہ اللہ کی طرف سے ہدایت دی گئی کہ ''جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کے نزدیک عہد کیا ہے اگر وہ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تو تم بھی اپنے قول و اقرار (پر) قائم رہو''[۹:۷]۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ دشمنی کا دائرہ محدود رکھنے کے لئے اپنی طرف سے پوری کوشش کریں اور جنگ کی مصیبتوں کے دائرہ کو پھیلائیں نہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اُس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (۹:۲۴)

اسلام اگرچہ گھر، خاندان اور آس پڑوس سے بہتر اور مضبوط رشتے بنائے رکھنے کی تعلیم دیتا ہے اور جائز ذرائع سے مال کمانے کا حکم دیتا ہے لیکن یہ نہیں چاہتا کہ آدمی رشتہ و پیوند اور مال و دولتِ دنیا کے حصار میں قید ہو کر رہ جائے، اور ان رشتہ داریوں اور مال و اسباب کی خاطر اللہ کے دین اور انصاف کی لئے کھڑے ہونے سے اور حق کی خاطر جدوجہد کرنے سے باز رہے۔ ایک مومن کو اللہ و رسول اور اللہ کے دین کے تقاضوں کی خاطر اپنے خاندان سے بھی اختلاف کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اگر انصاف قائم کرنے اور ظلم و ناانصافی کی مزاحمت کے ضروری ہو تو اپنے والدین بھائی بہنوں، بیوی بچوں اور اپنی کھیتیوں و کاروبار کی محبت سے اپنے آپ کو آزاد کرے۔ یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو عالم گیر انصاف اور اخلاقیات کے قیام کے لئے پابند عہد ہوتا کہ دنیا میں انسان امن کے ساتھ جی سکیں۔

❀ ❀ ❀

دعا

انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا سب سے قریبی اور متحرک ذریعہ دعا ہے۔ جب انسان دعا کرتا ہے تو وہ اپنی کمزوری اور محدودیت ومجبوری کا اعتراف کرتا ہے اور اپنی محتاجگی کا اقرار کر کے اپنے خالق و مالک کی مدد پر انحصار کرتا ہے اور اس کو قادر مطلق جان کر اس سے رحم وکرم کی دعا کرتا ہے۔ جب انسان اللہ کی نعمتوں ونوازشوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس کا دل اللہ کی حمد سے معمور ہوتا ہے اور یہ جذبہ واحساس اس کی زبان پر شکر اور تعریف کے الفاظ جاری کرتا ہے۔ اس طرح ایک سچی دعا دراصل اللہ رب العزت پر حقیقی ایمان کا ایک اظہار ہے اور بندے کی اپنے رب سے قربت کا احساس دلاتی ہے: ''اور (اے پیغمبر ﷺ!) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں'' [۲:۱۸۶]، ''اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں'' [۵۰:۱۶]۔

انسان کی اپنے رب سے قربت کا یہ احساس اور اس کے رحم وکرم کی احتیاج کی یہ کیفیت ہی ہے جس کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دعا عبادت ہے یا عبادت کا مغز ہے [بروایت: بخاری، الادب؛ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، ابن ابی شیبہ، ابن حنبل، الحاکم (مستدرک)]۔ امام بخاری نے ایک اور روایت بھی بیان کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب بندہ اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کا جواب دیتا ہے اور فرشتوں سے کہتا ہے ''کیا میرا بندہ واقعی جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو اس کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے اور توبہ قبول کرتا ہے؟ میں نے اسے معاف کر دیا'' [مسلم اور ابن حنبل نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے]۔ اللہ پر یہ ایمان اور اس کی قربت نیز اور اس کے رحم وکرم کا یہ شعور انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، اور یہ ایمان وشعور دعا کا ایک لازمی عنصر ہے، اور کسی مادی ضرورت پوری ہونے کی دعا اگرچہ ظاہر میں پوری نہ بھی ہو تو بھی انسان کا یہ ایمان وشعور اسے اپنے رب کی رحمت سے پرامید رکھتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث ابن حنبل اور ترمذی نے نقل کی ہے کہ جب بندہ خلوص سے کوئی دعا کرتا ہے جس میں اس نے کسی کے لئے بددعا نہ کی ہو تو وہ دعا اللہ ضرور سنتا ہے اور تین میں سے کسی ایک طریقے سے اسے ضروری پوری کرتا ہے: یا تو وہ دعا فوری قبول ہو جاتی ہے اور بندے جو کچھ مانگا ہوتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے، یا اس سے بہتر کوئی چیز اسے اس دنیا میں مل جاتی ہے، یا آخرت میں اس کے لئے اجر لکھ لیا جاتا ہے۔

ان نکات کے علاوہ، دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی چیز انسان کو اچھی اور بھلی معلوم ہوتی ہے جس کے لئے وہ اپنے رب سے دعا

کرتا ہے، اور کوئی چیز اسے بری اور خطرناک یا نقصان دہ معلوم ہوتی ہے جن سے بچنے کے لئے وہ اللہ سے دعا کرتا ہے۔ قرآن میں بہت سی دعائیں بیان ہوئی ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے بہت سے دعائیں سکھائی ہیں جن میں ایسی اخلاقی فضیلتیں بتائی گئی ہیں جو انسان کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں اور ان کے لئے دعا کرنی چاہئے اور بہت سی سنگین غلط باتیں اور برائیوں کا اشارہ جن سے انسان کو بچنا چاہئے اور ان سے بچنے کے لئے اللہ سے دعا کرنی چاہئے۔ چنانچہ یہ قرآنی اور مسنون دعائیں جامع اخلاقی فضائل پر مشتمل ہیں جو صبح شام یا رات دن اور موقع بہ موقع ان دعاؤں کے توسط سے انسانوں کے دل و دماغ میں راسخ ہوتے جاتے ہیں۔ یہ دعائیں ہمیں سکھاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیوں ہم سے یہ کہتا ہے کہ وہ ہم سے قریب ہے اور ہماری دعائیں سنتا اور ان کا جواب دیتا ہے۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ ہم اس کی ہدایت پر چلیں جس طرح وہ ہماری دعائیں سنتا ہے اور انہیں پورا کرتا ہے: ''(کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں'' [۲:۱۸۶]۔ لیکن یہ ایک متضاد بات ہوگی کہ ایک دعا کرنے والا اللہ سے تو مدد کی اور مسرت حاصل ہونے کی دعا کرے یا دکھوں اور پریشانیوں سے نجات کی فریاد کرے، لیکن خود اس کے لئے کوشش نہ کرے اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے خود اپنا عمل ان کے مطابق نہ بنائے: ''اللہ اُس (نعمت) کو جو کسی قوم کو (حاصل) ہے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کو نہ بدلے'' [۱۳:۱۱]۔ اگر کوئی بندہ اللہ سے غربت دور ہونے کی، قرض سے نجات کی، بیماری سے شفا کی، جبر سے آزادی کی، افسردگی سے نکلنے کی دعا کرے اور اپنی جسمانی، دماغی اور روحانی صحت کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے تعلیم دی ہے [بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، الحاکم،] تو اس کی یہ تمام کوششیں اس کے مقصد کے حصول کے لئے لازمی ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب کا قول ہے کہ '' آدمی کو اپنی روزی کمانے کے لئے کام کئے بغیر بے عمل بیٹھ کر اللہ سے یہ دعا نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اسے روزی دے کیوں کہ وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آسمان سے سونا یا چاندی نہیں برستی'' [الشہر المشعر الحرام میں رفیق العزم نے یہ قول نقل کیا ہے، دوسرا ایڈیشن، قاہرہ، ۱۹۷۳، بحوالہ العقد الفرید، ابن عبدالرب]۔

قرآن کے ان تصورات کو مکمل کرتے ہوئے میں مندرجہ ذیل قرآنی دعائیں منتخب کی ہیں یہ بتانے کے لئے کہ مسلمانوں کو اللہ سے ہدایت کی اور زندگی کے جملہ معاملات میں مدد کے لئے دعا کرنا کس طرح سکھایا گیا ہے۔ افراد کی جسمانی اور روحانی شخصیت، خاندان سے اس کا تعلق، سماجی اور عالمی انصاف، امن و باہمی مدد اور اچھے کاموں میں مسابقت وغیرہ۔ ان دعاؤں میں بعض دعائیں وہ ہیں جو پیغمبروں، فرشتوں اور مومنین صادقین نے بعض موقعوں پر کی ہیں، اور بعض دعائیں وہ ہیں جو قرآن نے کچھ خاص حالات کی عکاسی کرتے ہوئے پیش کی ہیں۔ یہ جامع، مختصر اور ممتاز ترین دعائیں ہیں اور ایسی ہیں کہ آسانی سے یاد کی جاسکتی ہیں اور دوہرائی جاسکتی ہیں۔ ان قرآنی و مسنون دعاؤں کو ان کلمات کے ساتھ پڑھتے ہوئے ان اخلاقی قدروں پر توجہ رکھنی چاہئے جو ان دعاؤں میں سکھائی گئی ہیں اور جو ایک مسلمان کے دل و دماغ میں بس جانی چاہئیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنی پوری زندگی گزارے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اپنے تعلق کو نبھائے۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر اپنا کرم فرمائے، اور سب کو اپنی ہدایت سے نوازے۔ آمین

❀ ❀ ❀